حضرت مولانا

داؤد غزنوی

رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب و تحریر

سیّد ابوبکر غزنوی

مکتبۂ غزنویہ

۴۔ شیش محل روڈ ○ لاہور

حضرت مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

ترتیب و تحریر

سیّد ابوبکر غزنوی

مکتبہ غزنویہ

۴۔ شیش محل روڈ ○ لاہور

اشاعتِ اوّل ______ دسمبر ۱۹۷۴ء

تعداد ______ ایک ہزار

مطبع ______ ایورگرین پریس - لاہور

ناشر ______ مکتبۂ غزنویہ - ۴ شیش محل روڈ - لاہور

قیمت ______ بیس (۲۰) روپے

کتابت ______ اقبال اختر، ادارہ کتابت چوک دالگراں، لاہور

فہرست مضامین

حرفِ آغاز		۵
مولٰنا محمد داؤد غزنویؒ کا عظیم المرتبت خاندان	مولٰنا محی الدین احمد قصوری	۹
مولٰنا سید محمد داؤد غزنویؒ (کچھ نقوش و تأثرات)	مولٰنا سید ابوالحسن علی ندوی	۲۱
مولٰنا سید محمد داؤد غزنویؒ (اسلام اور آزادی کا ایک بلند مرتبت مجاہد)	مولٰنا غلام رسول مہر	۲۷
حضرت مولانا داؤد غزنویؒ (چند تأثرات)	مولٰنا محمد حنیف ندوی	۳۷
حضرت مولانا محمد داؤد غزنویؒ	ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب	۴۵
حضرت مولانا محمد داؤد غزنویؒ	مولٰنا مظہر علی اظہر	۵۳
سید محمد داؤد غزنویؒ (جنگِ آزادی کے سالارِ اوّل)	آغا شورش کاشمیری	۶۱
مولٰنا داؤد غزنویؒ	سید رئیس احمد جعفری	۶۹
حضرت مولٰنا سید محمد داؤد غزنویؒ	میاں محمد شفیع (م۔ش)	۷۵
مولٰنا داؤد غزنویؒ کی چند یادیں	ڈاکٹر اسرار احمد	۸۳
حضرت مولٰنا سید داؤد غزنویؒ	مولٰنا حکیم فضل الرحمٰن سواتی	۹۳
حضرت مولٰنا سید محمد داؤد غزنویؒ (سیاسی زندگی کی ابتداء اور ملک کا سیاسی پس منظر)	ملک حسن علی جامعی شرقپوری	۱۰۳
مولٰنا غزنویؒ سے ایک ملاقات	مولٰنا محمد داؤد راز	۱۱۷
حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ (چند واقعات و تأثرات)	مولٰنا محمد اسحٰق بھٹیؒ	۱۲۳
میرے استاد۔ مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ	محی الدین سلفی	۱۶۳
میرے مشفق استاد	حافظ عبدالرشید	۱۷۱
مولٰنا سید محمد داؤد غزنویؒ (چند یادیں۔ چند باتیں)	خالد بزمی ایم۔ اے	۱۷۷

- حضرت مولٰنا محمد داؤد غزنویؒ اور حضرت مولٰنا مفتی محمد حسن صاحبؒ کے باہمی تعلقات — صاحبزادہ حافظ عبدالرحمٰن صاحب خلف الرشید حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ — (۱۸۷)
- مولٰنا سیّد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ (مولٰنا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی نظر میں) — انٹرویو : عابد نظامی — (۲۰۳)
- حضرت مولٰنا مفتی محمد شفیع صاحب کا مکتوبِ گرامی — (۲۰۸)
- مولانا غزنویؒ کا حکیمانہ اندازِ تبلیغ — مولٰنا عبدالماجد دریا آبادی — (۲۰۹)

سیّدی و ابی

تحریر : سیّد ابوبکر غزنوی

۱ — آباد و اجداد — (۲۱۵)

۲ — حالاتِ زندگی — (۲۳۷)

۳ — آخری ایّام — (۲۷۱)

۴ — اخلاق و عادات — (۲۸۱)

۵ — اندازِ خطابت — (۲۹۳)

۶ — نظریات و رجحانات — (۳۳۵)

۷ — مسائلِ تصوّف — (۳۵۵)

۸ — فقہی موقف — (۳۷۱)

۹ — مرزائیت کی تردید — (۳۸۵)

۱۰ — شعر و ادب کا ذوق — (۴۰۳)

۱۱ — دار العلوم تقویۃ الاسلام — (۴۴۳)

مآخذ — (۴۶۳)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم۔

حرفِ آغاز

سورۂ فاتحہ اُمّ الکتاب ہے۔ جوہرِ قرآن ہے۔ اس جامع اور بلیغ دُعا کے ان الفاظ پہ غور کیجیے:

اِھْدِنَا الصّراط المستقیم۔ صراط الذین انعمت علیھم۔ غَیْرِ المغضوبِ علیھم وَلاَ الضّالین۔

(ہمیں سیدھی راہ دکھا، اُن لوگوں کی راہ جن پر تُو نے کرم کیا، اُن لوگوں کی راہ نہیں جن پر غضب نازل کیا گیا اور نہ گمراہوں کی راہ)

یہ نہیں کہا کہ ہمیں نیکیوں اور بھلائیوں کی راہ دکھا، یہ نہیں کہا کہ ہمیں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی راہ دکھا، بلکہ ان برگزیدہ انسانوں کا ذکر کیا جو بھلائی کے پیکر ہوتے ہیں، جو خیرِ مجسّم ہیں۔ انبیاء اور صلحاء کے تذکار ہی سے صراطِ مستقیم کی ٹھیک طور پر وضاحت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ایمان اور عمل صالح کی حقیقت انبیاء اور اولیاء کے حالاتِ زندگی ہی سے اُجاگر کی گئی ہے۔ ایک ایک پیمبر کا نام لے کر اس کے حالاتِ زندگی پر سوچ بچار کی دعوت دی گئی:

"وَاذْکُرْ فی الکتاب ابراھیم" (۱۹ : ۱۴)

(کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کر)

"وَاذکُر فی الکتاب مُوسیٰ" (۱۹ : ۵۱)

(کتاب میں موسیٰ علیہ السلام کی بات کرو)

"وَاذکُر فی الکتاب اسماعیل" (۱۹ : ۵۴)

(کتاب میں اسماعیل علیہ السلام کا تذکرہ کرو)

"واذکر فی الکتاب ادریس". (۱۹ - ۵۶)

(کتاب میں ادریس علیہ السلام کے حالات بیان کرو)

"وَاذکُر عبدنا ایّوب" (۳۸ : ۴۱)

(ہمارے بندے ایّوب علیہ السلام کی حکایت کہو)

"واذکر عبدنا داؤد" (۳۸ : ۱۷)

(ہمارے بندے داؤد علیہ السّلام کی سیرت بیان کرو)

قرآن مجید میں صرف انبیاء معصومین ہی کا ذکر نہیں ہے، اولیاء اللہ کی سیرت طیبہ سے بھی استشہاد کیا گیا ہے۔

"واذکر فی الکتاب مریم"۔ (۱۹ : ۱۵)

(اور کتاب میں مریم علیہا السّلام کا تذکار بھی ہو)

اور اصحابِ کہف کا کردار بھی "تذکیر و موعظت کے لیے بیان کیا گیا، تاکہ انسانیت پر یہ واضح کیا جا سکے کہ انسان غیر معصوم ہوتے ہوئے بھی قُرب و ولایت کی بلندیوں سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ پس بزرگوں کے حالاتِ زندگی محفوظ کرنا اور انہیں بنی نوعِ انسان کے سامنے پیش کرنا عین منشائے الٰہی ہے اور کتاب اللہ کی اقتداء ہے۔

حضرت والد علیہ الرحمہ کو مَیں نے قریب سے دیکھا۔ میری صبحیں اور میری شامیں اُن کے ساتھ بسر ہوئیں۔ مدّت العمر میں اُن کے ساتھ رہا۔ انہیں دیکھ کر خدا یاد آتا تھا۔ وہ للّٰہیت کے پیکر تھے۔ ان کی زندگی کتاب و سُنّت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی اور کسی انسان کی سیرت

کے بارے میں اس کے اپنے گھر کے افراد کی گواہی بہت بڑی گواہی ہے۔ اُن کی زندگی ایک مشعل ہے جس کی روشنی میں بھٹکے ہوئے راہی صراطِ مستقیم کا سراغ پا سکتے ہیں۔ ان کی زندگی ایک شمع ہدایت ہے، جس سے ایمان و عمل کے چراغ روشن کیے جا سکتے ہیں اور اسی غرض و غایت کے پیشِ نظر ان مقالوں کو مرتّب کیا گیا ہے۔

حضرت والد علیہ الرحمہ کی تاریخ وفات سولہ دسمبر ۱۹۶۳ء ہے۔ اُنہیں دُنیا سے رخصت ہُوئے گیارہ برس ہونے کو آئے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ اُن کے سوانح حیات مرتّب کرنے کا کام بہت پہلے سرانجام پا جانا چاہیے تھا، لیکن کچھ ایسے حالات پیش آتے رہے اور کچھ ایسی رکاوٹیں حائل ہوتی رہیں کہ اس کتاب کی طباعت میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔

ان کی وفات کے ایک دو برس بعد ہی ان پر کتاب مرتّب کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مقالہ نگاروں کی ایک فہرست مرتّب کی، جس میں ان کے احباب بھی تھے، متعلقین اور معتقدین بھی تھے، ان کے رفقاءِ کار بھی تھے، ان کے ہم عصر علماء اور سیاستدان بھی تھے اور اُن کے بعض شاگردانِ رشید بھی اس فہرست میں شامل تھے۔ یہ خواہش بھی تھی کہ حضرت میاں ابوالحسن علی ندوی، ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ جن کی شخصیت مجھے عزیز ہے، کے نگارشاتِ قلم بھی کتاب میں شامل ہو سکیں۔

بہت کم مقالہ نگار ایسے تھے جنھوں نے حضرت میاں صاحب کی طرح نہایت مستعدی کے ساتھ حسبِ وعدہ مدّتِ معیّنہ کے اندر اپنے مقالے بھیج دیے ہوں۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کا پیچھا کرنا پڑا، مگر آخر میرا دفتر ان سے مقالے لکھوانے میں کامیاب ہو گیا اور کچھ ایسے سخت جان نکلے کہ بار بار وعدے کرتے رہے اور برابر ٹالتے رہے۔ آج مَیں نے اپنی ہار مان لی ہے اور کتاب پریس بھیج رہا ہوں۔ اگر مقالہ نگاروں کے قلم اور وقت پر مجھے کچھ اختیار ہوتا، تو کتاب کی طباعت میں اس قدر تاخیر نہ ہوتی۔

بعض مقالہ نگار اس عرصے میں فوت ہو چکے ہیں اور حضرت والد علیہ الرحمہ سے جا ملے ہیں۔ سیّد رئیس احمد جعفری وفات پا گئے، پھر مولانا محی الدین احمد قصوری رخصت ہُوئے، پھر

مولٰینا غلام رسول مہر رحلت فرما گئے اور اب مولٰینا مظہر علی اظہر بھی چل بسے ہیں۔
عزیزم خالد بزمی صاحب نے اس کتاب کی ترتیب و تسوید میں میری بہت مدد کی۔ اللہ تعالےٰ انہیں جزائے خیر عطا کرے۔

میری یہ دُعا ہے کہ خدا نام و نمود کی خواہش سے ہمارے دلوں کو پاک کر دے اور خاندانی فخر و غرور کی مہلک بیماری سے ہمیں محفوظ رکھے اور اپنی مخلوق کے لیے اس کتاب کو ذریعۂ فیضان اور میرے لیے اور والد علیہ الرحمہ کے لیے اس کتاب کو توشۂ آخرت بنا دے
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔

ابوبکر غزنوی

۲۵ رشوال المکرم ۱۳۹۴ھ
مطابق ۱۱ر نومبر ۱۹۷۴ء

مولانا محمد داؤد غزنویؒ
کا
عظیم المرتبت خاندان

مولانا محی الدین احمد قصوری

مولانا داؤد غزنوی ؒ کے دادا مولانا عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک فقید المثال شخصیت تھی۔ جس میں بیک وقت علم دین اور تصوّف جمع ہو گئے تھے۔ اُن کے متعلق ہمارے خاندان میں مشہور ہے کہ وہ مادر زاد ولی تھے؛ چنانچہ وہ تحصیلِ سلوک کے شوق میں اپنے پیر و شیخ سے ملنے گئے جو اُس وقت افغانستان کے مشاہیر صُوفیا اور اولیاء میں سے تھے۔ یہ اُن کی خدمت میں جب پہلی مرتبہ حاضر ہُوئے تو سُنا ہے کہ کچھ عرصہ بیٹھ کر واپس چلے آئے۔ کہتے ہیں تین مرتبہ ایسا ہُوا۔ تیسری مرتبہ جب واپس ہونے لگے، تو اُنہوں نے اِن کو بُلا کر کہا:

"عبداللہ! تمہارے یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے گھر کے در و دیوار تمہاری رہنمائی کریں گے۔" چنانچہ اس کے بعد ان کا وہاں جانا ثابت نہیں۔

غزنی سے پنجاب

قُدرت نے فطرت انتہا درجہ سلیم، ذہن نہایت رسا بخشا تھا۔ علوم ظاہری سے فارغ ہُوئے، تو افغانستان کو انتہا درجہ کی بدعات اور مشرکانہ رسُوم میں مُبتلا پایا۔ ان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہُوئے۔ علما و مشائخِ وقت بلکہ حکام پر شدید نکتہ چینی شروع ہو گئی حسبِ معمول مختلف قسم کی طعن و تشنیع کے ہدف بنے اور علماء و مشائخ کی مخالفت اس حد تک بڑھی کہ حکومت بھی اس سے متاثر ہُوئے بغیر نہ رہ سکی۔

دربارِ کابل میں طلبی

چنانچہ دربار شاہی میں بُلایا گیا کہ یا تو علمائے وقت کے مطاعن کا جواب دیں یا اپنے عقائد و خیالات کی تبلیغ سے توبہ کریں۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت کابل، غزنی بلکہ افغانستان کے بڑے بڑے علماء جمع تھے۔ تمام علماء اس طرح ساکت و صامت بیٹھے تھے کہ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ کسی شخص کو اعتراض کرنا یکطرف یارائے گفتگو تک نہ ہوا۔ شاہ افغانستان نے علماء کی مخالفت سے مجبور ہو کر گھبرا کر انہیں حکم دیا کہ افغانستان سے نکل جائیں؛ چنانچہ آپ نے اپنا رختِ سفر باندھا جو بہت مختصر تھا اور "بخت افغانستان خوابیدہ شُد و بخت ہندوستان بیدار شُد" کہتے ہُوئے کابل سے نکل کھڑے ہُوئے۔

غزنی سے امرتسر

ہمارے ہاں یہ مشہور تھا، معلوم نہیں کہاں تک دُرست ہے کہ اُن کے ساتھ ایک بچّی تھی جس کا عقد اُنہوں نے راستہ میں ایک نہایت ہی خدا پرست مرد سے کر دیا تھا، جو ذات کا جُلاہا مشہور تھا۔ جب انہیں کہا گیا تو فرمایا: ہمین است سیّد۔ **ان اکرمکم عند الله اتقاکم**۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ غزنی سے سیدھے امرتسر تشریف لے گئے اور مُستقلاً یہاں اقامت گزیں ہو گئے یا راستہ میں قیام کرتے کرتے یہاں پہنچے۔ بہرحال امرتسر کو اُنہوں نے اپنا مستقل مستقر قرار دے لیا۔ امرتسر پہنچتے ہی وہ تمام لوگوں کے مرکزِ توجہ بن گئے۔

امرتسر سے دہلی

چونکہ طبعاً سخت پابندِ سُنّت تھے، بلکہ کہنا چاہیے کہ سُنّت کے عاشق تھے، اس لیے فنِ حدیث کی تکمیل کا شوق غالب ہوا۔

اصحاب ثلاثہ

معلوم ہوتا ہے یہاں پہنچتے ہی ان کے روابط مولانا غلام رسول صاحب قلعہ والوں اور مولانا حافظ محمد لکھوکی والوں کے ساتھ بہت بڑھ گئے اور تینوں بزرگوں (رحمہم اللہ) نے فیصلہ کیا کہ حدیث کی سند حضرت میاں نذیر حسین رحمۃ اللہ علیہ سے لی جائے؛ چنانچہ تینوں نے لکھ کر حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت مانگی اور اجازت آنے پر فوراً روانہ ہو گئے۔ اُس وقت تک ابھی ریل جاری نہیں ہوئی تھی۔ لوگ گھوڑے گاڑیوں پر پڑاؤ پڑاؤ ہوتے ہُوئے دہلی پہنچتے تھے۔ جس وقت یہ تینوں بزرگ دہلی گاڑیوں کے اڈے پر پہنچے، تو ایک بزرگ آدمی کو وہاں موجود پایا۔ جس نے ان سے پُوچھ کر کہ کہاں کا قصد ہے؟ ان کا اسباب اُٹھا لیا اور کہا کہ میں آپ لوگوں کو وہاں پہنچا دوں گا۔ وہ بزرگ ان تینوں بزرگوں کا سامان اُٹھا کر میاں نذیر حسین صاحب کی مسجد میں لے گیا۔ ان کا اسباب وہاں رکھا اور خود غائب ہو گیا۔ یہ حیران کہ اس مزدور نے پیسے بھی نہیں لیے اور کہاں چلا گیا ہے جب کافی وقت گزر گیا تو اُنھوں نے کسی صاحب سے دریافت کیا کہ میاں صاحب کہاں ہیں اور کب تک آئیں گے؟ تو اُس نے جواب دیا کہ یہ میاں صاحب ہی تو تھے جو آپ کا سامان لائے ہیں۔ اب وہ غالباً گھر آپ کے کھانے کا کہنے گئے ہیں۔ یہ تینوں بزرگ دل ہی دل میں بڑے نادم ہُوئے؛ چنانچہ جب حضرت میاں صاحبؒ واپس تشریف لائے اور کھانا بھی لے آئے، تو اُنھوں نے بہت ہی معذرت شروع کی، تو میاں صاحبؒ نے فرمایا: "آپ تحصیلِ حدیث کے لیے تشریف لائے ہیں تو حدیث بجز اس کے کیا ہے کہ خدمتِ خلق۔ یہی حدیث کا پہلا سبق ہے۔"

مجھے اپنے بزرگوں سے یہ بھی معلوم ہُوا ہے جن کو خود حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شرفِ تلمذ حاصل تھا کہ میاں صاحب فرمایا کرتے تھے:

"مولوی عبداللہ حدیث ہم سے پڑھ گیا اور نماز پڑھنی ہمیں سکھا گیا"۔

محویت کی عجیب و غریب کیفیت تھی جو نہ صرف ان پر بلکہ بعض رفقاء پر بھی طاری ہو جایا کرتی تھی۔

میرے ایک اُستاذ مولوی حافظ عبدالرحمٰن مرحوم تھے جن سے میں نے حدیث کی مشہور کتاب ریاض الصالحین پڑھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ قیام امرتسر میں جب وہ حضرت مولانا سے حدیث پڑھا کرتے تھے تو اُن کی محویت کے عجیب و غریب واقعات دیکھنے میں آئے۔ ایک مرتبہ عصر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ یکایک سخت بارش شروع ہو گئی۔ ایسی سخت کہ مقتدی سب نماز چھوڑ کر بھاگ گئے، صرف دو چار رہ گئے۔ نماز سے فارغ ہو کر دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو ہاتھ سب کیچڑ سے بھرے ہُوئے تھے۔ فرمانے لگے:

"باراں شُد؟ واللہ عبداللہ را خبر نشد۔"

نماز عصر کے بعد اُن کا خاص وقت تھا۔ جن لوگوں کو دُعا کرانی ہوتی، وہ اُس وقت پہنچ جاتے۔ میرے والد بزرگوار کے پھوپھا مولوی غلام قادر کو اُن سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک مرتبہ وہ امرتسر پہنچ گئے تو نماز کے بعد اپنا تعارف کرایا کہ میں دلاور کے فلاں خاندان سے تعلق رکھتا ہُوں۔ مولانا غلام رسول قلعہ والوں اور میرے دادا مرحوم و مغفور مولوی غلام احمد (رحمہم اللہ) میں بڑی دوستی تھی۔ چنانچہ مولانا غلام رسول مرحوم ہمیشہ دلاور سال میں متعدد مرتبہ تشریف لایا کرتے تھے۔ حضرت والد مرحوم و مغفور کو بسم اللہ حضرت مولانا نے کرائی تھی اور دُعا بھی کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ کو ہمارے خاندان سے تعارف ضرور ہو چکا ہوگا؛ چنانچہ جب مولوی غلام قادر صاحب نے اپنا تعارف کرایا، تو فرمایا "پھر تو تم ضرور علم سے کچھ دسترس رکھتے ہو گے۔ اُنہوں نے از راہِ انکسار عرض کیا "کچھ شُد بُد رکھتا ہُوں"۔ ایک دن حضرت نے اپنی کسی کتاب کا ایک قلمی نسخہ نکالا اور مولوی غلام قادر سے فرمایا کہ کچھ کتابت کر سکتے ہو تو یہ چھوٹی سی کتاب نقل کر دو۔"

اُن دنوں کتابت آسان کام نہ تھا۔ سُنا ہے کہ سیالکوٹی کاغذ کو کچھ گھوٹنا پڑتا تھا۔ سیاہی بھی خود بنانی اور درست کرنا پڑتی تھی؛ چنانچہ کئی دن کے بعد جب یہ کتاب نقل کر کے لے گئے تو چونکہ خط بہت اچھّا اور صاف تھا، بیحد خوش ہُوئے۔ ایک روز نمازِ عصر کے بعد پھوپھا صاحب نے فرمایا کہ حضرت میرے لیے بھی دُعا فرمائیں۔ پُوچھا کیا دُعا کروں؟ عرض کیا کہ مجھے دردِ سر کا کبھی ایسا شدید دَورہ پڑتا ہے کہ مَیں بے حال ہو جاتا ہُوں اور میری نمازیں قضا ہو جاتی ہیں۔ دُعا فرمائیں کہ یہ شکایت دُور ہو جائے۔ میری نماز باجماعت قضا نہ ہو۔ ایک تیسری اور چیز کہی مگر وہ میری یاد سے نکل گئی ہے۔ بہرحال چند منٹ ہاتھ اُٹھا کر دُعا کی اور فرمایا: "قبول شُد انشاء اللہ"۔

میرے دادا (والد صاحب کے پھوپھا) اس وقت بالکل جوان تھے۔ ستّر سال کی عمر پائی۔ گویا قریباً دُعا کے بعد بیتالیس پچاس سال زندہ رہے۔ دردِ سر کا دَورہ ایک مرتبہ بھی اس مُدّت میں نہیں ہوا۔ سفر و حضر میں نماز باجماعت کبھی قضا نہیں ہُوئی۔ آخری رات عشاء کی نماز باجماعت پڑھی۔ تہجّد کی نماز پُوری پڑھی کہ وقت آ گیا۔ ذکر شروع کر دیا اور صبح کی نماز سے قبل جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

دُعا کی قبولیت یقیناً تعجب انگیز اور داعی کے کمال درجہ مستجاب الدعوات ہونے کی دلیل ہے لیکن دُعا کرانے والے کی للّٰہیت بھی قابلِ توجہ ہے کہ کوئی چیز دنیوی نہیں مانگی۔ تینوں چیزیں دین کی اور آخرت کی مانگیں۔ انہی لوگوں کے حق میں قرآن حکیم کہتا ہے:

"من کان یرید حرث الاٰخرۃ نزِد لہ فی حرثہٖ ومن کان یرید حرث الدنیا نؤتہٖ منہا ومالہٗ فی الاٰخرۃِ من نصیب"

سیالکوٹ کا سفر

ایک مرتبہ ضلع سیالکوٹ کی تحصیل رعیہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مولانا غلام رسول صاحب

قلعہ والے بھی ہمرکاب تھے۔ جب آپ بلو والی (ایک گاؤں) پہنچے۔ یہ گاؤں میرے ددھیال کا گاؤں تھا۔ یہاں میرے دادا کے چچا اور چچازاد بھائی کا گاؤں تھا۔ نام تو مشہور تھا خصوصاً مولانا غلام رسول صاحبؒ کو تو بہت زیادہ لوگ جانتے تھے۔ گاؤں کے چند چیدہ آدمی حضرت مولانا غلام رسول صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وعظ کی درخواست کی تو مولانا نے فرمایا کہ حضرت مولانا عبداللہ ساتھ ہیں، ان کا مقام شیخ اور خلیفہ کا ہے۔ اُن کی اجازت کے بغیر وعظ نہیں کرسکتا۔ وہ مجمع اسی طرح حضرت مولانا عبداللہ رحمۃ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ فرمایا: "ایں مرداں چہ می گویند؟" بتایا گیا تو مولانا غلام رسول صاحبؒ سے مخاطب ہوکر فرمانے لگے:

"مولانا! قابلِ وعظ شدی؟"

مولانا خاموش۔ کاٹو تو خون نہیں بدن میں۔ جب کچھ جواب نہ ملا، تو فرمایا: "مولانا! آپ منبر پر بیٹھے ہوئے کلمۃ الحق کہہ رہے ہوں۔ ایک شخص حاضرین میں سے اُٹھتا ہے۔ وہ آپ کے منہ پر دو دھول لگاتا اور داڑھی سے پکڑ کر منبر سے نیچے پھینک دیتا ہے۔ آپ کے چہرہ پر ایک بل یا شکن نہیں پڑتا۔ آپ اُٹھتے ہیں اور اسی خندہ پیشانی اور جوش سے کلمۃ الحق کہنا شروع کر دیتے ہیں، تو اس وقت سمجھیے کہ آپ وعظ کے قابل ہوگئے ہیں۔"

ایک دن میاں غلام رسول صاحب کی کسی بات پر خفا ہو کر کہنے لگے:

"مولوی غلام رسول! تو مولوی شُدی، محدث شُدی۔ عالم شُدی، واعظ شُدی واللہ ہنوز مسلمان نشُدی۔"

یہ کہنا تھا کہ مولوی غلام رسُول فرش پر گر گئے اور تڑپنے لگے۔

پھر فرمایا: "بگو لا اِلٰہ اِلّا اللہ۔" کہتے ہیں اور مولانا کا بیان ہے کہ اُس وقت مسجد کے در و دیوار سے لَا اِلٰہ اِلّا اللہ کی آواز آرہی تھی۔

غرض حضرت مولانا کی زندگی ایک عجیب صبر و استقامت اور اعتماد و توکل علی اللہ کی

زندگی تھی۔ دنیوی خواہشات کو اس میں کوئی راہ نہ تھی۔

ان صلوٰتی ونسکی ومحیایٰ ومماتی للہ رب العالمین کا پورا نمونہ تھی۔

حضرت مولانا کے بعد

حضرت مولانا کو دیکھنے کی سعادت تو مجھے نصیب نہیں ہوئی۔ یہ جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے بعض بزرگوں یا دو ایک اساتذہ سے جنہیں حضرت موصوف سے تلمذ حاصل تھا (مثلاً مولانا حافظ عبدالرحمٰن۔ میرے بزرگ مولانا فضل حق اور مولانا اسماعیل) سُن کر لکھا ہے؛ البتہ مجھے آپ کے دونوں صاحبزادوں حضرت مولانا عبدالجبار رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا عبدالواحد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اور ارشادات سے فیض یاب ہونے کا فخر ضرور حاصل ہے۔ مولانا عبدالاوّل رحمۃ اللہ علیہ تو غالباً اپنے پدرِ بزرگوار کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تھے۔

۱۹۰۶ء میں مَیں میٹرک پاس کر کے لاہور گورنمنٹ کالج میں داخل ہُوا تو حُسنِ اتفاق سے دو تین ایسے اچھے رُفقا مِل گئے جو ہم مشرب تھے اور عقاید اور اعمال کے لحاظ سے بھی منجھے ہُوئے تھے۔ پہلا سال تو یُوں گزر گیا، لیکن دوسرے سال سے تو میرا اور میرے دو دوستوں (مولوی عبدالعزیز اور منہاج الدین رجسٹرار پشاور یُونیورسٹی۔ اب دونوں اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں قبول فرمائے) اور ان دونوں دوستوں کا عام طور سے وطیرہ ہو گیا تھا کہ جُمعہ کے روز کالج میں ایک آدھ لیکچر سُنا اور پھر کھسک گئے اور جمعہ کی نماز حضرت مولانا عبدالجبار رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں پڑھتے اور پھر دو ایک گھنٹے ان کی صحبتِ بابرکت سے فیضیاب ہو کر لاہور واپس آجاتے۔ میرے خاندانی روابط کی وجہ سے میں خاص طور پر موردِ عنایات تھا۔

ایک دفعہ کا ذِکر ہے کہ حضرت پاک پتن تشریف لے جا رہے تھے۔ ان دِنوں اُمرتسر سے قصُور اور قصُور سے پاک پتن جایا کرتے تھے بذریعہ ریل۔ اس دن اتفاق ایسا ہُوا کہ

پاک پتن کی گاڑی بہت لیٹ تھی یا شاید نکل چکی تھی تو بجائے سٹیشن پر ٹھہرا رہنے کے حضرت والد صاحب مرحوم و مغفور کا پتہ پُوچھ کر ہمارے ہاں تشریف لے آئے اور والد صاحب رقبلہ سے فرمایا کہ مَیں آپ کے صاحبزادہ مولوی محی الدین سے مِلنے کے لیے آگیا ہُوں واضح رہے کہ اس وقت مَیں پُورا فیشن ایبل نوجوان تھا۔ ڈاڑھی وغیرہ نہ تھی مگر نماز خدا کے فضل سے بطریقِ سُنّت ہی ادا کرتا تھا۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اہل حدیث عموماً نہایت متشدّد ہوتے ہیں۔ تھوڑی سے تھوڑی چیز پر سخت سے سخت نکتہ چینی کے خوگر۔ ہم تینوں اُس وقت کے مطابق ڈاڑھی وغیرہ منڈواتے تھے، لیکن مجھے نہیں یاد کہ ان دو تین سالوں میں آپ نے ہم میں سے کسی ایک کو ڈاڑھی منڈوانے پر ڈانٹا ہو۔ اگر کہا تو عام اتّباعِ سُنّت پر زور دیا کہ دین سنتِ رسول ؐ کا نام ہے جس کی ڈاکٹر اقبال مرحوم نے یوں ترجمانی کی ہے:

به مصطفیٰ برساں خویش را که دیں همه اوست
اگر به اُو نه رسیدی تمام بولهبی است

یا جیسے حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

خلافِ پیمبرؐ کسے رہ گزید
که ہرگز بمنزل نخواہد رسید

مجھے کبھی یاد نہیں کہ آپ نے خطبہ میں کسی قسم کی درشت نکتہ چینی کسی شخص یا کسی فرقہ پر کی ہو۔ رحمۃ اللہ علیہ وعلیٰ آبائہ

اور حضرت مولانا عبدالواحد رحمۃ اللہ علیہ سے تو روابط بہت زیادہ ہو گئے تھے بلکہ کئی ایک رشتے بھی باہمی ہو گئے تھے۔ انہیں علم کے لحاظ سے مَیں نے بہت بلند اور وسیع النظر پایا۔ خاص کر حضرات امام ابنِ تیمیہ اور حضرت امام ابن قیم رحمہم اللہ علیہ کے تو وہ حافظ معلوم ہوتے تھے۔ خشیت و تقویٰ بہت زیادہ تھا اور ان کی گفتگو اور مواعظ بھی

خشیت اللہ میں ڈوبے ہُوئے ہوتے تھے۔ میری پہلی شادی کی تقریب میں نکاح خوانی خود انہی کی زبان مُبارک سے ہوئی تھی۔ میرے سر پر جو ہار یا سہرا تھا وہ اُنھوں نے اپنے ہاتھ سے اُتار کر پاس رکھ دیا پھر نکاح پڑھایا۔ میرے خُسر منشی اللہ داد مرحوم و مغفور بھی متشدد اہلحدیث تھے اور سخت درجہ پرہیز گار۔ اُنہوں نے مجھے سہرا باندھے ہُوئے دیکھا تو بگڑ گئے، لیکن قابلِ ذکر چیز یہ ہے کہ یہ پھُولوں کا ہار قاضی سلیمان صاحب منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ نے برات کی روانگی کے وقت اپنے دستِ مُبارک سے پہنایا تھا۔ برادر مرحوم مولوی محمد علی کی شادی پر وہ برات کے ساتھ فرید آباد تشریف لے گئے اور نکاح بھی اُنہوں نے پڑھایا۔ نکاح سے فارغ ہو کر ہم واپس آ رہے تھے۔ فرید آباد کے سٹیشن پر تشریف فرما تھے کہ مولانا آزادؒ رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر آ گیا۔ اس وقت تک مولانا آزاد کا ابتدائی دَور تھا۔ میرے منہ سے آزادؒ کا لفظ سُن کر فوراً بگڑے اور فرمانے لگے:

"آزاد کیا؟ کیا مسلمان اپنے آپ کو آزاد کہہ سکتا ہے اور وہ تو عالم سُنا جاتا ہے۔"

مَیں نے فوراً جواب دیا کہ وہ کفر کی حکومت سے آزادی کے داعی اور مجاہد ہیں۔ مجاہدین کے معاونین کے سرخیل بھی۔ تو فوراً خاموش ہو گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ وعلیٰ آبائہٖ الکرام۔

مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی رحؒ

کچھ نقوش و تاثرات

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی۔ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

غزنوی خاندان سے ہمارے خاندان کے روابط بہت قدیم اور عزیزانہ ہیں۔ ہندوستان میں اس خاندان کے نامور اور مخلص بانی مولانا سیّد عبداللہ غزنویؒ سلوک میں مولانا حبیب اللہ قندھاریؒ کے خلیفہ تھے اور مولانا حبیب اللہ قندھاریؒ کا روحانی تعلق و تلمذ حضرت سیّد احمد شہیدؒ سے تھا۔ مولانا سیّد عبداللہ غزنویؒ اور ان کے فرزند ارجمند مولانا سیّد عبدالجبار غزنویؒ (والد مولانا سیّد محمد داؤد غزنویؒ) کا ذکر خیر، ان کے اخلاص و توکّل اور ان کی تجرید و توحید کے دلآویز واقعات مَیں نے بچپن ہی میں اپنے خاندان کے بزرگوں سے سُنے تھے۔ والد ماجد مولانا حکیم سیّد عبدالحیؒ کی شہرۂ آفاق عربی تصنیف "نزھۃ الخواطر" (تذکرۂ اعیان ہند) کی آٹھویں جلد میں مولانا سیّد عبداللہ غزنویؒ صاحب کا بہت اچھا ترجمہ (حالات) ہے مصنف صاحب نے اس ترجمہ میں نہایت بلند کلمات جو وہ اکابر اولیاء اللہ کے متعلق استعمال کرتے ہیں، استعمال کیے ہیں۔

مولانا عبدالجبار صاحبؒ کے متعلق میں نے عرصہ ہوا دو واقعات سنے تھے جن کے راوی نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم ہیں۔ ایک واقعہ تو یہ کہ جب ندوۃ العلماء کا امرتسر میں پہلا جلسہ ہوا تو مولانا سیّد عبدالجبار صاحبؒ بقید حیات تھے اور قرآن مجید کا درس دیتے تھے۔ یہ درس بہت سادہ اور بے تکلّف ہوتا تھا۔ مولانا شبلی نعمانیؒ ایک مرتبہ اس درس میں شریک ہوئے۔ واپس آکر انہوں نے شیروانی صاحب سے بیان کیا کہ مولانا عبدالجبار صاحبؒ اپنی زبان سے اللہ تعالیٰ کا نام لیتے تھے اور نام پاک اللہ ان کی زبان سے نکلتا تھا،

تو بے اختیار یہ جی چاہتا تھا کہ سر ان کے قدموں پر رکھ دیا جائے۔

دُوسرا واقعہ یہ تھا کہ ندوۃ العلماء کے جلسہ میں شریک ہونے والے علماء اور باہر کے مہمانوں کی کسی جگہ دعوت تھی۔ ایک بہت بڑا طویل دالان تھا جس میں کئی درجے تھے، ایک طرف کے بیٹھنے والے دوسری طرف کے بیٹھنے والوں کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ایک درجہ میں مولانا سیّد محمد علی مونگیریؒ بانی و ناظم ندوۃ العلماء شریک دسترخوان تھے، دوسری طرف ایک دُوسرے درجہ میں کچھ اور مہمان تھے، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد مولانا محمد علی صاحب مونگیریؒ نے شیروانی صاحب سے پُوچھا کہ جس طرف آپ بیٹھے ہُوئے تھے اس طرف اور کون کون تھا۔ انہوں نے چند معززین علماء کا نام لیا۔ مولانا محمد علی صاحبؒ ہر ایک نام پر فرماتے جاتے تھے کہ کوئی اور بھی تھا؟ جب انہوں نے مولانا عبدالجبار صاحب غزنویؒ کا نام لیا تو مولانا نے فرمایا کہ ہاں اسی وجہ سے میرا دل بے اختیار اُس طرف کھنچ رہا تھا۔

ان دونوں باپ بیٹوں کے علاوہ میں نے خاندان میں مولانا عبدالواحد صاحب غزنویؒ کا بھی ذکرِ خیر سُنا تھا، لیکن اس وقت تک اس خاندان کے کسی بزرگ کی زیارت کا موقع نہیں ملا تھا۔ ۱۹۲۸ء میں مولانا داؤد غزنوی صاحبؒ نے امرتسر سے "توحید" کے نام سے ایک رسالہ نکالنا شروع کیا۔ یہ رسالہ ہمارے یہاں بھی آتا تھا۔ غالباً اسی سنہ کے اخیر میں اس میں مولانا محی الدین صاحب قصوری کے قلم سے ایک سلسلۂ مضامین نکلنا شروع ہُوا جس کا عنوان تھا "تیرھویں صدی کا مجاہدِ اعظم" یہ حضرت سیّد احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کا تعارف اور انکے مجاہدانہ کارناموں کا تذکرہ تھا۔ برادرِ معظّم ڈاکٹر حکیم مولوی سیّد عبدالعلی صاحب مرحوم کے حکم سے میں نے اسی زمانہ میں اس کا عربی میں ترجمہ کیا جو "ترجمۃ السید الامام" کے عنوان سے مصر کے مشہور رسالہ "المنار" میں شائع ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد مئی ۱۹۲۹ء میں مَیں پہلی مرتبہ لاہور گیا۔ میرے پھوپھا مولانا سید طلحہ صاحب ایم اے اورینٹل کالج میں پڑھاتے تھے۔ یوں تو لاہور کے ممتاز اہلِ علم و اہلِ ذوق سے ان کا تعارف اور ان کے تعلقات تھے اور اس

وقت کی اکثر اہم علمی شخصیتوں سے اُنہوں نے مجھے ملایا۔ لیکن غزنوی خاندان سے دیرینہ تعلقات کی بنا پر اس خاندان کے بزرگوں سے اُن کے خصوصی روابط و مراسم تھے۔ پہلی مرتبہ مولانا داؤد غزنویؒ سے ملنا ہوا۔ اُن کی وجاہت، ان کا پُر نور اور دمکتا ہوا چہرہ، افغانی عربی حُسن و وجاہت کا دلآویز امتزاج، اُن کی پُرکشش شخصیت اسی وقت سے ذہن میں مرتسم ہے۔ اس زمانہ میں خواجہ عبدالوحید صاحب (جو اب کراچی رہتے ہیں) کے مکان پر، مجھے یاد نہیں ہر ہفتہ یا مہینہ میں ایک دو بار کسی ممتاز عالم یا کسی نامور شخصیت کی دینی تقریر ہوتی تھی۔ مختصر لیکن منتخب مجمع ہوتا تھا جس میں زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ حضرات ہوتے تھے۔ مَیں جس صحبت میں شریک ہوا اس میں مولانا داؤد غزنویؒ کی تقریر تھی۔ اُنہوں نے سورۂ بقرہ کی ان آیات پر تقریر کی:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ـ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ج وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ط وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۔

ان آیات کی تفسیر کر کے انھوں نے اس کو ہندوستان کے مسلمانوں پر منطبق کیا اور بتایا کہ کس طرح ان کا ایک گروہ انگریزوں کے جھنڈے کے نیچے اپنے دینی بھائیوں سے بغداد اور قط العمارہ اور ترکیہ کے میدانوں میں لڑتا تھا اور دوسرا گروہ یہاں ترکوں کے لیے چندہ کرتا تھا اور خلافتِ اسلامیہ کی بقاء و تحفظ کے لیے کوشاں تھا۔ ان کی پُراز اعتماد خطابت، متانت اور تقریر کی شستگی کا نقش دل پر قائم ہے۔

لاہور کے قیام کے زمانہ میں جس کی تقریباً ہر دوسرے تیسرے سال نوبت آتی تھی، مولانا

سے کہیں نہ کہیں ملنا ہو جاتا تھا اور عید کی نماز تو بالعموم انہیں کے پیچھے منٹو پارک میں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ صبح کی ہوا خوری میں کہیں ان سے ملاقات ہوئی۔ اس زمانہ میں وہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی کتاب " النبوات " کا مطالعہ کر رہے تھے اور اس سے بہت متاثر تھے اور متعدد مقامات کی نشاندہی فرماتے اور شیخ الاسلام کی تحقیقات کا بڑے ذوق وشوق کے ساتھ حوالہ دیتے۔ افسوس ہے کہ اپنی طالب علمانہ مصروفیت اور مولانا کی سیاسی اور اصلاحی مشغولیتوں کی وجہ سے، پھر سن وعلم میں بڑے تفاوت کی بناء پر کچھ زیادہ ہمنشینی وصحبت کا اتفاق نہیں ہوا، البتہ اُن کی بزرگانہ شفقت اور عزیزانہ محبت کا کیف ہمیشہ محسوس کرتا رہا۔

لاہور کی ایک حاضری کے موقع پر انہوں نے میری حقیر ذات کے ساتھ اپنی محبّت کا خصوصی اظہار فرمایا اور دار العلوم تقویۃ الاسلام کے ہال میں ایک عصرانہ کا انتظام کیا۔ اس موقع پر خیر مقدمی اور تعارفی تقریر مولانا سیّد داؤد غزنویؒ نے فرمائی۔ یہ ان کی بڑی کسر نفسی، خورد نوازی اور تواضع تھی اور میرا بڑا اعزاز۔

ع کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید

مَیں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہُوئے جماعت اہل حدیث کی خصوصیات اور اس جامعیت کا تذکرہ کیا جس کا کامل مظاہرہ حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ اور ان کے عالی مقام رفقاء نے کیا تھا۔

اس کے بعد عرصہ تک مولانا سے نیاز حاصل نہیں ہُوا۔ مئی ۱۹۶۲ء میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منوّرہ کی دعوت پر حجاز حاضری ہُوئی تو مولانا مرحوم سے بار بار ملاقاتیں اور یکجائی رہی وہ بھی جامعہ کی مجلس مشاورت کے رکن تھے۔ مدینہ طیّبہ میں بھی جامعہ کے جلسوں میں اور مکّہ معظمہ میں بھی رابطۂ عالم اسلامی کے جلسوں میں قریب ہی بیٹھنا ہوتا اور ملاقات ہوتی رہتی ہم دونوں لوکاندہ مصر میں مقیم تھے، منیٰ میں بھی اسی ہوٹل کی طرف سے جہاں انتظام کیا گیا تھا میں اور

مولانا مقیم ہوئے۔ اتفاق سے جگہ بھی مل ہوئی تھی۔ مدینہ طیبّہ کے زمانۂ قیام میں مولانا کو قلبی دورہ پڑا۔ ایک دو راتیں بڑے خطرے اور پریشانی کے ساتھ گزریں۔ علالت کی خبر سُن کر جب عیادت کے لیے حاضر ہوا تو ان کو بڑا نڈھال پایا۔ معالجوں کی رائے تھی کہ مولانا اپنے مستقر پر واپس تشریف لے جائیں، اللہ تعالیٰ نے انکو خیریت کے ساتھ پہنچا دیا۔ اس کے بعد بھی سال ڈیڑھ سال وہ اس دُنیائے فانی میں رہے (اگرچہ بیماری کے ان پر شدید حملے ہُوئے لیکن وہ جانبر ہو جاتے تھے، اچانک ان کی وفات کی اطلاع ملی) نہ صرف خاندان غزنوی اور نہ صرف جماعتِ اہل حدیث بلکہ اس برِّ عظیم (پاکستان وہند) کے دینی وعلمی حلقے میں اور علماء کی صفِ اوّل میں ایک باوقار کرسی خالی ہوگئی جس کا پُر ہونا آسان نہیں معلوم ہوتا۔ مولانا کی دلآویز شخصیت، اُن کا فکری توازن اور اعتدال، اُن کے وسیع روابط، ان کی مجاہدانہ سرگرمیاں، ان کا علمی ذوق، عقائد اور اپنے مسلک میں پختگی اور استقامت کے ساتھ سلف کا عمومی احترام خاندانی ذوق اور رُوحانی چاشنی۔ یہ سب وہ خصوصیات ہیں جن کے حامل بہت کم نظر آتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے خاندان واخلاف کے لیے بالخصوص اور جماعت کے لیے بالعموم ایک ایسی مثال اور ایک ایسا نمونہ چھوڑا ہے جس کی پیروی اگرچہ مشکل ہے، لیکن نہایت ضروری۔ اللہ تعالےٰ ان کے جانشینوں کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

مولانا سیّد محمد داؤد غزنویؒ

اسلام اور آزادی کا ایک بلند منزلت مجاہد

مولانا غلام رسول مہر

آزادگاں بجائے رسیدند و ماہماں　　زاں رہرواں کہ گردِ پس کارواں خورند

مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی مرحوم و مغفور نے اس گھرانے میں آنکھ کھولی تھی جس کے نزدیک علم و فضل سب سے بڑی دولت، زہد و تقویٰ سب سے بڑا سرمایہ اور عشق کتاب و سنت گراں بہا توشۂ تھا اور اسی فضا میں اُنہوں نے تربیت پائی اور یہی فضا آخر دم تک ان کے قلب و رُوح کے لیے بہترین آرام گاہ بنی رہی۔ ان کے جدِ امجد مولانا سیّد عبداللہ غزنویؒ نے حق و صداقت کی راہ میں جو مشقتیں اور اذیتیں اٹھائیں، اُن کا تصوّر بھی دل پر لرزہ طاری کر دیتا ہے۔ وہ تنہا ایک طرف اور پوری مملکت دُوسری طرف تھی، مگر مولانا سیّد عبداللہ مرحوم و مغفور کے پائے ثبات و استقلال میں خفیف سی لرزش بھی رُونما نہ ہُوئی۔ گھر بار چھوڑ دیا، وطن سے نکل آئے، عزیزوں اور خویشوں سے مفارقت گوارا کر لی لیکن جن باتوں کو وہ حق سمجھتے تھے اُن سے تمسّک برابر قائم رکھا۔ یہی کیفیت اپنے اپنے وقت میں ان کے فرزندوں خصوصاً مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی کے والد ماجد مولانا سیّد عبدالجبار غزنویؒ اور عمِ محترم مولانا سیّد عبدالواحد غزنویؒ کی تھی۔ میں مولانا سیّد عبدالجبار غزنویؒ کی زیارت سے مشرف نہ ہو سکا۔ مولانا سید عبدالواحد مرحوم کی خدمت میں بارہا حاضر ہوا۔ خُدا شاہد ہے کہ ان کے فیضِ صحبت سے دل میں حبِّ دین کا چشمہ اُبلنے لگتا تھا۔

یہ نہایت عزیز و گرانقدر میراث تھی جو عنفوانِ شباب میں مولانا سیّد محمد داؤد غزنویؒ کے حوالے ہوئی۔ اُنہوں نے اس کا حق ادا کرنے میں تا بہ مقدور سعی کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ ہر واقفِ حال اعتراف کرے گا کہ وہ جوشِ عمل، کمالِ خلوص، ہمّت و استقامت اور اقدام و ایثار

میں اپنے اسلافِ کرام سے قریب تر تھے اور رباری تعالیٰ کے لطف و کرم سے اُمید ہے کہ وہ درجے اور اجر میں بھی قریب تر ہی ہوں گے۔

جامعِ اوصاف شخصیت

پھر اُنہوں نے اسلامی زندگی کے جس مقدّس ماحول میں تربیت پائی تھی، وہ آج ناپید ہے۔ ان کا علم و فضل، ان کا فہم و ذکا، ان کی متانت و ثقاہت، اُن کا تدبّر، ان کی فقاہت، تحریر و تقریر میں یکساں شانِ دلآویزی، پھر ہر معاملے میں دین کو مقدّم رکھنا اور ہر دینی فرض کو انتہائی اخلاص سے انجام دینا، یہ اور ایسے دُوسرے محاسن و فضائل آج ایک شخصیّت میں کیونکر جمع ہو سکتے ہیں؟ کہاں جمع ہُوئے ہیں؟ تربیت کی کونسی آغوش ہے جس میں یہ اوصاف فروغ پاتے اور پروان چڑھتے ہیں؟ وہ ایک فرد نہیں بلکہ ایک مجلس، ایک انجمن اور ایک جماعت تھے۔ وہ رخصت ہُوئے تو ہمیں ہوش آیا کہ ہمارے درمیان سے ایک فرد نہیں اُٹھا، جو بہر حال زندگی کے آخری مراحل میں پہنچا ہوا تھا، بلکہ انسانی خُوبیوں اور اخلاص عمل کی زینتوں اور زیبائشوں کا ایک جمگھٹا تھا، جو اس کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ وہ ایک شمع نہیں بُجھی بلکہ اس کے ساتھ فضائل کی کئی شمعیں بُجھ گئیں۔ ہم اُن کے خطبات و ارشادات سے ہی نہیں، بلکہ ان کی شخصیّت سے بھی اندازہ کر سکتے تھے کہ جو بزرگ اس دُنیا میں ہمارے ورود سے بیشتر اُٹھ گئے، وہ کیسے تھے؟ اُن کے طور طریقے کیا تھے؟ وہ کن محاسن و محامد سے مزیّن ہونے کے باعث اکرام و احترام کے درجے پر پہنچے تھے۔ اب ایسے آئینے بھی شاذ ہی نظر آتے ہیں، جن میں ہم اسلاف کی صورتیں دیکھ سکتے ہیں، اِلّا ماشاءاللہ۔

مَیں نے اختصاراً جو کچھ عرض کیا، اس کا مقصد و مُدعا محض یہ ہے کہ ہم سمجھ سکیں مولانا سیّد محمد داؤد مرحوم کی شخصیت کا مقام و مرتبہ کیا تھا۔

دین و آزادی کی راہ میں قُربانیاں

مَیں نے مولانا داؤد کو سب سے پہلے نومبر ۱۹۲۱ء میں دیکھا جب ترکِ موالات کی تحریک ایک طوفان کی شکل اختیار کر چکی تھی اور بریڈلا ہال لاہور میں جمعیۃ العلماء

کا اجلاس مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ مولانا داؤد غالباً مجلس استقبالیہ کے سیکرٹری تھے۔ وہ اس سے پیشتر قومی و ملّی تحریک میں شامل ہو کر ایک ممتاز درجہ حاصل کر چکے تھے۔ ان کے بہت سے رفیق قید ہو چکے تھے اور وہ خود بھی اجلاس سے کچھ مدّت بعد گرفتار ہُوئے۔ مقدّمہ چلا اور قید کی سزا پا گئے۔

وہ کانگرس میں بھی شامل تھے کیونکہ آزادیٔ وطن کے لیے جہاد اُن کے نزدیک ایک اہم ملکی فرض ہی نہیں تھا، دینی فرض بھی تھا۔ وہ مجلسِ خلافت کے سربرآوردہ رہنماؤں میں گنے جاتے تھے کیونکہ جزیرۃ العرب کی تقدیس اور مملکتِ ترکیہ کی حفاظت کو ایک مقدّس اسلامی خدمت سمجھتے تھے اور جمعیتہ العلماء کے بھی اکابر میں شمار ہوتے تھے کیونکہ مُسلمانوں کی دینی رہنمائی اس ذریعے سے بہتر طریق پر انجام پا سکتی تھی اور مذہبی تنظیم کا صحیح راستہ یہی تھا۔

پہلی قید کے بعد بھی مولانا کو بار بار دینی، ملّی اور وطنی فرائض کی بجا آوری میں قید و بند کی مشقتوں سے سابقہ پڑتا رہا۔ اُنہوں نے ہر افتاد کا مقابلہ بے مثال صبر و استقامت سے کیا۔ ہر مرحلے پر وہ استقلال کی چٹان بنے رہے۔ عزیمت کی راہ پر چلنا ان کے خاندان کا ایک نہایت عزیز ورثہ تھا۔ یہ راہ اُنہوں نے زندگی بھر نہ چھوڑی۔ ہر انسان کی موت کا ایک دن مقرر ہے اور اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی، لیکن اگر کہا جائے کہ ان کی صحت انہیں قیدوں اور راہِ حق کی مشقتوں میں تباہ ہُوئی، تو یقیناً یہ مبالغہ نہ سمجھنا چاہیے۔

جہادِ آزادی میں سبقت

واضح رہے کہ آج یہ حالات محض ایک سرگزشت کے طور پر عرض کیے جا رہے ہیں اور یہ ایک مقالہ ہے کتاب نہیں۔ جن اصحاب نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ہے یا خود ان مشقتوں کے خار زار سے گزرے ہیں، وہی مذکورہ بالا قربانیوں کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ جو بھائی یہ دَور گزر جانے کے بعد پیدا ہُوئے یا جنہوں نے بعد میں ہوش سنبھالا، وہ محض الفاظ کی بنا پر حقیقی کیفیت کا تصوّر نہیں کر سکتے۔ آج فضا کا نقشہ بالکل بدلا ہوا ہے بلکہ پچیس برس پیشتر بھی اس میں خاصا تغیر پیدا ہو چکا تھا، لیکن

جب مولانا داؤدؒ اور ان کے ہزاروں رفیقوں نے ترکِ موالات کے پروگرام کو لباسِ عمل پہنایا تھا اور قربانیوں کی امتحان گاہ میں مردانہ وار قدم رکھا تھا، تو حکومتِ برطانیہ پہلی عالمی جنگ میں کامیابی حاصل کر کے دُنیا کی ایک بے پناہ قوت بنی ہوئی تھی اور اس قوت کے غرور و تکبر پر ضرب لگانا درحقیقت ایک آہنی دیوار سے سر ٹکرانا تھا جن مجاہدوں نے اس حصار کی بُنیادوں میں تزلزل پیدا کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا اُن کی غیرت و حمیت، شانِ استقامت، کمالِ عزیمت اور بے لوث ایثار میں کسی کے لیے بھی کلام کی گنجائش نہ تھی۔ تاہم مادی قوت کے ہمالیہ کو ریزہ ریزہ کر ڈالنا آسان نہ تھا۔ ان مجاہدوں کے سامنے یہ امر نہ تھا کہ نتیجہ مقصد کے مطابق برآمد ہو گا یا نہ ہو گا۔ محض یہ تھا کہ ادائے فرض کا تقاضا کیا ہے۔ البتہ وہ جانتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ باطل بظاہر کتنا ہی مضبوط و مستحکم کیوں نہ ہو وہ حق کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا اور یہی ہوا۔ وہی ضربیں تھیں جنہوں نے پہلی مرتبہ یہاں برطانوی تسلّط کے حصار میں رخنے پیدا کیے۔ پھر بار بار کے اقدامات سے وہ رخنے بڑھتے اور پھیلتے گئے یہاں تک کہ برطانوی تسلّط ایک افسانۂ پارینہ بن کر رہ گیا۔

اگر حق و انصاف اس دُنیا سے رخصت نہیں ہو گئے، تو کون ہے جو ان مجاہدوں کے احترام میں ایک لمحے کے لیے بھی متامّل ہو گا جو سب سے پہلے آگے بڑھے اور جنہوں نے ہراول میں ہونے کا شرف حاصل کیا۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے بنجر اور افتادہ زمینوں کو جانفشانیوں اور سربازیوں سے ہموار کیا۔ ان میں نہریں جاری کیں۔ کیا یہ امر محلِ تعجب اور باعثِ حیرت نہیں کہ آج ان زمینوں کی پیداوار سے فائدہ اُٹھانے والے لوگ پیشروؤں کی محنتوں اور مشقتوں سے بے پروا ہو جائیں یا انہیں فراموش کر دیں؟

ایک افسوسناک معاملہ

مجھے انتہائی افسوس ہے کہ پچھلے دنوں ہمارے ایک بھائی نے غلط مقدمات کی بنا پر ایک غلط نتیجہ پیشِ نظر رکھ کر مولانا داؤدؒ کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کیے جو موت کی سوگواری کے موقع پر کسی کے لیے بھی زیبا نہیں سمجھے جا سکتے۔ مختلف امور و معاملات کے باب میں رائے کا اختلاف اور فکر و نظر

کا تفاوت کوئی نادیدہ واقعہ نہیں۔ جب تک انسان اس دُنیا میں موجود ہیں، یہ تفاوت و اختلاف موجود رہے گا، مگر اس کی بنا پر محکم بُنیادی خدمات کو فراموش کر جانا اور جزئیات کو محلِ نزاع بنانا اور وہ بھی سراسر غلط مفروضات کی بنا پر، نہایت افسوسناک ہے۔

کبھی آپ نے سوچا کہ اس ذہنیت کی ہیئت ترکیبی کیا ہے؟ محض یہ کہ جب اپنے دامن میں فضائل و محاسن کے وہ جواہر ریزے موجود نہیں جن سے مولانا داؤد مرحوم اور ان کے ہزاروں رفیقوں کے دامن مالامال ہوئے، حبِ وطن، ملّت اور دین کے لیے ایثار کی وہ متاعِ عزیز نصیب نہ ہو سکی جو مولانا داؤد اور ان کے رفیقوں کی زندگی کا خاص سرمایہ ہے، تو مناسب یہی ہے کہ ان جواہر ریزوں اور اس متاعِ عزیز پر غلط بیانی اور حق نشناسی کا پردہ ڈال کر اپنے لیے ایک مقام پیدا کیا جائے۔ لیکن یہ بُری حرکات ہیں اور اس قسم کی حرکات سے نہ حسنِ عمل کی روشنی ماند پڑ سکتی ہے اور نہ بے عملی کا اندھیرا اُجالا بن سکتا ہے۔

میرے سامنے اس مسئلے کے متعدد پہلو ہیں جن پر بحث کروں تو مقالہ بہت طویل ہو جائے گا لیکن میں اپنے غلط بھائی سے صرف یہ پُوچھنا چاہتا ہوں کہ شخصیتوں کے موازنے کا جو معیار اس کے پیشِ نظر ہے اس کی بنا پر وہ کنھیں ملّتِ اسلامیہ کے مجاہد قرار دیتا ہے؟ کیا ان لوگوں کو جن کی صفیں مختلف الزامات کے سلسلے میں خاص وقت کے لیے سیاسی دائرے سے باہر نکل چکی ہیں یا نکالی جا چکی ہیں اور آج ان کی مزعومہ عظمت کے کھنڈر جا بجا دیکھنے والوں کے لیے سرمایۂ عبرت ہیں؟ ان کی خدمات کا جائزہ لے کر فیصلہ کرنے والے بھی موجود ہیں۔ کیا یہی حقیقت کافی بصیرت افروز نہیں؟

ایک واجب الاحترام مجاہد

بہر حال میں ایک بلند منزلت عالم، ایک عالی ہمّت اور بیباک مجاہد آزادی و اسلامیت کے تذکرے کو ایسی ناخوشگوار بحث سے آلودہ نہیں کرنا چاہتا۔ مولانا داؤدؒ اس دَور کی ایک بہت بڑی شخصیت تھے۔ دُور دُور تک نظر جاتی ہے مگر ایسا جامع اوصاف وجود کہیں نظر نہیں آتا۔ زندگی میں ان سے بیسیوں افراد کو اختلافات بھی پیش آئے اور خود مجھے بھی بعض اوقات ان سے اختلاف کرنا پڑا،

لیکن یہ بہت ہی چھوٹی اور حقیر باتیں ہیں۔ ان کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مولانا کی عظمت، ان کی عزیمت، ان کے ایثار، علم وفضل، زہد وتقویٰ اور عشقِ دین سے قطع نظر کیا جائے۔ انہوں نے عنفوانِ شباب سے کم وبیش تیس ۳۰ برس تک ملک وقوم اور دین کے لیے مجاہدانہ خدمات انجام دیں اور جب ان کی صحّت اچھی نہ رہی تو وہ گوشہ نشین ہو گئے اور یہ دَور بھی انتہائی سلامت رَوی سے گزارا۔ کبھی کسی سے پرخاش گوارا نہ کی۔ اچھّے اور نیک کاموں میں سب کا ساتھ دیا۔ وہ فطرتاً متوازن اور مستقیم تھے۔ اختلاف رائے کے وقت بھی سب کے ساتھ محبت، بہی خواہی اور خیرسگالی کا برتاؤ جاری رکھّا۔ عداوت کو ان کے دلی خلوص کی منزل میں کبھی بار نہ ملا۔ وہ اس اسلامی قافلہ کے آخری افراد میں سے تھے جن کی خدمات کے نقوش دَورِ حاضر کی تاریخ کا ایک بیش بہا سرمایہ ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والعاقبة للمتقین

حضرت مولانا داؤد غزنویؒ

چند تاثرات

مولانا محمد حنیف ندوی

مولانا مرحوم کی زندگی کے متعدد گوشے تھے۔ انہوں نے ایک زمانے میں جہاں مسندِ درس کو زینت بخشی تھی اور اپنی چچی تُلی تقریروں سے ایک نئے اسلوب کی طرح ڈالی تھی اور محراب و منبر سے کلمۂ حق بلند کیا تھا اور وعظ وارشاد سے دلوں کو گرمایا اور متاثر کیا تھا، وہاں انگریزی استعمار کے خلاف معرکہ آرائیوں میں شجاعانہ حِصّہ بھی لیا تھا۔ سیاسیات کے خارزار میں ایک نمایاں اور اُبھری ہوئی شخصیت کی حیثیت سے لائقِ صد فخر کردار بھی ادا کیا تھا۔ "توحید" کے نام سے آپ نے ایک بلند پایہ پرچہ بھی نکالا تھا، جس کی چند ہی اشاعتوں سے یہ توقع اور آرزو دلوں میں مچلنے لگی تھی کہ شاید اہلحدیث کی تاریخ میں کچھ نئے موڑ آنے کو ہیں اور علم و آگہی کے کچھ نئے ابواب کُھلنے والے ہیں، مگر افسوس کہ توقع اور آرزو کی بیتابیاں پنپ نہ سکیں اور یہ آفتابِ تازہ جس کو اہلحدیث کے تنِ مُردہ میں ایک رُوح پھونکنا تھی، چند ہی جھلکیوں کے بعد مغرب کے اتھاہ دھندلکوں میں غائب ہو کر رہ گیا۔ شاید اس دَور کی سیاسی ضروریات نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا کہ اس مردِ عظیم سے قلم و قرطاس کی آسودہ فکری کے بجائے رسن و دار اور طوقِ زنداں کی سختیوں کو جھیل لینے کا کام یقیناً زیادہ موزوں رہے گا۔ قضا و قدر کا یہ فیصلہ اپنی جگہ بالکل صحیح سہی۔ آپ نے جمعیت العلماء، خلافت، احرار اور لیگ کی تحریکات میں جو عظیم خدمات انجام دیں، بلاشبہ ان کو آنے والا مؤرخ سنہری حروف میں لکھنے پر مجبور ہو گا مگر اس خلش کا کوئی جواب بظاہر دلِ بے قرار سے بن نہیں پڑتا کہ اگر مولانا داؤدؒ جیسا طباع

اور ذہین انسان سیاست میں نہ الجھتا اور علم و عرفان کے اس زمزم سے تشنگانِ ادراک و فیض کی پیاس بجھانے کی کوشش کرتا جس کو حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت الامام عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے ذوق اخلاص و زہد نے بہ ہزار سعی و مجاہدہ جمع کیا تھا، تو اس کے نتائج کس درجہ شاندار ہوتے، توحید و سُنّت کا غلغلہ کتنا بلند ہوتا۔ اشاعتِ سُنّت کا کام کتنی تیزی سے آگے بڑھتا اور عرفان و سلوک کے دبستان کس کس دلآویزی کے ساتھ مشامِ جاں کو متاثر کرتے۔ زمانہ کی تیز رفتاریاں بھلا کب فرصت عطا کرتی ہیں کہ اس نوع کی حرماں نصیبیوں کے اظہار پر اپنی توانائیوں کو ضائع کیا جائے۔ تلافی مافات کے لیے اب ہماری نظریں مولانا مرحوم کے جواں سال اور جواں فکر فرزند مولانا ابوبکر غزنوی پر گڑی ہیں کہ وہ اُٹھیں اور دعوت و ارشاد کے اس منصب کو سنبھالیں اور تواضع، انکسار اور محبت و تودد کی ان فراوانیوں کے ساتھ جو تصوف و احسان کا خاصہ ہیں، تبلیغ و اشاعت میں نکلیں اور لسان و قلم کی جنبشوں کو اُس اوجِ کمال تک پہنچائیں کہ جس تک پہنچانے کی توقع بجا طور پر ان کے علم و فضل سے کی جاسکتی ہے۔ صرف یہی ایک طریق ہے کہ جس سے تاریخ کی ان ستم ظریفیوں کا انتقام لیا جاسکتا ہے جن کی وجہ سے مولانا داؤد غزنویؒ شدید خواہش اور طلب کے باوصف اپنی بے نظیر علمی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے ایسے لمحوں اور ایسی فرصتوں سے بہرہ مند نہ ہو سکے جو ان کے فیوض کے دائروں کو وسیع تر کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوسکتیں۔ اس دَور کی سیاسی مصروفیتوں نے دراصل موصوف کی شخصیّت کو اس درجہ گھیر رکھا تھا کہ انہیں کبھی بھی چین سے بیٹھ کر کام کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ میری رائے میں مولانا داؤدؒ اپنے ذوق و مطالعہ کے لحاظ سے کبھی بھی ان معنوں میں سیاسی آدمی نہیں تھے کہ علم اور طلب و تحقیق کے تقاضوں سے روگرداں ہو کر بس سیاست کے ہی ہو رہیں، بلکہ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ ان کو جب بھی فرصت ملتی یہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر اپنی لائبریری میں گھس جاتے اور فرصت کے عزیز ترین لمحوں کو اپنے رفیقانِ ذوق کے ساتھ جی بہلانے میں صرف کرتے۔ کُتب بینی، مطالعہ اور فقہ و

حدیث کے غوامض پر فکر و تحقیق ان کا خاص مشغلہ تھا۔ ان کی سیاسی سرگرمیاں اس دور کی مجبوری کا نتیجہ تھیں۔

اوّل اوّل میں جب اُن سے ملا تو ان کے بارہ میں میرا تاثر یہی تھا کہ میدانِ خطابت میں ان کی شعلہ افشانیاں مسلّم، لیکن حدود مطالعہ کے اعتبار سے یہ دُوسرے سیاسی لیڈروں سے کچھ زیادہ مختلف نہ ہوں گے، مگر یہ دیکھ کر مجھے حیرت انگیز تعجّب ہوا کہ قرآن، حدیث اور فقہ میں یہ اُن تمام مقامات و رموز سے آگاہ ہیں جو فہم و ادراک کے لیے اچھّی خاصی مجتہدانہ کاوشوں کے طالب ہیں۔ مجھے ان کی لائبریری کا جائزہ لینے کا بھی بارہا اتفاق ہوا۔ میں نے دیکھا ہے کہ کوئی اہم کتاب ایسی نہیں اور کسی کتاب کا کوئی اہم باب ایسا نہیں جس پر اُن کے حواشی و تعلیقات کی چھاپ نہ ہو۔ خصوصیت سے فقہ و تفسیر کے مسائل پر اُن کی نظر بہت گہری تھی۔ یہی وجہ ہے جب وہ کسی استفتاء کا جواب دیتے تو زیرِ بحث مسئلہ پر اس طرح دلائل کا انبار لگا دیتے کہ اس کا کوئی گوشہ تشنۂ تحقیق نہ رہتا۔ فتویٰ نویسی کا ذکر چھڑا ہے تو ان کی یہ خصوصیت سُن رکھیئے جو بھلائے نہیں بھولتی کہ اس سلسلہ میں مرحوم صرف کتابوں کے فنون و نصوص سے استفادہ نہیں کرتے تھے بلکہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ نفسِ مسئلہ کی معاملات کی رُو سے کیا اہمیت ہے اور اس بارے میں قانونِ فطرت یا عام سمجھ بوجھ کے تقاضے کیا ہیں۔

ژرف نگاہی کے پہلو بہ پہلو اُن میں روشن ضمیری بھی تھی۔ مجھے یاد ہے جب عائلی قوانین پر جمعیت اہلحدیث کی ایک مقرر کردہ سب کمیٹی میں بحث و تمحیص ہوئی، تو اُنہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا نقطۂ نظر یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ حکومت کی طرف سے اصلاحات کے نام پر جو قدم بھی اٹھایا جاتا ہے وہ سر تا پا غلط ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس میں کون سے اقدامات صحیح ہیں اور کون سے غلط۔ مولانا مرحوم کا موقف اس سلسلہ میں یہ تھا کہ ہمیں ان مسائل پر سیاسی اور گروہی تعصّبات سے بالا ہو کر خالص کتاب و سنّت کی روشنی میں غور کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ان اصلاحات میں اگر دس فیصد بھی ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق صحیح چیزیں پائی جائیں

تو ہمیں چاہیئے کہ بلا لومۃ لائم ہم جہاں نوّے فیصد مسائل میں حکومت کی مخالفت کریں وہاں دس فیصد صحیح اقدامات پر اس کی تعریف بھی کریں۔

پاکستان بن جانے کے بعد مولانا مرحوم کی تمام تر توجہ جمعیت اہلحدیث کی تنظیم پر مرکوز رہی۔ نامناسب نہ ہوگا اگر میں اس مرحلہ پر نظریۂ اہلحدیث کے مخصوص ذہن و مزاج کے بارے میں ان تصوّرات کی چہرہ کشائی کا فریضہ انجام دوں جو اکثر خلوتوں میں ہمارے ہاں زیرِ بحث رہے۔ خلوتوں کے لفظ سے کسی قسم کی غلط فہمی کو نہیں اُبھرنا چاہیئے۔ بات صرف یہ ہے کہ موت سے پہلے ادھر چند سالوں سے میرے ساتھ مرحوم کے تعلقات خاطر اور رسم و راہ کا یہ انداز قائم ہو گیا تھا کہ میں دوسرے تیسرے روز ضرور حاضری دیتا اور اگر میں کسی وجہ سے نہ آپاتا، تو بلاوا آتا اور کبھی کبھی خراماں خراماں خود بھی میرے ہاں تشریف لے آتے۔ بہرحال ہم جب بھی ملتے، یہ اہتمام کیا جاتا کہ گفتگو اور بات چیت کے لیے مکمّل یکسوئی حاصل ہو۔ اس کے بعد مشروبات کا دَور چلتا۔ لطائف کا تبادلہ ہوتا اور خالص علمی مسائل پر بحث و تمحیص کے گوناگوں دریچوں پر دستک دی جاتی۔ اس میں صرف و نحو، ادب، تفسیر، علم الکلام، فقہ اور حدیث کے غوامض پر کھُل کر اظہارِ خیال ہوتا اور اس اثناء میں یہ محسوس کر کے مجھے بے حد مسرّت ہوتی کہ روایت و درایت کے فاصلے سمٹ رہے ہیں اور قدیم و جدید کا تضاد دُور ہو رہا ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ مولانا نے اپنی دلآویز اور روایتی مُسکراہٹ کے ساتھ نہ صرف میرے بعض تفردات فکری کی پُرزور تائید کی بلکہ اس کے لیے شواہد بھی مہیّا کیے۔ خلوت کے یہ لمحے علم و تحقیق کی خشک بحثوں سے گزر کر آخر تصوّف، احوالِ آخرت اور قلب و رُوح کے جائزہ پر ختم ہو جاتے۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ اس اثنا میں ہم میں سے کس کی آنکھیں پہلے اشکبار ہوتیں، البتہ اتنا خوب یاد ہے کہ دونوں روتے اور دیر تک روتے رہتے۔

نظریۂ اہلحدیث سے متعلق ان کے ذہن میں تضادات کا ایک واضح نقشہ تھا اور وہ بہ دل چاہتے تھے کہ اس سے مخلصی حاصل کرنے کی جدوجہد میں اہلحدیث علماء کو شرکت کی

دعوت دی جائے مثلاً فکر و نظر کا یہ پیمانہ جسے ہم مسلکِ اہلحدیث سے تعبیر کرتے ہیں، ایک طرف تو اس بات کا مقتضی ہے کہ ہمارا تعلّق پُورے اسلام سے ہو، کتاب و سنّت کے بیان کردہ مکمّل نظامِ حیات سے ہو جس میں عقائد سے لے کر عبادات اور عبادات سے لے کر معاملات و اخلاق تک ہر ہر شے داخل ہو، اس شرط کے ساتھ کہ ہم اس نظامِ حیات کو براہِ راست کتاب اللہ سُنّتِ رسول اور سلف کی تصریحات سے اخذ کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ نقطۂ نظر کسی درجے میں بھی جزوی اسلام کا قائل نہیں اور فرقہ وارانہ تعصّبات کا حامی نہیں بلکہ ایک طرح کی کلّیت اور وسعت و جامعیت اپنی آغوش میں لیے ہُوئے ہے، لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ ہم بہت بحث و مناظرہ کی وجہ سے مسائل کی ان چند گنی چنی دیواروں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں جن کو گروہی عصبیت اور تنگ نظری نے پیدا کیا ہے۔ چنانچہ آج اہلحدیث کے معنی ایسے گروہ کے نہیں کہ جن کی نظر اسلام کے پُورے حکیمانہ نظام پر ہو، جن کے عمل سے اسلام کی تمام اخلاقی، اجتماعی اور رُوحانی قدروں کا خصوصیت سے اظہار ہوتا ہو اور جو روزمرّہ کی عام زندگی میں ہر ہر قدم پر کتاب و سنّت کی تصریحات کے متلاشی ہوں۔ آج اہلحدیث کے معنی اس کے برعکس ایک ایسے شخص یا جماعت کے ہیں جن کی دلچسپیوں کا محور عموماً صرف چند مسائل، چند بحثیں اور چند فرسودہ مناظرانہ کاوشیں ہیں۔

دُوسرا تضاد جس کو مولانا مرحوم تصوّرِ اہلحدیث کے بارے میں شدّت سے محسوس کرتے تھے، وہ اس دیرینہ تغافل سے عبارت ہے جس کو ہم نے عدمِ تقلید کے سلسلہ میں روا رکھا ہے۔ عدمِ تقلید سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ ہمیں مسائل کے اخذ و قبول میں کسی فقہی مدرسۂ فکر کی پابندی نہیں کرنا چاہیئے۔ عدمِ تقلید کا یہ مفہوم محض سلبی نوعیت کا ہے جس سے کسی تہذیبی خاکے کی تعمیر نہیں ہوتی۔ عدمِ تقلید کے ایجابی اور تہذیب آفریں معنی یہ ہیں کہ جہاں ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم وقت و زماں کے فاصلوں کو پھلانگ کر سمع و اطاعت کی ایک ہی جست میں اس پاکیزہ ماحول میں پہنچ جائیں جہاں لسانِ نبوّت اور نطقِ پیمبر براہِ راست زمزمہ پیرا

ہے، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ اس پاکیزہ ماحول، ان قیمتی اقدار اور فکر و نظر کی اس وسیع تر فضا کو موجودہ حالات پر بھی منطبق کرنے کی سعی بلیغ کریں اور سوچنے کا انداز یوں قائم کریں کہ اگر آج اسلام نازل ہوتا ہے اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے موجودہ دور میں آنحضرت ﷺ تشریف لاتے اور پوری انسانیت کو اپنا مخاطب قرار دیتے، تو اسلام کا تصوّر تابش وضوء کی کن کن صورتوں پر مشتمل ہوتا۔ مولانا اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ فرض اہلحدیث پر عائد ہوتا ہے کہ وہ کتاب وسنت کی روشنی میں مسائل زیر بحث پر مجتہدانہ غور کریں اور لوگوں کو بتائیں کہ فقہاء متاخرین کے فیصلہ کے علی الرغم اجتہاد کے دروازے آج بھی کھلے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ایک عرصہ سے اہلحدیث اجتہاد کی اہمیت، ضرورت اور فوائد سے ناآشنا ہیں۔

تضاد کی تیسری صورت جس سے مولانا ازحد شاکی اور پریشان تھے، جماعت اہلحدیث کے مزاج کی موجودہ کیفیت ہے۔ مولانا کے نقطۂ نظر سے اسلام چونکہ تعلق باللہ اور اس کے ان انعکاسات کا نام ہے جو معاشرہ اور فرد کی زندگی میں لطائف اخلاق کی تخلیق کرتے ہیں۔ اس لیے تحریک اہلحدیث کا اوّلین مقصد یہ ہونا چاہئیے کہ جماعت میں محبت الٰہی کے جذبوں کو عام کرے۔ تعلق باللہ کی برکات کو پھیلائے اور اطاعت و زہد، اتّقاء و خشیت اور ذکر و فکر کو رواج دے، لیکن ہماری محرومی و تیرہ بختی ملاحظہ ہو کہ عوام تو عوام، خواص تک تصوف و احسان کی ان لذتوں سے ناآشنا ہیں۔ حالانکہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے کہ خواص تو خواص ہمارے عوام تک زہد و ورع کا بہترین نمونہ سمجھے جاتے تھے۔ آپ پوچھیں گے کہ مولانا مرحوم کے نزدیک ان تضادات سے چھٹکارا پانے کا طریق کیا تھا؟ بارہا یہ مسئلہ مولانا کے ہاں زیر بحث آیا۔ ان کی اس سلسلہ میں جچی تلی رائے یہ تھی کہ ہمیں تعلیم و تربیت کے پورے نظام کو بدلنا چاہیئے اور اس کو ایسی شکل دینا چاہیئے کہ جو جماعت اہلحدیث کی تعمیر نو کے لیے زیادہ سازگار ثابت ہو سکے اور اس کے فکر و عقیدہ کو ایسی استوار بنیادوں پر قائم کر سکے کہ جن میں تضاد اور الجھاؤ کی خلل اندازیاں نہ پائی جائیں، جو ان میں زندگی کی نئی روح دوڑا سکے۔

حضرت مولانا محمد داؤد غزنویؒ

ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب

میری دینی تعلیم کا آغاز مدرسہ نعمانیہ لاہور میں ہوا جہاں منجملہ دوسرے اساتذہ کے، مَیں نے حضرت مولانا غلام مُرشد سے بھی اکتسابِ فیض کیا ـــــ لیکن نعمانیہ میں میرا قیام کچھ زیادہ نہ ہوا مَیں تھوڑے ہی عرصے کے بعد ایک دُوسرے مسلک کے مرکز یعنی مسجد چینیاں والی میں آپہنچا جہاں حضرت مولانا عبدالواحد غزنویؒ کے درس میں شریک ہوتا تھا اور مرحوم و مغفور حافظ محمد حُسین (نابینا) سے مشکوٰۃ شریف پڑھنے لگا۔ حافظ صاحب بطور مؤذن لاہور میں مشہور تھے۔ ان کی اذان کی آواز قلبِ شہر سے چار اطراف حتیٰ کہ شہر سے باہر مزنگ تک سنائی دیتی تھی ـــــ بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ میں اسی زمانے میں، مولانا محمد داؤد غزنویؒ سے متعارف ہوا۔ یہ ۲۱-۱۹۲۲ء کی بات ہے۔ وہ اس زمانے میں امرتسر میں رہا کرتے تھے اور گاہے گاہے اپنے بزرگ حضرت مولانا عبدالواحد غزنویؒ سے مِلنے آیا کرتے تھے۔

خوبصورت، خوش وضع، خوش لباس، خوش گفتار، خوش رفتار ـــــ سر پر کبھی سفید عمامہ، کبھی پشاوری لنگی، ـــــ مردانہ حُسن کا مثالی نمونہ ـــــ، بے ادبی تو ہے مگر ان کے جمال و جلال پر حسرت موہانی کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

رعنائی و زیبائی و محبوبی و خُوبی
کیا بات ہے جو اس قدِ دلجو میں نہیں ہے

یہ تحریکِ خلافت کا دَور تھا۔ وہ کبھی کبھی لاہور کے جلسوں میں تقریر کرنے کے لیے بھی

آتے تھے اور چونکہ میں خود بھی خادمِ خلافت تھا، اس لیے مجلس خلافت کے جلسوں میں تقریریں سننے کے لیے جایا کرتا تھا۔ مجھے مولانا داؤد غزنویؒ کی تقریر بہت اچھی لگتی تھی۔ مولانا کا اندازِ خطابت منفرد تھا۔ صاحبِ عقدالفرید نے لکھا ہے اعلیٰ خطابت کے لیے چار چیزیں لازمی ہیں۔ خطیب کی وجاہت، خطیب کی فصاحت و بلاغت، خطیب کی گُونج دار آواز اور خطیب کی مجمع شناسی اور وسائلِ اثر آفرینی۔ مَیں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مولانا داؤد غزنویؒ کی خطابت میں یہ چاروں اوصاف موجود تھے۔

تحریکِ خلافت و احرار کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اُس نے بڑے بڑے خطیب پیدا کیے۔ اس میں اکابر تو کیا عام کارکن بھی، خطیبانہ اوصاف کے مالک تھے، مولانا ابوالکلام، علی برادران، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان، مولانا ظفر علی خان تو خلافت سے قبل ہی روشناسِ خلق ہو چکے تھے، اب ان کے مقابلے میں نسبتاً جوان اور نوجوان خطیب چمکے۔ ان میں حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی خطابت کا تذکرہ تو صدیوں کے پیمانے سے ناپا جا سکتا ہے، مگر ان کے رفقا، میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا مظہر علی اظہر، خواجہ عبدالرحمٰن غازی، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، صاحبزادہ فیض الحسن اور بالکل نوجوانوں میں شورش کاشمیری اور نوابزادہ نصر اللہ خان —— اور ان کے ساتھ مگر ان سے افضل حضرت مولانا داؤد غزنویؒ بھی تھے۔

مَیں نے انہیں افضل خطیب اس لیے کہا ہے کہ ان میں خطابت کے مذکورہ بالا چاروں اوصاف پائے جاتے تھے۔ باقیوں میں ایک آدھ وصف کی کمی نظر آتی تھی۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک گوہرِ آبدار تھا مگر غزنوی صاحبؒ کی سی مکمل خطابت ان میں سے کسی کو میّسر نہ تھی۔ ایک بلند قامت وجیہہ شخص، اپنی گونج دار آواز کے ساتھ، فقروں کے زیر و بم میں، عالمانہ رعب و داب کے ساتھ جب محوِ تکلم ہوتا تھا تو شاعرانہ محاورے کے مطابق عنادل بھی ٹھٹک کر رہ جاتی تھیں ——،

اس گروہ میں چودھری افضل حق سب سے کم درجے کے خطیب تھے، مگر جماعت کا دماغ وہی تھے۔ شورش کاشمیری کم عمری میں اس قافلے میں شامل ہُوئے، اس لیے ادبائیں ان کا

ذکر بزرگوں کے ساتھ نہیں کرتا ـــــ مگر ان کے بزرگ خود کہا کرتے تھے کہ یہ لڑکا ہمارے بعد ہمارے پلیٹ فارم کو چمکائے گا اور بعد میں واقعی اس نے چمکایا ـــــ مولانا عبدالقادر قصوری، اس سارے گروہ کے جدِ امجد تھے۔ ثقہ، متین، مدبر، شفیق، پُرسکون۔ ہمہ صفت موصوف، تقریر بھی اچھی کرتے تھے، مگر وہ مدبرانہ ہی ہوتی تھی، اسے خطیبانہ نہیں کہا جا سکتا۔

یہ مقابلہ میں اس لیے کر رہا ہوں کہ ایک ایسے گروہ میں جس کا ہر فرد کسی نہ کسی طور سحبان بن وائل تھا حضرت مولانا داؤد غزنویؒ فصحا و زعما کے اس ہجوم میں بھی ایک امتیاز، ایک انفرادیت رکھتے تھے۔ جس کی ایک وجہ، ان کے خاندان کی مجاہدانہ تاریخ بھی تھی اور ان کی ذاتی فضیلتِ علمی اس پر مستزاد تھی۔

اس مضمون میں غزنوی خاندان کی سابقہ کہانی شاید بے محل ہوگی، مگر اتنا تو سب جانتے ہیں کہ حضرت مولانا عبداللہ غزنویؒ اپنے عقائد اور تمسک بالسنۃ کے بارے میں استقامت کی سزا کے طور پر، اپنے وطن سے ہجرت پر مجبور کر دیے گئے۔ وہ اپنے خاندان سمیت پنجاب میں آ گئے اور افرادِ خاندان نے امرتسر اور لاہور میں قیام کیا اور ردِّ بدعت اور اثباتِ سُنّت میں منہمک ہو گئے۔

دعوت و عزیمت کی یہ روایت خاندان میں مسلسل جاری رہی؛ چنانچہ آج تک (فاضلِ عزیز سید ابوبکر غزنوی کی صورت میں) جاری ہے۔

خاندان کے بزرگوں نے جو کچھ کیا وہ ایک الگ داستان ہے۔ حضرت مولانا داؤد غزنویؒ نے تحریکِ خلافت اور اس کے بعد آزادئ وطن اور قیامِ پاکستان تک تمام تحریکوں میں اس روایت کو سرسبز رکھا۔ بارہا قید ہوئے، نظر بند ہوئے، مصائب برداشت کیے، مگر جس راستے کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے مفید خیال کیا، اس پر قائم رہے۔

مجلسِ خلافت پنجاب کے انقراض کے بعد تحریکِ احرار میں شامل ہو گئے ـــــ اس کے بعد کانگرس کمیٹی پنجاب کے صدر مقرر ہوئے اور آزادئ ہند کی تحریک کے اس نازک مرحلے میں یہ ثابت کرنے کے لیے کہ مسلمان آزادئ وطن کے جہاد میں کسی دوسری قوم سے پیچھے نہیں، انہوں

نے پنجاب میں حُریّت پسند مسلمانوں کی قیادت کی اور اس طرح ہندو مہاسبھا کے اس طعنے کی تردید کی کہ مُسلمانوں کی قوم انگریزی راج کے دوام کی مؤید ہے، لیکن اس کے بعد تاریخ ایک ایسے موڑ پر پہنچ گئی جس پر یہ یقینی سا ہو گیا کہ انگریز اب اس ملک میں دیر تک رہ نہیں سکتا، تو سوال پیدا ہوا کہ انگریزوں کے رخصت ہو جانے کے بعد، اس وطن میں مسلمانوں کی مجلسی اور سیاسی حیثیت کیا ہو گی؟

سچّی بات یہ ہے کہ یہ نہایت اہم سوال تھا، مگر حرّیت پسند مسلمانوں کی اکثریت اس نکتے کو (پُورے خلوص کے باوجود) نہ سمجھ سکی اور کانگرس سے کوئی تسلّی بخش توثیق حاصل کیے بغیر، جنگِ آزادی کے ختم ہو جانے اور نیا دَور شروع ہونے کے بعد بھی، اسی پُرانے خیال پر قائم رہی کہ انگریزوں سے جنگ فریضۂ اوّلین ہے، باقی بعد میں دیکھا جائے گا۔

عاجز راقم کے خیال میں ہمارے اکابر سے بس یہیں بھُول ہُوئی۔ درحقیقت دُوسری عالمگیر جنگ کے خاتمے پر انگریزی استعمار کی چُولیں ڈھیلی ہو چکی تھیں اور آزادئ ہند کا چہرہ نظر آنے لگا تھا، مگر ہمارے اکابر کی انگریز دشمنی نے ان کے دماغوں کو مغلوب کیا ہوا تھا اس لیے وہ نیک نیتی سے اپنے پُرانے طریقِ کار پر جمے رہے۔ لیکن حضرت مولانا داؤد غزنویؒ نے کانگرس کے اندر اعلٰے عہدے پر فائز رہنے کے باوجود یہ محسوس کر لیا کہ قائدِ اعظمؒ مسلمانانِ ہند کے لیے جس سیاسی حیثیت کی توثیق چاہتے ہیں، وہ اس میں برحق ہیں۔ فی الواقعہ وہ وقت آن پہنچا تھا جب مسلمان اپنی مستقل ملّی ہستی کو تسلیم کرانے کے لیے متفق و متحد ہو جاتے۔ اِس بصیرت کی بنا پر حضرت غزنویؒ کانگرس سے الگ ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اس پر انہیں اپنے پُرانے رفقاء کے طعنے بھی سننے پڑے مگر ان کا وجدان صحیح تھا اور اس کی تائید بعد کے واقعات نے بدرجۂ وثوق کر دی کہ ان کا اقدام بالکل صحیح تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد حضرت غزنویؒ نے اس ملک کی اسلامی تشکیل کے لیے بڑی تگ و دو کی اور تحریکِ پاکستان میں کیے گئے وعدوں کی تکمیل کے لیے جو کچھ ان سے ہو سکا، انہوں نے کیا۔ مگر انکی رُودادِ حیات کا یہ حصّہ شاید دوسرے مقالہ نگار قلمبند کر دیں گے، اس لیے اس باب میں، مَیں زیادہ کچھ نہیں لکھتا۔

غفران مآب غزنوی صاحبؒ کی اس سرگزشت میں اپنے حالات و واقعات کا پیوند لگانا مجھے اچھّا نہیں لگتا ـــــ اس لیے میں ان سے اپنے تعلّقات کا تذکرہ نہیں کرتا؛ البتّہ اتنا بیان کر دینے میں کچھ مضایقہ نہیں کہ ان کی خوش اخلاقی، عارفانہ تواضع اور عالمانہ متانت، ـــــ اور علمی بحث و نظر کے دلنشیں انداز اور فکر انگیز اسلوب سے وہ لوگ بھی متاثر ہو جاتے تھے جن پر تاثیر کی کبھی توقع نہ ہو سکتی تھی۔ حسرتؔ ہی کا ایک شعر پھر ان کے بارے میں لکھتا ہوں ـــــ

شوق کی ایک نظر میں ہوئے وہ سب کامل جن پہ صدیوں نہ ہُوئی صدق و وفا کی تاثیر

کچھ آخر میں پاکستان کے رنگِ سیاست سے اندر اندر بیزار اور مایوس نظر آتے تھے، مگر کھل کر کچھ نہ کہتے تھے۔ مجھ سے ایک مرتبہ فرمایا کہ حالت دگرگوں ہے۔ میں نے پوچھا، کیسے؟ فرمایا: توقع پُوری ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ مَیں نے کہا: کیونکر؟ فرمایا: اسلام کسی کے مدِّنظر نہیں۔ قائدِ اعظمؒ سے کھُلی بے وفائی ہو رہی ہے۔ لیکن ہمارا فریضہ اب بھی خیر خواہی ہے ہم پاکستان کے لیے دُعا کرتے ہیں۔

اس کے بعد آخر وقت تک پاکستان کے دُعاگو رہے مگر زیادہ وقت اپنے دینی مدرسۂ علوم کی تنظیم اور طلبہ کی تدریس و تعلیم میں گزارنے لگے۔

آخری مرتبہ جب ان سے مِلا تو بیمار تھے، تاہم لہجے میں وثوق تھا ـــــ مجھ سے فرمایا:

"دین ہی حسن المآب ہے۔ ہم جیسے لوگوں کو پھر دین کی نشر و اشاعت میں لگ جانا چاہیے کیونکہ مجھے پاکستان کے افق پر الحاد و کفر کی آندھیاں اُٹھتی نظر آتی ہیں ـــــ محنت کچھ رائیگاں ہوتی نظر آتی ہے۔ دین اور اہل دین رسوا ہونے والے ہیں ـــــ ہاں رحمتِ خداوندی کا سہارا ہے۔ لہٰذا اسی پر توکّل اور اسی پر اعتماد ہے۔"

اس روز کے بعد میں ان سے نہ مل سکا اور وہ اسی اثنا میں واصل باللہ ہو گئے۔ صرف جنازے میں ان کے تابوت سے سرسری سی ملاقات ہُوئی، مگر اشکبار آنکھوں سے، ان کی پُرجلال تصویر اب تک آنکھوں کے سامنے ہے۔ خُدا تعالیٰ انہیں مغفرت فرمائے اور ہم سب پر اپنا کرم کرے۔

حضرت مولانا محمد داؤد غزنویؒ

مولانا مظہر علی اظہر

تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جو اپنے بندوں کو اکثر بلا استحقاق نوازتا ہے اور بالاستحقاق بھی نوازتا ہے، مگر اس کا شکر زیادہ تر وہی ادا نہیں کرتے جن کو وہ بے استحقاق نوازتا ہے۔

برِّصغیر پاکستان و ہند کی آزادی کے بعد بہت سے لوگ اپنی آزادی پر فخر کرتے ہیں اور انہیں قسمت نے جو مواقع عطا فرمائے ان سے بہجت و سرور محسوس کرتے ہُوئے اتراتے ہیں مگر تحریکِ آزادی میں ان کا یا ان کے بزرگوں کا کوئی حِصّہ نہ تھا۔ انگریزی عہد میں وہ حکومت کی امداد پر قناعت کرتے تھے اور اپنا کیسہ بھرتے تھے۔ ملازمت، جاگیر اور حصولِ اراضی وغیرہ ان کے نصب العین تھے جن کے لیے وہ اپنی زندگیاں اور زندگی کی سب کوششیں وقف کرتے تھے اور انگریزوں کی حکومت کے استحکام میں ہی اپنی زندگیوں کی بہتری اور اپنی فارغ البالی کا انحصار سمجھتے تھے۔

لیکن حضرت مولانا محمد داؤد صاحب غزنوی مرحوم و مغفور ان بزرگوں میں سے تھے جنہیں زندگی کی سہولتوں کی بجائے اس کی صعوبتیں پسند آئیں۔ جن لوگوں کو ۱۹-۱۹۱۸ء کا زمانہ یاد ہے وہی بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ جب تُرکوں کو ۱۹۱۸ء میں برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کے ہاتھوں شکست ہُوئی اور خلافتِ اسلامیہ کے زوال کا وقت آیا تو برِّصغیر میں مسلمانوں کا کیا حال تھا۔ ایک طرف انگریز اپنی قوت و جبروت پر نازاں تھا، دوسری

طرف اس کے ہمنوا ہندو اور مسلمان جشنِ فتح منا کر اپنے لیے خوشنودیٔ حکومت کی سند حاصل کرنے اور دولت دنیا سے کچھ نفع کمانے میں منہمک تھے اور انگریزوں کو یہ خیال بھی آنے نہ دیتے تھے کہ انہیں ہندوستان کے مسلمانوں سے کوئی خطرہ تو کیا کچھ پریشانی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ زمانہ تھا جب مولانا محمد داؤد غزنویؒ اپنی جوانی کا چڑھاوا لے کر آزادیٔ وطن اور سربلندیٔ اسلام کی قربان گاہ کی طرف پیشقدمی کرتے ہوئے گھر سے نکلے۔

آج لوگ بحث کرتے ہیں کہ مولانا مرحوم کو سیاست آتی بھی یا نہیں، مگر وہ یہ سوچنے سے قاصر ہیں کہ جو سیاست ان کو آتی تھی اس کا کوئی شائبہ بھی ان کے نکتہ چینوں میں موجود تھا یا نہیں۔ جب دُنیائے اسلام کی سب سے بڑی سلطنت، سلطنتِ ترکیہ شکست کھا چکی ہو اور یورپ کے اتحادی اپنے تمام وعدوں کو بھول کر سرزمین ترکی پر ہی نہیں بلکہ تمام جزیرۃ العرب پر قبضہ کر رہے ہوں اور عربوں پر مہربانی کرتے ہوئے بھی ان کے مُلک کو بہت سے مختلف حصّوں میں بانٹ کر علیحدہ علیحدہ مگر بے حیثیت بادشاہتیں بنا رہے ہوں تاکہ نیم آزاد عرب آپس کی کش مکش میں مبتلا ہو کر کسی متحدہ اقدام یا حکمتِ عملی کے قابل نہ رہیں، جب یہودیوں کے لیے فلسطین کا انعام پیش کیا جا رہا ہو اور شام سے لبنان کو علیحدہ کر کے ایک ضلع کے عیسائیوں کی خاطر ایک مقتدر حیثیت میں رہنے کے لیے ایک چھوٹی سی حکومت کی تشکیل کی جا رہی ہو، جب خود ہندوستان میں حکومتِ برطانیہ کے ہوا خواہ مسلمانوں کی کوئی کمی نہ ہو، اس وقت بے توپ و تفنگ میدانِ جنگ میں نکلنا اور حکومتِ وقت کی مخالفت کر کے اپنے آپ کو قید و بند کے لیے پیش کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔

وہ زمانہ تھا جب مولانا داؤد غزنویؒ نے ۲۲، ۲۳ برس کی عمر میں اس میدانِ خار دار میں قدم رنجہ فرمانا گوارا کیا۔ ۱۹۱۸ء کے کرسمس میں حکومت نے جشن فتح منانے کا فیصلہ کیا۔ سرکاری آدمی جشن منانے لگے۔ دلّی سے علماء کرام نے جشنِ فتح کے بائیکاٹ کی ہدایت

کی اور مولانا جیسے نوجوان حکومت کی مخالفت کے سنگین کام پر مستعد نظر آنے لگے۔

اُس زمانے میں بعض مرتبہ ہمارے جاننے والے بزرگ ہمیں بازاروں میں پکڑ کر کھڑے ہو جاتے اور کندھوں پر ہاتھ رکھ کر فرماتے تھے "ترکوں کو شکست ہو گئی، جرمنوں کو شکست ہو گئی، آسٹریا کو شکست ہو گئی۔ اب تم ننھے بہادر اُٹھے ہو جو انگریزوں کو ہندوستان سے نکالو گے۔ ہوش بھی ہے یا نہیں۔ کیا عقل جواب دے چکی؟" ایسے سوالوں کا جواب مولانا کو کئی مرتبہ دینا پڑا ہو گا۔ ہر کسی کو ایسے سوالوں کا جواب دینا پڑتا تھا۔ اللہ پر یقین اور اس کی قدرتِ کاملہ پر اعتماد کے مخلصانہ جذبے سے ہی ایسے سوالوں کی بوچھاڑ میں ثابت قدم رہا جا سکتا تھا اور جنہیں یہ نعمت عطا نہ ہوئی ہو وہ اس جذبے کی قدر نہیں کر سکتے اس لیے ان کی آج کی نکتہ چینیوں پر بھی ناراض نہیں ہونا چاہیئے۔

انگریز حکّام نے آنے والے ہیجان کے مقابلے کے لیے رولٹ بل تیار کیا تاکہ ہر تحریکِ آزادیٔ ہند و آزادیٔ ممالک اسلامی کا مقابلہ جبر و تشدّد سے کیا جا سکے۔ اس مجوّزہ قانون کے ماتحت مُلزموں کو وکیل کرنے کی اجازت نہ تھی، نہ وہ اپیل کر سکتے تھے اور نہ ہی قانونی شہادت کی ضرورت سمجھی جاتی تھی، اس لیے عوام و خواص میں ہی نہیں بلکہ حکومتِ ہند کے نامزد ہندوستانی ممبروں میں بھی اس کی سخت مخالفت تھی۔ سر سنکرن نائر جیسے ممبر قانون نے اس کی مخالفت کی اور اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ اسی طرح اور بڑے بڑے ہندو سرکاری افسروں نے بھی مخالفت کی۔

کانگرس نے ملک کی آزادی کے نام پر، مسلم علماء اور دیگر رہنماؤں نے آزادیٔ ملک اور تحفّظِ خلافتِ اسلامیہ کے نام پر حکومت کے نئے مجوزہ قانون کی مخالفت شروع کر دی۔ گاندھی جی نے ۶ اپریل ۱۹۱۹ء کو سارے مُلک میں جلسوں کا اعلان کیا اور لوگوں کو ہڑتال کی تلقین کی۔ پُورے ملک میں ہر جگہ کاروبار معطّل کیا گیا، لیکن امرتسر میں ۶ اپریل سے پہلے ہی ڈاکٹر سیف الدّین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کیا گیا

لوگوں میں ہیجان برپا ہوا۔ وہ اکٹھے ہو کر ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پر جانے لگے تاکہ ان کی رہائی کا مطالبہ کریں۔ ریل کے پُل کے قریب پولیس نے راستہ روکا۔ لوگوں کو آگے بڑھنے نہ دیا گیا بلکہ ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے گولی چلا دی گئی جس سے کئی لوگ مارے گئے اور بہت سے زخمی ہُوئے۔ فساد کرنے والوں کو موقع ملا۔ شہر میں لُوٹ مار اور آتش زنی کی وارداتیں ہوئیں اور کئی انگریز جو لوگوں کے ہاتھ آئے انہیں قتل کر دیا گیا۔ شہر میں مارشل لاء کا اعلان ہوا، مگر چھ روز تک نظم و نسق لوگوں کے ہاتھ میں رہا۔ جلیانوالہ باغ میں روز جلسے ہوتے تھے اور لوگوں کو پُرامن رہنے کی تلقین کی جاتی تھی۔

مگر ۱۳ اپریل اتوار کے روز بیساکھی کے دن جنرل ڈائر اپنی ہندوستانی فوج لے کر آیا اور اس نے جلیانوالہ باغ کے ایک دروازہ پر پہنچ کر جو شمالی جانب تھا، اپنے سپاہیوں کو گولی چلانے کا حکم دیا۔ سپاہیوں نے گولی چلائی اور جب تک گولیاں ختم نہ ہوئیں اس وقت تک گولی بند کرنے کا حکم نہ دیا گیا۔ سینکڑوں قتل اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ مجمع بے طرح منتشر کیا گیا۔ ڈائر انسانی دلوں پر رعب جمانا چاہتا تھا لیکن اثر اُلٹا ہوا۔ مُلک کے ایک سرے سے لے کر دُوسرے سرے تک جوش و ولولہ اور غم و غصّہ کی لہریں دوڑ گئیں تحریک مدہم ہونے کی بجائے تیز تر ہُوئی اور روڈ و ائر اور ڈائر کی حکمتِ عملی کو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

اس ماحول میں حکُومت کی مخالفت میں امرتسر کے شہر سے نکلنا اور مستقل کام کے لیے تیّار ہو کر اپنی جوانی کو ملک و ملّت کی خدمت کے لیے پیش کرنا، وہ سیاست تھی جسے مولانا داؤد مرحوم نے اختیار کیا۔ وہ کبھی تحریکِ خلافت کے سلسلے میں قید ہُوئے، کبھی تحریکِ کانگرس کے سلسلے میں پابہ زنجیر دکھائی دیئے۔ وہ مجلسِ خلافت پنجاب کے جنرل سیکرٹری بھی رہے اور پنجاب کانگرس کے جنرل سیکرٹری بھی رہے۔

جب مجلسِ خلافت باہمی اختلافات کا شکار ہوئی اور ۱۹۲۹ء میں مجلسِ احرار بنانے کی نوبت آئی تو وہ مجلسِ احرارِ اسلام ہند کے قائم کرنے والوں میں تھے۔ برسوں وہ انگریزوں

اور انگریز پرستوں سے برسرِ پیکار رہے۔ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے انہیں فرمایا کہ مجھے کانگرس میں آپ کی ضرورت ہے تو آپ نے مجلسِ احرار سے علیٰحدگی اختیار کی اور پنجاب کانگریس کے صدر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں جب ملک کی تقسیم کا مطالبہ زوروں پر ہوا تو وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور تقسیم کے بعد مسلم لیگی ایم ایل اے کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اُنھوں نے عمر بھر ملک و ملّت کے لیے بیش بہا قربانیاں دیں۔ ساز و سامان کے ساتھ ہم نے محمود غزنوی کو نکلتے دیکھا اور بے سرو سامانی میں ہم نے داؤد غزنویؒ کو نکلتے دیکھا۔ وہ قیدی بنانے کے لیے نکلا اور یہ قیدی بننے کے لیے نکلے۔

مولانا نے ہمیشہ اپنے مفید مشوروں سے اپنے ساتھیوں کی رہنمائی کی اور اپنی بساط سے بڑھ کر کام کیا۔ مسجد شہید گنج کی تحریک کے زمانے میں اُنھوں نے ماسٹر تارا سنگھ جی کی صلح کی پیش کش کو قبول کرنے کا مشورہ دیا جس کی تائید سیّد حبیب مرحوم نے کی، لیکن مولانا ظفر علی خان مرحوم نے کسی "ذمّہ دار افسر سرکار" کے مشورہ کو مشعلِ راہ بنایا اور راضی نامہ سے انکار کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم آج تک منزلِ مقصود کو حاصل نہ کر سکے۔ اسی طرح اور مسائل میں ہمارے بہت سے دوستوں کو سُلجھانے کی بجائے اُلجھانے کا بہت شوق ہے جس کے باعث مزعومہ "کامیاب سیاستدان" اپنی ناکامیوں کے باوجود کامیاب سیاستدان سمجھے جاتے ہیں۔ یہ خُدا کی شان ہے کہ آزادی کی جنگ لڑنے والے انگریز کے جانے کے بعد بھی ناکام سمجھے جائیں اور انگریز کے بے دام و بادام غلام اپنی ناکامیوں کے باوجود کامیاب سمجھے جائیں۔

اللہ تعالیٰ مولاناؒ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ہماری اور ان کی خطاؤں کو معاف فرمائے۔

سیّد محمد داؤد غزنویؒ

جنگِ آزادی کے سالارِ اوّل

آغا شورش کاشمیری

۶ر دسمبر ۶۲ء کی صبح کو مَیں نے خواب دیکھا کہ مولانا داؤد غزنوی سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے معانقہ فرما رہے ہیں۔ معاً آنکھ کھل گئی، مؤذن پکار رہا تھا الصلوٰۃ خیر من النوم ——— نماز نیند سے بہتر ہے۔ مَیں خوابوں کے معاملہ میں کچھ زیادہ پریشان ہونے کا عادی نہیں۔ اپنے ربّ سے پناہ مانگتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ خیال تھا یا ایک دُھندلا سا تصوّر کہ کوئی سی بجلی کسی شاخ پر گرنے والی ہے۔ خوابوں کی تعبیر کے بارے میں جو کچھ مَیں نے پڑھا ہے اس سے مختلف کیا ہو سکتا تھا۔ کوئی دس بجے صبح دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ماسٹر تاج الدین انصاری نے یہ خبرِ بد سُنائی کہ مولانا داؤد غزنوی انتقال فرما گئے ہیں۔

مولانا علیہ الرحمہ ہی کے مکان سے فون آیا تھا کہ نو بجے صبح ایکا ایکی حرکتِ قلب بند ہونے سے اُن کا سفرِ حیات ختم ہو گیا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

خبر اچانک ضرور تھی لیکن غیر متوقع نہ تھی، وہ جانے ہی والے تھے اور کئی مہینوں سے رختِ سفر باندھ رہے تھے، موت نے اُن کے چہرے کو تاکنا جھانکنا شروع کر دیا تھا۔ دل کا پہلا دَورہ ہی انہیں ہلا گیا تھا۔ وہ مرنے کے لیے تندرست ہوتے رہے۔ اسی دن کے لیے وہ جی رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے بیماری اُن کو چاٹ گئی ہے۔ ہڈیوں کا ایک ڈھانچ رہ گیا ہے جس میں نفس کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے۔ بیمار تو وہ کئی برس سے تھے۔ مگر پچھلے ایک برس سے پت جھڑ کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ ابھی

دو چار ماہ پہلے عبداللہ ملک کی والدہ مرحومہ کا جنازہ پڑھانے تشریف لائے تو چلا نہیں جاتا تھا، نہ پہچان سکتے تھے نہ بول سکتے تھے۔ بس حواس خمسہ کا بھاؤ بھرم باقی تھا۔ دو آدمیوں کے سہارے آئے جنازہ پڑھایا اور چلے گئے۔ میں نے اُسی وقت محسوس کیا تھا کہ ایک چلتی پھرتی قبر ہے ـــــ مہمان یک دو نفس۔

نام تو اس صُوبہ میں اُن کا اس وقت بھی گُونج رہا تھا جب ابھی اس پود کے نوجوان بساطِ ہستی پر بھی نہیں تھے۔ کوئی پینتالیس برس پبلک لائف میں بسر کیے، کئی حیثیوں کے جامع تھے۔ جماعت اہلحدیث مغربی پاکستان کے امیر تو تھے ہی، لیکن بہت سے گوشے ایسے تھے جہاں ان کا احترام یکساں جذبے کے ساتھ موجود تھا۔ قرآن کے معانی و مطالب سے کماحقہٗ آگاہ تھے۔ جتنی تفسیریں بھی کلام اللہ کی لکھی جا چکی ہیں انکے مندرجات سے نہ صرف بخوبی واقف تھے بلکہ ان کے معنوی اختلاف پر بھی تنقیدی نظر رکھتے تھے۔ اسی طرح حدیث و فقہ میں انہیں کمال حاصل تھا۔ اس ضمن میں ان کی تشریحات و تعبیرات کو بھی درجہ اسناد حاصل رہا۔ مرتے دم تک دین کو اپنا ظاہر و باطن بنائے رکھا۔ غرض یہی اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اسی کے لیے پیدا ہوئے، جوان ہوئے، بوڑھے ہو گئے، حتّٰی کہ اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ اصلاً وہ اُس وہابی تحریک کی گمشدہ تصویروں میں سے ایک تصویر تھے جنہیں انگریزوں نے دار پر کھینچا اور جن کی بدولت برصغیر میں ولولۂ حریت پیدا ہوا۔ معناً شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی جاں ہار فوج کے ایک سپاہی تھے۔

اس حقیقت سے شاید کم لوگ واقف ہوں گے۔ پنجاب کے علماء میں سے وہ پہلے عالمِ دین تھے جنہوں نے تحریک خلافت کے زمانہ میں انگریزی حکومت کے خلاف اپنا پرچم کھولا۔ پہلے شخص تھے جنہوں نے امرتسر میں انگریزی حکومت کے خلاف وعظ و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا اور یہ شرف تاریخ نے اُن کے سپرد کیا کہ وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو منبر و محراب کے جمود سے کھینچ کر جہاد و غزا کے میدان میں اُٹھا لائے۔ خود شاہ جی بھی

اعتراف فرماتے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ امرتسر کی دینی زندگی میں سیاسی ہلچل ڈالنے کا آغاز انہی کی بدولت ہوا۔ انہیں پنجاب میں علماء کی جنگ آزادی کا پہلا سالار کہا جا سکتا ہے۔

وفات کے وقت اُن کی عُمر ستر برس تھی۔ اخباری روایتوں کے مطابق ۱۸۹۶ء میں پیدا ہُوئے۔

آپ کے دادا مولانا عبداللہ غزنوی افغانستان سے جلاوطن ہو کر آئے تھے۔ ابتداءً دہلی رہے، پھر لاہور چلے آئے۔ آخر امرتسر کو اپنی مستقل قیام گاہ بنا لیا اور وہیں کے ہو کے رہ گئے۔ اُن کی نیک نفسی، رُوحانی بلندی اور جرأت و استغناء کے متعلق بے شمار واقعات زبان زدِ عام ہیں۔ دو روائیتیں علاّمہ اقبالؒ نے کی ہیں۔

دہلی میں تھے تو ۱۸۵۷ء کی ساڑھ ستی کا زمانہ تھا۔ گورا فوج نے چاروں طرف گولیوں سے ہلاکت کا طوفان اُٹھا رکھّا تھا۔ مسجدیں اور ان کے گرد و نواح کا علاقہ خصوصیت سے اس قتلِ عام کا مرکز تھا۔ ظہر کی نماز کا وقت ہُوا تو آپ مسجد کے حوض پر آ گئے۔ گولیاں چلتی رہیں، رائی برابر کھٹکا محسوس نہ کیا۔ اس معجز نما جرأت کو دیکھ کر مقتدیوں نے بھی حوصلہ کیا اور گولیوں کی بوچھاڑ میں وضو کر کے نماز میں لگ گئے۔

دوسرا واقعہ علاّمہ اقبالؒ نے ایک مکتوب میں لکھا ہے:

"حدیث کا سبق پڑھا رہے تھے کسی نے مطلع کیا — آپ کا بیٹا قتل ہو گیا ہے۔ آپ نے یہ اندوہناک خبر سُنی، ایک منٹ خاموش رہے پھر درس دینے لگے۔"

مولانا داؤد غزنویؒ اسی مومن و مجاہد اور عالم و اشجع انسان کے پوتے تھے۔ اس خاندان کو امرتسر میں جو امتیاز و شرف حاصل ہوا، اسی کا نتیجہ تھا کہ غزنویاں کے نام سے ایک محلہ منسوب ہو گیا۔ اسی محلہ میں مولانا داؤد غزنویؒ نے مدرسۂ غزنویہ جاری کیا۔ یہیں سے ہفت روزہ "توحید" نکالا۔ پھر اپنے چچا عبدالواحد غزنویؒ کی وفات کے بعد لاہور آ گئے اور یہاں جامع مسجد چینیاں والی میں خطابت کا منصب سنبھالا۔

تحریکِ خلافت میں سیاسی زندگی کی راہ پر نکلے اور اس وقت کلمۃ اللہ اور آوازۂ حق بلند کیا جب آزادی کا نام لینے پر زبانیں کاٹ لی جاتیں اور انقلاب زندہ باد کہنے کی پاداش میں کوڑے لگتے تھے۔ پہلی دفعہ صوبہ میں جمعیۃ العلماء کی بنیاد رکھی، خلافت کمیٹی بنائی۔ نتیجۃً تین سال با مشقت قید ہو گئی۔ دوسری دفعہ ۱۹۲۵ء میں پکڑے گئے۔ تیسری دفعہ ۱۹۲۷ء میں سائمن کمشن بائیکاٹ کی تحریک میں دھر لیے گئے۔

مجلس احرار قائم ہوئی تو اس کے بانیوں میں سے تھے۔ مدت العمر جنرل سیکرٹری رہے۔ تحریک کشمیر میں چوتھی دفعہ قید ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ میں گرفتار ہو گئے۔ اور "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک میں تقریباً تین سال جیل میں رہے۔ ۱۹۴۵ء میں صوبہ کانگرس کے صدر چنے گئے۔ الیکشن لڑا اور دھاریوال کی لیبر سیٹ سے منتخب ہو گئے۔ ۱۹۴۶ء کے وسط میں کانگرس سے الگ ہو کر مسلم لیگ میں چلے گئے۔ پاکستان بنا تو عوامی لیگ میں آگئے اور دوبارہ صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ غرض اس اعتبار سے وہ ایک سرگرم، مستعد، پُرجوش اور ہنگامہ پرور زندگی رکھتے تھے۔ قدرت نے ان میں ایک بہادر انسان کی بہت سی خوبیاں رکھ دی تھیں۔ وہ سر دے سکتے تھے، لیکن ضمیر کا سودا نہیں کر سکتے تھے۔ اس قسم کا کاروبار اُن کے خون ہی سے خارج تھا۔

روایتی علماء کی طرح نہ تو بہ بوست سے اُن کا خمیر اُٹھا تھا اور نہ وہ اپنے اوپر مسکنت و عاجزی طاری کیے رکھنے کے قائل تھے۔ وہ عاجزوں میں عاجز تھے اور متکبروں میں متکبر۔ وہ ایک سچے موحد تھے۔ اُنہوں نے شرک سے لے کر سرکار تک کا خوف اپنے دل سے نکال رکھا تھا۔

میرے ساتھ اُن کے مراسم ایک زمانہ سے تھے۔ ان تعلقات کی عمر پچیس سال ہو گی۔ وہ ایک راہنما بھی تھے، بزرگ بھی تھے۔ دوست بھی تھے۔ شفیق بھی تھے۔ معلّم بھی تھے،

ہم مذاق بھی تھے، ہمنوا و ہمخیال بھی تھے۔ غرض میرے لیے وہ بہت کچھ تھے۔ میں ان کے ساتھ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک لاہور سنٹرل جیل میں رہا۔ انسان جیسا بھی ہو اور جس حوصلہ اور ظرف کا ہو جیل کے دن ننگا کر دیتے ہیں۔ مولانا جیسے باہر تھے ویسے ہی اندر تھے۔ وضعدار، باغیرت، اشجع، نستعلیق۔ مجال ہے بول چال میں کوئی سا لفظ غیر ضروری ہو۔ یا ان کی گردن کسی عرض و التجا کے دروازہ پر جھکتی ہو۔ بڑی تمکنت لیکن اخلاق سے بات چیت کرتے۔ زبان و بیان پر انہیں قابو حاصل تھا۔ خطابت و تحریر دونوں میں ملکہ ——— جس سے ان کے خیالات و اظہار کا پیرایہ منجھ گیا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ سے انہیں جو تعلق خاطر تھا، یہ رشتہ بھی ہمارے رشتہ کی اساس تھا۔ وہ سیاسی اختلافات کو تعلقات کی راہ میں مزاحم نہ ہونے دیتے تھے جس سے ملتے سراپا محبت اور سراپا شفقت ہو کر ملتے۔ وضعداری کا یہ حال تھا کہ میرے جوان بھائی اقبالؔ کا انتقال ہو گیا تو تین دن تک بالالتزام آتے رہے۔

"چٹان" بڑے شوق سے پڑھتے۔ ہمیشہ خوبیوں پر نگاہ رہتی۔ کبھی عیب بینی یا عیب جوئی نہ کرتے بلکہ اس کو بدبینی پر محمول فرماتے۔

ایک دفعہ "چٹان" سے کسی عام مسئلہ پر لغزش ہو گئی تو فون پر ٹوکا، ورنہ سینکڑوں دفعہ ان مشفقانہ الفاظ میں اظہار خوشنودی فرمایا کہ ان کے بزرگانہ التفات کی وسعتوں پر حیرت ہوتی کہ ہم جیسے بے مایہ لوگوں کے لیے بھی ان کے دل میں جگہ ہے۔ جن دنوں "چٹان" نے قادیانیوں کا تعاقب کیا۔ انہی دنوں فون پر فرمایا کہ تم پر اللہ کی رحمت ہو، ہم لوگوں سے بازی لے گئے۔ پھر جانے کیا کچھ نہیں کہا، کیسے کیسے کلماتِ تحسین زبان پر لاتے رہے اور میں یہی کہتا رہا، مولانا! یہ سب آپ ایسے بزرگانِ سلف کی نگاہِ کرم کا فیض ہے۔ وہ فرماتے۔ یہ اللہ کی دین ہے ہم لوگوں کی زبان کو قفل لگا ہوا تھا تم نے ہمیں جگا دیا ہے۔ ایک ہی برس تو ہوا ہے، لاہور میں اہلحدیث کانفرنس کا سالانہ اجتماع تھا۔ آخری

اجلاس کے وہ صدر تھے اور میں آخری مقرر۔ ایک لاکھ سے زائد مجمع۔ مجھ ایسا گنہگار ڈاڑھی مونچھیں صاف، کہاں کہاں سے اللہ والے اور دین والے نہیں آئے تھے۔ مَیں بول رہا تھا اور مولانا اشکبار تھے۔ اُن کی نُورانی ڈاڑھی پر آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے بہہ رہے تھے اور کس کس ادا سے وہ دُعائیں دے رہے تھے۔

غور کرو، رات کہاں سے کہاں آگئی، کتنی گہری ہوگئی۔ دیکھتی آنکھوں اُن لوگوں کا قافلہ ہی رُوپوش ہوگیا، جو ہمارے قافلہ کو آزادی کی منزل پر لائے تھے۔ اُنہوں نے کتنی جدوجہد کی، کتنی مصیبتیں اُٹھائیں، کتنے غم سہے، کتنے صدمے برداشت کیے۔ رات اُن کی، دن کسی کا۔ ہمارے ہاں اُردو نثر میں پنجابی شعر درج کرنے کی عادت نہیں کیونکہ قلعۂ معلّٰی کی زبان پر آنچ آتی ہے، ورنہ برّدا کا یہ مصرع کتنا حسبِ حال تھا: ع

برّدا سیاں درختاں دی کرے راکھی میوہ پکّے تے کھان نصیب والے

(برّدا سینکڑوں درختوں کی آبیاری کرتا ہے مگر جب پھل لگتا ہے تو دوسرے کھا جاتے ہیں (نصیب والے) یعنی محنت اس کی اور حاصلِ محنت دُوسروں کا ہوتا ہے)

مولانا داؤد غزنویؒ

سیّد رئیس احمد جعفری

مولانا داؤد غزنوی کو دیکھ کر بے ساختہ اللہ جمیل ویحب الجمال کے الفاظ زبان پر آجاتے تھے، وہ خوب صورت اور خوب سیرت بھی تھے۔ اُن کی شخصیت میں جمال تھا۔ اُن کے نطق میں جمال تھا، ان کے کردار میں جمال تھا۔

مولانا کا علم وفضل ایک مستقل عنوان کا طالب ہے۔ آپ برِّ صغیر کے ایسے دودمانِ عالی سے تعلّق رکھتے تھے، جس کے علمی و روحانی فیوض سے پاک و ہند کے لوگ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ مولانا کو جو علمی اور روحانی میراث ملی تھی، وہ اس کے سزاوار بھی تھے اور امین بھی۔

مولانا نے اگر سیاست کے ہنگاموں سے دامن نہ اُلجھایا ہوتا یا سیاست نے مولانا پر دھاوا نہ بولا ہوتا اور ان کی سرگرمیاں صرف علمی حدود تک محدود رہتیں تو بلاشبہ ان کے فیوض و کمالات لازوال صُورت اختیار کر لیتے۔ ہمہ وقتی سیاسی اور جماعتی مصروفیتوں کے باوجود علمی خدمات سے وہ کبھی غافل نہیں ہُوئے، ان کے خطبات جمعہ اور فتاوٰے جو مختلف اوقات میں میری نظر سے گزرے، اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ ان کا مطالعہ کس درجہ عمیق تھا، آپ معاملات و مسائل پر کس درجہ گہری نظر رکھتے تھے اور جو استفتاء ان کے سامنے آتا تھا، اس کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے اپنے جواب میں کیسے کیسے علمی نکات پیدا کرتے تھے۔

مولانا کی تعمیری صلاحیتیں بھی کچھ کم باعثِ رشک نہ تھیں۔ ۱۹۴۷ء کے عالم آشوب

عہد میں انہیں اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ اور وطن کے ساتھ بہت سی نایاب چیزوں سے بھی دستبردار ہونا پڑا۔ لیکن ان کی عزیمت و استقامت میں کوئی فرق نہیں آیا، انہوں نے خطبات کا سلسلہ بھی جاری رکھا، جماعتی سرگرمیوں میں بھی قائدانہ طور پر حصّہ لیتے رہے۔ ساتھ ہی ساتھ شیش محل روڈ پر انہوں نے ایک بلند پایہ عربی درسگاہ پوری شان کے ساتھ پھر قائم کردی۔

مولانا کا ذاتی کُتب خانہ متعدد اعتبارات سے گنجینۂ گوہر کہلانے کا مستحق تھا۔ ہر علم و فن سے متعلّق بہترین کتابوں کا ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا اور جو کچھ تھا وہ اس پر قانع نہیں تھے، ہر ماہ اس میں گراں بہا اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ مصر اور بیروت وغیرہ کی تازہ ترین مطبوعات گراں قیمت پر وہ خریدتے تھے اور بڑے ذوق و شوق سے ان کا مطالعہ کرتے تھے، مَیں نہیں کہہ سکتا اپنے نایاب کُتب خانے سے عاریتہً وہ دُوسروں کو کتابیں دیتے تھے یا نہیں؟ لیکن دو تین مرتبہ مجھے بعض مصری مطبوعات کی ضرورت پیش آئی اور مولانا نے ازراہِ کرم فوراً مطلوبہ کتاب مجھے مرحمت فرمادی۔

مولانا سے میری ملاقات کم تھی۔ صرف چند مرتبہ شرفِ نیاز حاصل ہوا لیکن جب کبھی ملاقات ہُوئی اُن کے حُسنِ اخلاق اور لطف و کرم کا نہ مٹنے والا نقش لے کر اُٹھا۔ آخری مرتبہ اس وقت ملاقات ہُوئی جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہو چکے تھے اور نچلی منزل میں قیام کا انتظام کر لیا تھا۔ مولانا محمد حنیف کے ساتھ ایک روز رات کو عیادت کے لیے مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ میں خود بھی دل کا مریض ہوں، لیکن مولانا کے پاس جب تک بیٹھا رہا، وہ اس دلچسپی اور بے پروائی کے ساتھ باتیں کرتے رہے کہ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ مولانا دل کے مریض ہیں نہ مَیں! ——— بھلا دل کے مریضوں میں یہ اُمنگ اور ترنگ کہاں ہوتی ہے؟ مَیں گیا اس نیّت سے تھا کہ اپنے تجارب کی روشنی میں مولانا کو پرہیز وغیرہ کے سلسلے میں کچھ مشورے دوں گا،

لیکن جب واپس آیا، تو اپنے دیرینہ تجربات کو محلِ نظر سمجھ کر ان پر نظرِ ثانی کی ضرورت محسوس کرنے لگا۔

مولانا نے جس جماعت کو بھی شرفِ قبولیت بخشا، پورے خلوص کے ساتھ اس کی خدمت کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مکتبِ فکر میں وہ عزّت اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی دیانتِ فکر ہر طرح کے اختلافات کے باوجود اصولِ موضوعہ کی طرح اپنی جگہ مسلّم تھی، اس زمانے میں کسی شخص کا یہ مقامِ رفیع حاصل کر لینا بہت بڑی بات ہے اور یہ بات اس شخص میں پیدا ہو سکتی ہے جو واقعی بڑا ہو اور کوئی شبہ نہیں آپ ہر اعتبار سے عظیم و جلیل تھے۔

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ شمع تھی محفل میں پروانے کی خاک

حضرت مولانا

سیّد محمّد داؤد غزنویؒ

میاں محمد شفیع (م۔ش)

مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کے نامِ نامی سے میں اس صدی کے تیسرے عشرے کے اواخر میں شناسا ہوا، جب کہ میں نے اپنے ایک استاد چودھری سردار خاں کے نام آنے والے ایک ہفتہ وار اخبار "التوحید" کا مطالعہ شروع کیا۔ یہ اخبار امرتسر سے حضرت مولانا کی زیرِ ادارت شائع ہوتا تھا۔ مَیں اُن دنوں گورنمنٹ ہائی سکول راموں ضلع جالندھر میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس کے بعد مجھے حضرت مولانا کو احرار، کانگرس اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارموں سے سرگرمِ عمل دیکھنے کے مواقع میسّر آتے رہے۔ مَیں نے ان کی پنجاب اسمبلی میں معرکہ آراء تقریروں کی "سول اینڈ ملٹری گزٹ" "ڈان" اور "نوائے وقت" میں رپورٹنگ بھی کی۔ اسمبلی میں اُن کے آمنے سامنے بیٹھنے کا لُطف بھی اُٹھایا۔ آخرِ کار ۱۹۵۳ء میں مَیں ان کے شانہ بشانہ پنجاب اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے بنچوں پر بیٹھنے کے اعزاز سے مفتخر بھی ہوا۔ حضرت مولانا میرے بنچ فیلو تھے۔ ۱۹۶۲ء کے دورِ ایوبی کے پہلے انتخابات کے موقع پر اُنھوں نے اوکاڑہ کی اہلحدیث تنظیم کو میری حمایت پر آمادہ کرنے کے لیے انجمن کے ایک عہدہ دار جناب مولانا معین الدین لکھوی کو اپنے دستخطوں سے ایک رقعہ لکھا جس میں حضرت مولانا نے فرمایا:

"میاں محمد شفیع اسمبلی کے شیر ہیں، ان کی مدد سے گریز نہ کیا جائے۔"

یہ مولانا کی کریم النفسی تھی کہ وہ مجھ سے ایک نیاز مند کی اس طرح تالیفِ قلب فرماتے تھے۔

حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ ایک انتہائی خوبصورت، رعنا اور متوازن انسان تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جب وہ پنجاب میں کانگرس کے صدر منتخب ہُوئے تو ہندوستان ٹائمز کے نامہ نگار متعینّہ لاہور (مسٹر آنند سروپ) نے مولانا کے حسن و جمال پر نصف کالم کے برابر ڈسپیچ لکھا۔ مولانا علم و فضل کے سمندر تھے۔ وہ ایک عظیم مقرر تھے۔ پارلیمانی آداب سے خوب آگاہ تھے۔ انہیں اللہ تعالےٰ نے حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت سے بھی بے پناہ طور پر نوازا تھا۔ وضعداری اور شرافت کا یہ عالم تھا کہ عبداللہ ملک کی والدہ کا انتقال ہوا تو دل کے عارضے میں مُبتلا ہونے کے باوجود ایک دُور دراز قبرستان میں نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے تشریف لائے۔ انہیں بسترِ علالت پر یہ بتایا گیا تھا کہ مرحومہ نے وصیّت کی تھی کہ ان کی نمازِ جنازہ حضرت مولانا پڑھائیں۔ میں اہل سُنّت والجماعت میں بریلوی مکتبِ فکر کا پیرو ہوں اور اس لحاظ سے دیوبندی مکتبِ فکر کا کسی حد تک نقّاد رہا ہوں۔ حضرت مولانا نے مجھے انتہائی شفقت اور محبّت سے یہ سمجھانے کی کوشش فرمائی کہ دیوبندی بھی اُسی طرح مسلکِ امام اُبوحنیفہؒ کے پیرو ہیں جس طرح بریلوی ان کے مقلّد ہیں۔

ایک مرتبہ میرے اخبار "اقدام" میں بریلوی، وہابی کے موضوع پر "مفکر" (حضرت مولوی محمد ابراہیم علی چشتی) اور "الاعتصام" کے ایڈیٹر کے درمیان بحث چل نکلی، تو ایک دن حضرت مولانا نے مجھے بلا کر نصیحت فرمائی کہ اس بحث کو بند کر دیا جائے، اس لیے کہ آزاد مملکتِ پاکستان میں مسلمانوں میں تفرقہ بازی سے نئی مملکت کے استحکام میں رخنہ اندازی ہوگی۔

حضرت مولانا ایک عظیم انٹی امپیریلسٹ تھے۔ اُنہوں نے یہ اچھی طرح سے محسوس فرما لیا تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کی سب سے بڑی دُشمن برطانوی امپریلزم ہے جس نے ان کے دین کو SUBVERT کرنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور جس نے ملائشیا سے لے کر مغربِ اقصیٰ تک مسلمانوں کی سیاسی آزادیاں سلب کر رکھی ہیں، اس لیے مسلمانوں کو سیاسی آزادی سے بہرہ ور کرنے اور اسلام کو ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مؤثر، بھرپور اور انقلابی کردار ادا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انگریزوں کو سرزمینِ ہند سے باہر نکال دیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایک مردِ مجاہد

کی سی آن بان کے ساتھ برطانوی امپیریلزم کے سنگین حصار کے خلاف معرکہ میں حصّہ لیا اور اس راستے کی صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہُوئے قید و بند کی آزمائشوں میں ثابت قدم رہے۔ اُنھوں نے "احرار" اور کانگرس کے پلیٹ فارم کو اپنی انٹی امپیریلسٹ (سامراج دُشمن) سرگرمیوں کا مرکز بنایا، لیکن جب ان پر یہ واضح ہوگیا کہ انٹی امپیریلزم کی جنگ ختم ہونے کو آرہی ہے اور اب نئے ہندوستان میں مسلمانوں اور اسلام کے حفظ و بقا کے لیے جدوجہد کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز سے انگریزی سامراج کے خلاف جہاد میں حصّہ لینا ضروری تھا تو اُنھوں نے ایک مردِ مسلمان کی سی بصیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کیا۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلم لیگ کا پلیٹ فارم مسلمانوں کی انقلابی سیاسی جدوجہد کا نشان بن چکا تھا۔ مسلم لیگ اپنے قائد کی زیرِ قیادت برصغیر میں مسلمانوں کے لیے حقِ خود ارادیت کے لیے جنگ جاری کر چکی تھی۔ مولانا نے اس جہاد کی اہمیت اور نوعیت کا احساس فرماتے ہی اپنی ان بیش بہا قربانیوں کے ریکارڈ کو جو وہ احرار اور کانگریس کے پلیٹ فارم سے استخلاصِ وطن کے لیے تعمیر کر چکے تھے، فراموش کرتے ہُوئے قائدِ اعظمؒ کے شانہ بشانہ تحریکِ پاکستان کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے بھرپُور حصّہ لینے کا اعلان کیا۔ ان کے اس اعلان سے مسلم لیگ کو بے حد تقویت حاصل ہوئی۔

حضرت مولاناؒ کی مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد مَیں نے لاہور میں ان کی پہلی میٹنگ میں ان کی تقریر "ڈان" دہلی میں رپورٹ کی تھی۔ اُنھوں نے اس موقع پر فرمایا کہ ہم نے کانگرس کے پلیٹ فارم سے اس لیے قربانیاں نہیں دی تھیں کہ آج اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہم مذہبوں کو غیر مسلموں کے ہاتھوں اتنی بے دردی سے ذبح ہوتے دیکھیں اور انگریز کے جانے کے بعد ابد تک کے لیے ہندوؤں کی غلامی میں چلے جائیں۔ اُنھوں نے مسلمانوں کو اپیل کی کہ وہ برِّصغیر میں اسلام کی سربلندی کے لیے آپس میں مُتّحد ہوں۔

جب ۱۹۴۷ء میں خضر وزارت کے مستعفی ہونے کے بعد پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات کی

آگ بھڑک اُٹھی تو حضرت مولانا نے پنجاب کے مختلف اضلاع کا وسیع دورہ کر کے انسانی خون بہائے جانے کے خلاف بہت دردمندی سے دن رات کام کیا۔

مجھے حضرت مولانا کو قریب ترین زاویہ سے دیکھنے کا موقع اس وقت ملا جب پنجاب میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد میاں مُمتاز دولتانہ کی وزارت کو ختم کر کے ملک فیروز خاں نون کو اقتدار سونپا گیا۔ اس سے پہلے میں حزبِ اقتدار کے بنچوں پر اور مولانا حزبِ اختلاف کے بنچوں پر آمنے سامنے بیٹھا کرتے تھے۔ دولتانہ کے رخصت ہوتے ہی اپوزیشن کے وہ تمام اراکین جن کا تعلق جناح مسلم لیگ یعنی ممدوٹ گروپ سے تھا، راتوں رات حزبِ اختلاف سے حزبِ اقتدار کے قالب میں ڈھل گئے اور سرکاری بنچوں پر جا بیٹھے، لیکن جن لوگوں نے اپوزیشن بنچوں پر میاں عبدالباری مرحوم کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا، ان میں حضرت مولانا سیّد محمد داؤد غزنویؒ بھی شامل تھے۔ حضرت مولانا ایسے وضع دار انسان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ ایک غیر جمہوری عمل کے تحت وزارت میں تبدیلی سے وہ بھی اپنے سیاسی موقف میں مصلحت کے زیرِ اثر تبدیلی کر لیتے۔ ادھر مَیں نے حزبِ اقتدار کے بنچوں کو چھوڑ کر حزبِ اختلاف میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ مَیں ایک غیر جمہوری عمل کے ذریعے وزارت میں تبدیلی کے خلاف ہونے کے علاوہ یونی نسٹوں کے ہاتھ پر سیاسی بیعت کرنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں تھا۔ چنانچہ جب میاں ممتاز دولتانہ اور ان کے ڈیڑھ دو درجن ساتھی مسلم لیگ سے نام نہاد وفاشعاری کے ڈھکوسلے کی بنا پر بدستور حزبِ اقتدار کی بنچوں پر بیٹھے رہے، مَیں حضرت مولانا کے بنچ پر ان کے ساتھ والی سیٹ پر آ بیٹھا۔ حالانکہ میں اپوزیشن کے بنچوں پر نووارد تھا لیکن اپوزیشن نے مجھے اپنا سیکرٹری جنرل چُن لیا۔ میاں عبدالباری اس ننھّی منّھی اپوزیشن کے قائد منتخب ہُوئے۔ پارٹی میں کُل گیارہ اراکین تھے جن میں دو غیر مسلم مسٹر سی ای گبن اور مسٹر سنگھا بھی شامل تھے۔ اس ننھّی مُنّھی اپوزیشن نے اکثریتی پارٹی کو بار ہا ناکوں چنے چبوائے۔ اس ڈیڑھ دو سال کے عرصے میں مَیں نے حضرت مولانا کو بہت قریب سے دیکھا اور مَیں انکے اندازِ فکر اور طریقۂ عمل سے بے حد متاثر ہوا۔ وہ پارٹی کی میٹنگ میں ہمیشہ مقررہ وقت

پر تشریف لاتے اور اگر کسی وجہ سے تشریف نہ لا سکتے، تو اس کے متعلق پیشگی اطلاع دیتے۔ جب پارٹی کی میٹنگ میں شرکت کرتے تو بات ہمیشہ مدلّل اور سلیقہ سے کرتے، ہمیشہ تعمیری رُخ اختیار کرتے۔ دین کے معاملات میں کبھی نفاق برداشت نہ کرتے۔ عوامی مسائل پر ہمیشہ محروم طبقوں کی ترجمانی فرماتے۔ اسمبلی کی کارروائی میں بے حد مستعدی دکھاتے اور جب بھی کسی موضوع پر زبان کھولتے تو ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ ختمِ نبوّت کی تحریک میں عوام پر کیے گئے ظلموں پر بیحد ملول اور برافروختہ تھے۔ اُنہوں نے اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ جن لوگوں کو فسادات کے دوران نقصان اُٹھانا پڑا تھا، انہیں حکومت کی طرف سے معقول معاوضہ دلایا جائے۔

آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب پنجاب اسمبلی کے اراکین کو آئین ساز اسمبلی کے اراکین منتخب کرنے کے لیے کہا گیا، تو مولانا کی خدمت میں بڑے بڑے سرمایہ دار اُمیدوار کورے چیک لے کر حاضر ہوتے رہے، لیکن مولانا نے ان کی بات سُننا بھی گوارا نہ کی۔ اُنہوں نے اپنے پارلیمانی لیڈر میاں عبدالباری کو بھی نہایت صفائی سے بتایا کہ ان کا ووٹ مجاہدِ ملّت مولانا عبدالستار خاں نیازی کے لیے وقف ہے۔ چنانچہ مولانا اپنی سواری کا انتظام کر کے اسمبلی چیمبر تشریف لائے اور اپنے ووٹ کا FIRST PREFERENCE مولانا نیازی کے حق میں دیا اور دوسرا FREFERENCE (ترجیح) میاں عبدالباری کے حق میں۔ اس کے بعد مجھے گلے لگانے کے بعد اپنے دفتر واپس تشریف لے گئے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اپنے انتہائی رحم سے حضرت مولانا کی مغفرت فرمائیں اور ان کے روحانی مقامات بلند کریں۔

آمین اللّٰھمّ آمین

مولانا داؤد غزنویؒ

چند یادیں

ڈاکٹر اسرار احمد

راقم الحروف اگرچہ ۴۸ء سے ۵۴ء تک یعنی مسلسل سات سال بسلسلۂ تعلیم لاہور میں مقیم رہا، لیکن ایک مخصوص نقطۂ نظر کے شدید غلبے کے سبب سے صورت حال کچھ ایسی رہی کہ ایک خاص حلقے سے باہر کے کسی صاحبِ فضل و کمال سے ملاقات کی خواہش کبھی پیدا نہ ہو سکی۔ آج جب یہ خیال آتا ہے کہ اسی لاہور میں مولانا مفتی محمد حسن صاحب، مولانا احمد علی صاحب اور مولانا داؤد غزنوی علیہم الرحمہ جیسی شخصیتیں موجود تھیں جن کی پُر تاثیر صحبت سے استفادہ کیا جا سکتا تھا، لیکن نہ کیا گیا تو شدید محرومی کا احساس ہوتا ہے اور اس میں مزید تلخی اس مشاہدے سے پیدا ہوتی ہے کہ غالبؔ کے اس قول کے مطابق کہ : ع

"دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں!"

آج کا لاہور ان تینوں بزرگوں سے محروم ہو جانے کی بناء پر واقعتہً ویران نظر آتا ہے اور اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ صورت کب پیدا ہو کہ ع :

"کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد!"

تعلیم سے فراغت کے بعد جب منٹگمری (حال ساہیوال) میں اقامت پذیر ہوا تو کچھ ہی عرصے بعد بعض وجوہات کی بنا پر دل و دماغ پر اس مخصوص نقطۂ نظر کی گرفت ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی اور نگاہیں اس خاص حلقے سے باہر کے لوگوں کی جانب بھی متوجہ ہوئیں اتفاق

سے ان ہی دنوں منٹگمری میں ایک بڑی اہلحدیث کانفرنس مولانا عبدالجلیل صاحب کی وسیع وعریض مسجد میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں پہلی بار مولانا داؤد غزنویؒ کو دیکھنے کا موقع ملا اور نہ معلوم کیوں محض رویت ہی سے دل ان کی جانب کھنچتا سا محسوس ہوا۔ مولانا نے اس موقع پر جمعہ کا خطبہ ارشاد فرمایا۔ میرے دل نے اس خطبے سے گہرا تاثر قبول کیا اور میرے دماغ پر اس کا ایسا پختہ نقش ثبت ہوا کہ آج کم و بیش گیارہ سال گزر جانے کے بعد بھی کیفیت یہ ہے کہ جیسے میں مولانا کو خطبہ دیتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

میرے لیے اس خطبے کی سب سے زیادہ مؤثر چیز وہ بلا کا سوز اور انتہا کا درد تھا، جو اس کے ایک ایک لفظ میں رچا اور بسا ہوا تھا۔ تقریر کے دوران مولانا کی آنکھوں میں نمی تو از ابتدا تا انتہا رہی، لیکن دو ایک بار تو فرطِ رقّت سے جذبات بالکل ہی بے قابو ہو گئے۔ خصوصاً مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان صحابیؓ کا تذکرہ کرتے ہوئے جنہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ "مَیں جنّت میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں" اور جن کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا تھا کہ اطمینان رکھو "اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ"، مولانا نے یہ کہہ کر بے اختیار زار و قطار رونا شروع کر دیا تھا کہ "ہائے افسوس انہیں (صحابہؓ کو) کن باتوں کی خواہش و تمنّا تھی اور ہم کن خواہشات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں!!"

راقم الحروف کا اس سے پہلے کا عام مشاہدہ چونکہ یہ تھا کہ عام واعظین و ناصحین عموماً اور اہلِ حدیث علما خصوصاً سوز و درد کی دولت سے تہی دامن ہوتے ہیں اور اس کے برعکس ان کی تقریروں پر غلظت اور خشونت کا غلبہ ہوتا ہے لہٰذا میرے لیے یہ ایک بالکل خلاف توقع بات تھی، بعد میں جُوں جُوں روابط استوار ہوئے اور مولانا کو مزید قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، معلوم ہوا کہ رقّت اور سوز مولانا کی طبیعت کا مستقل جزو بن گئے تھے اور تواضع و انکسار کا ہر وقت شدید غلبہ رہتا تھا اور اس کے باوجود کہ اپنے مسلک کے معاملے میں ادنیٰ درجے میں بھی مداہنت گوارا نہ تھی، لیکن قلب انتہائی فراخ تھا اور خیر اور خوبی جہاں اور جتنی نظر آتی تھی

کھلے دل کے ساتھ اس کا اعتراف فرماتے تھے (وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی) اور اس معاملے میں چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز ان کی راہ میں حائل نہ ہوتی تھی۔

ایک انتہائی تلخ احساس جو مولانا پر ہر وقت طاری رہتا تھا اور جس کا بار بار اظہار ہوتا تھا، وہ یہ تھا کہ زندگی کا بیشتر حصّہ ایسی سرگرمیوں کی نذر ہو گیا جن میں 'خارج' کی مصروفیات کے غلبے نے 'باطن' کی جانب اتنا متوجّہ نہ ہونے دیا جتنا ہونا چاہیے تھا اور اپنے احساس کے مطابق اس میدان میں مولانا اپنے عظیم اسلاف کی روایات کو برقرار نہ رکھ سکے۔ اس خیال کا اظہار مولانا اکثر انتہائی حسرت کے ساتھ کیا کرتے تھے اور بسا اوقات اس تذکرے میں ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے شروع ہو جاتے تھے۔ خاص طور پر مسجد نبویؐ میں مَیں نے مولانا پر اس حسرت کی وجہ سے جو رقّت طاری دیکھی، وہ میں کسی طرح نہیں بھول سکتا۔

منٹگمری کے خطبۂ جمعہ میں ایک انتہائی اہم بات جو مولانا نے فرمائی (اور جس کی جانب تمام اہلِ حدیث حضرات کو خصوصی طور پر متوجہ ہونا چاہیے!) وہ یہ تھی کہ "اگرچہ ہم ائمہ اربعہ سے اختلاف کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہم ان کی عزّت نہیں کرتے یا ان کی قدر و منزلت سے آگاہ نہیں ہیں۔ خدا شاہد ہے کہ ہمارے دِلوں میں ان کا اسی قدر احترام موجود ہے جس قدر ان کے مقلدّین کے دلوں میں ہے، لیکن ہم ان سے اختلاف کرنے پر مجبور اس لیے ہو جاتے ہیں کہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی قدر و منزلت ہمارے دلوں میں ان کے اقوال سے بہرحال زیادہ ہے۔"

اس سلسلے میں مولانا نے سامعین (جو اکثر و بیشتر اہل حدیث تھے) کو سخت الفاظ میں تنبیہ کی کہ دُوسرے لوگوں کی یہ شکایت کہ اہل حدیث حضرات ائمہ اربعہ کی توہین کرتے ہیں بلاوجہ نہیں ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ ہمارے حلقہ میں عوام اس گمراہی میں مُبتلا ہو رہے ہیں اور ائمہ اربعہ کے اقوال کا تذکرہ حقارت کے ساتھ بھی کر جاتے ہیں۔ یہ رجحان سخت گمراہ کن اور

خطرناک ہے اور ہمیں سختی کے ساتھ اس کو روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

اس ضمن میں مولانا نے فرمایا کہ "حضرت محی الدین ابن عربیؒ کے نظریۂ وحدتِ وجود پر سب سے سخت تنقید حضرت مجدّد الف ثانیؒ نے فرمائی اور شدید ترین اختلاف کا اظہار کیا، لیکن اس کے باوجود ان کا ادب و احترام جس درجہ اُنہوں نے ملحوظ رکھّا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مکتوبات میں ایک مقام پر آپ تحریر فرماتے ہیں کہ 'من زلّہ بردارِ خوانِ ایشانم، لکن چہ کنم؟ معاملۂ صفاتِ باری تعالیٰ است'۔ اسی طرح ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم ان ائمہ دین کے دسترخوان کے جھوٹے ٹکڑے کھانے والے ہیں، لیکن کیا کریں، جب معاملہ حدیثِ رسولؐ کا آ جاتا ہے تو ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان کے قول کو چھوڑ کر حدیثِ رسولؐ پر عمل کریں۔"

راقم الحروف کے لیے اوّل تو یہ فراخئ قلب ہی بہت غیر متوقع تھی کہ جمعیت اہلِ حدیث کے صدر اپنی جمعیت کے لوگوں کو ائمہ اربعہ کی تعظیم و تکریم کی اس درجہ شدّت کے ساتھ تلقین کریں، لیکن شیخ محی الدّین ابن عربیؒ کے ساتھ حضرت کا تعظیم آمیز کلمہ تو بہت ہی حیرانی کا موجب ہوا۔ چنانچہ جمعہ کے بعد جب ایک جگہ کھانے پر مُلاقات ہُوئی تو مجھ سے نہ رہا گیا اور مَیں نے عرض کر ہی دیا کہ 'حضرت! آپ نے ابن عربیؒ کا تذکرہ تعظیم و تکریم کے ساتھ کیا حالانکہ امام ابنِ تیمیہؒ کی رائے ان کے بارے میں بہت سخت ہے'۔ اس کا جو جواب مولانا مرحوم نے دیا وہ اس قابل ہے کہ سنہری حروف سے لکھا جائے اور دین کے تمام خادم اس کو حرزِ جان بنا لیں۔ میری بات سن کر مولانا نے قدرے توقف کے بعد فرمایا:

"ڈاکٹر صاحب! ابنِ تیمیہؒ اور ابنِ عربیؒ دونوں ہی ہمارے بزرگ ہیں۔ اپنے آپس کے اختلاف کو وہ جانیں! ہم خورد ہیں اور خورد رہنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں!" مولانا نے یہ الفاظ اتنے شدید تاثر کے ساتھ فرمائے کہ ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے! واقعہ یہ ہے کہ میں عرض نہیں کر سکتا کہ مولانا کے اس منکسرانہ قول سے میرے دل میں ان کی عزّت میں ایک دم کس قدر اضافہ ہوا اور ان کا احترام کِتنا بڑھ گیا!!

کاش کہ ہماری تمام دینی جماعتوں کے رہنما اور فرقوں کے پیشوا فراخیٔ قلب کی اس نعمت سے بہرہ ور ہو جائیں اور "اعجاب المرء بنفسہ" اور "اعجابُ کُلِّ ذی رایٍ برایہ" کے مہلک امراض سے شفایاب ہو کر تواضع اور انکسار کو اپنا شعار بنالیں اور اپنے اپنے مسلک پر سختی سے عمل پیرا ہونے کے باوجود دوسروں کے اکرام و تکریم کی اس روش کو اختیار کرلیں تو تلخیاں ختم ہو کر رہ جائیں اور صرف وہ اختلاف باقی رہ جائے جسے حضور نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمّت کے حق میں رحمت قرار دیا ہے!!

ایک مختصر سے خطبے اور ایک چھوٹی سی ملاقات سے دل و دماغ نے اس قدر اثر لیا کہ اس کے بعد جب بھی کبھی لاہور آنا ہوا مولانا کی خدمت میں حاضری ضرور دی۔ خود مولانا مرحوم کو بھی راقم الحروف سے ایک خصوصی تعلقِ خاطر قائم ہو گیا تھا اور وہ مجھ پر شفقت فرمانے لگے تھے ——؟

چنانچہ ایک بار جب میں نے مولانا سے مکتوبات حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی جلد اوّل عاریۃً مانگی تو مولانا نے فرمایا: "ڈاکٹر صاحب! اس کتاب کو میں نے آج تک کبھی اپنے سے جُدا نہ کیا اور میں کسی دُوسرے شخص کو یہ کتاب عاریۃً نہ دیتا، لیکن آپ سے ایک خصوصی محبت ہو گئی ہے جس کی بناء پر انکار نہیں کر سکتا۔" چنانچہ ایک ماہ کے لیے میں وہ نسخہ منٹگمری لے گیا۔ پھر جب میں اسے واپس لایا تو اس پر نئی چرمی جلد بندھوا لایا جسے دیکھ کر مولانا بہت خوش ہُوئے اور فرمانے لگے: "میرا پہلے ہی سے یہ اندازہ تھا کہ آپ اس کتاب کے واقعی قدردان ہیں۔"

سنہ ۶۲ء میں والدین کے ہمراہ حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی تو مکّہ مکرّمہ پہنچنے پر معلوم ہُوا کہ مولانا بھی رابطۂ عالمِ اسلامی کے تاسیسی اجلاس میں شرکت کی دعوت پر تشریف لائے ہُوئے ہیں، چنانچہ فوراً فندقِ مصر حاضر ہو کر ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ مولانا بھی مجھے

وہاں دیکھ کر بہت خوش ہُوئے۔ دُوسرے ہی روز رابطہ کا پہلا اجلاس تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ تم اس میں میرے ساتھ میرے سیکرٹری کی حیثیت سے شرکت کرو۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا اور میں رابطہ کی دو نشستوں میں شریک ہُوا جن میں سے ایک میں ملک سعود ابن عبد العزیز نے خطاب فرمایا۔ اس اجلاس کی روداد ایک علیحدہ موضوع ہے۔ یہاں صرف اس قدر ذکر مناسب ہے کہ تقریر سے قبل شاہ سعود سے مختلف شرکاء کا تعارف کرایا گیا تو میں نے دیکھا کہ مولانا سے ملتے ہُوئے شاہ کے چہرے پر عقیدت و احترام کی ایک جھلک نمودار ہوئی جو خاندانِ غزنویہ کے ساتھ آلِ سعود کے قدیم قلبی تعلق کی آئینہ دار تھی۔

منیٰ میں قیام کے دوران بھی متعدد بار مولانا سے مُلاقات کا موقع ملا۔ مولانا کی بڑی صاحبزادی جو اس مُبارک سفر میں ساتھ تھیں، منیٰ میں علیل ہو گئیں میری تشخیص کے مطابق ٹائیفائیڈ کا حملہ تھا، چنانچہ علاج بھی میں نے ہی کیا اور سرکاری ہسپتال سے ادویہ بھی میں ہی حاصل کرتا رہا۔ مولانا اس سلسلے میں ایک ایک قدم پر ازراہِ شفقت تشکّر و امتنان کا اظہار فرماتے رہے۔ ادھر میں ان کی اس خدمت کی توفیق پانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہا۔ عرفات سے واپسی پر مولانا کی اپنی طبیعت بھی ناساز ہو گئی تھی، چنانچہ ان کی جانب سے قربانی بھی مَیں نے ہی کی۔

قیامِ منیٰ کا ایک واقعہ جو اگرچہ براہِ راست مولانا کی ذات سے متعلق تو نہیں ہے، تاہم بہت سبق آموز ہے۔ عرض کرتا ہوں :

میرے ایک عزیز جو ایک طویل عرصہ سے سعودی عرب ہی میں مقیم ہیں اور مسلکاً اہلحدیث ہیں، مولانا کی جانب سے قدرے سوءِ ظن میں مُبتلا تھے اور حافظ عبداللہ صاحب روپڑی مرحوم سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ مَیں نے مکّہ مکرّمہ کے قیام کے دوران ان سے متعدد بار کہا کہ چلیئے میں آپ کو مولانا سے ملواؤں لیکن وہ ٹال جاتے رہے۔ منیٰ میں ان سے اتفاقاً ملاقات ہُوئی تو انہوں نے فرمایا کہ چلو قریب ہی شیخ المعلمین کی منزل میں حافظ عبداللہ صاحب روپڑی تشریف فرما ہیں، ان سے مُلاقات کراؤں۔ مجھے کیا عذر ہو سکتا

تھا ان کے ساتھ حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

حافظ صاحب مرحوم کے ارد گرد اس وقت پچاس ساٹھ افراد کا مجمع تھا اور حافظ صاحب خود تو خاموش بیٹھے تھے، لیکن ادھیڑ عمر کے ایک صاحب پاکستان میں جماعت اہلحدیث کے آپس کے اختلافات اور مولانا داؤد غزنوی مرحوم سے اپنی شکایات کا تذکرہ کر رہے تھے۔ میں کچھ دیر تو صبر کے ساتھ سنتا رہا، لیکن پھر مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے قدرے درشتی کے ساتھ عرض کیا۔ "حضرات! آپ یہاں پاکستان سے دو اڑھائی ہزار میل دُور ایک مقدس مقام پر تشریف رکھتے ہیں۔ کیا اس جگہ بھی یہ ممکن نہیں کہ وہاں کے اختلافات کو بھلا کر باہمی اتّحاد اور اعتماد کی فضا پیدا کی جا سکے؟" میرے اس طرح اچانک توجہ دلانے پر مجمع سنّاٹے میں آ گیا اور سب لوگ حافظ صاحب مرحوم کی طرف دیکھنے لگے۔ لیکن خدا رحمت نازل فرمائے ان کی رُوح پر کہ اُنہوں نے میری مکمّل تائید کی اور حکم دیا کہ ان معاملات کا تذکرہ دورانِ حج نہ کیا جائے۔ ساتھ ہی گفتگو کا رُخ موڑ کر کچھ وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع فرما دیا!

مدینہ منوّرہ میں مولانا کی صحت زیادہ خراب ہو گئی تھی اور دل کا دَورہ پڑ گیا تھا لہٰذا کچھ نمازیں بھی مولانا نے مجبوراً اپنی قیام گاہ ہی پر ادا فرمائیں، لیکن مسجد نبوی کی جماعت سے محرومی پر شدید رنج اور افسوس مولانا کو ہوتا تھا اور جب بھی طبیعت ذرا سنبھلتی تھی مولانا ضرور مسجد نبوی میں حاضر ہو کر جماعت کے ساتھ نماز ادا فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ مسجد نبوی میں مغرب کی نماز کے لیے میں مولانا کے بالکل ساتھ ان کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہوا اور اپنی پُرانی عادت کی بناء پر میں نے تکبیر تحریمہ سے قبل ہی 'إنّی وجہت وجہی ..... الخ' پڑھا تو مولانا نے فوری طور پر تصحیح کی اور فرمایا کہ یہ دُعا تکبیر تحریمہ کے بعد پڑھا کرو، چنانچہ اسی وقت سے میرا معمول بدل گیا اور اب اکثر ایسا ہوتا ہے، کہ نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہوں، تو مولانا کی یہ نصیحت اور اس کے ضمن میں خود مولانا یاد آ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے، ان کی فروگذاشتوں سے درگزر کرے اور ان کے درجات

کو بلند تر فرمائے۔ آمین۔

واقعہ یہ ہے کہ اس دَور میں مولانا کی شخصیت بہت غنیمت تھی اور اس میں اسلام کے قرنِ اوّل کی بہت سی خصوصیات موجود تھیں، خصوصاً اتباعِ سنت کے مکمّل اہتمام کے ساتھ قلب و رُوح کی حیاتِ باطنی کا جو حسین امتزاج ان کی شخصیّت میں پایا جاتا تھا وہ تو اس دَور میں جب کہ تصوّف میں بہت سی نئی باتیں بطور لوازم داخل ہو گئی ہیں، بہت ہی قابلِ قدر تھا اور میری ناچیز رائے میں اس دَور میں شدید ترین ضرورت اسی چیز کی ہے۔

حضرت مولانا سید داؤد غزنویؒ

مولانا حکیم فضل الرحمٰن سواتی

مولانا داؤد غزنوی ایک جیّد عالمِ دین ہونے کے باوجود تحریکِ آزادیٔ ملک کے سرآوردہ علمبردار تھے۔ اسی سلسلے میں آپ کو انگریزی حکمرانوں نے کم و بیش دس بار جیل بھیج دیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کے حادثۂ فاجعہ کے سلسلے میں جو مارشل لا قائم ہوا اُس میں ڈاکٹر سیف الدّین کچلو کے ساتھ آپ کو بھی جیل بھیج دیا گیا تھا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں مسلم لیگ اور کانگرس کے اجلاس امرتسر میں منعقد ہوئے تھے۔ لیگ کے صدر مسیح الملک حکیم اجمل خاں تھے اور کانگرس کے صدر موتی لال نہرو۔ اس موقع پر گورنمنٹ نے تمام سیاسی نظربندوں اور قیدیوں کو رہا کر دیا۔ چھندواڑہ سے مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی رہا ہو کر امرتسر تشریف لے گئے تھے۔ پہلے تو یہ دونوں بھائی کانگرس کے اجلاس میں شریک ہوئے اور تقریریں بھی کیں، پھر لیگ کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ رات کا وقت تھا۔ جناب ڈاکٹر اقبالؒ نے ان دونوں کے خیر مقدم میں مندرجہ ذیل اشعار سُنائے:

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو ہمّت بلند　　قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے بہرہ مند
مُشک اذفر چیز کیا ہے اِک لہو کی بُوند ہے　　مُشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں فطرت مگر　　کم ہیں وہ طائر جو ہیں قیدِ قفس سے ارجمند

شہپرِ زاغ و زغن زیبائے قید و صید نیست
کیں کرامت ہمرہِ شہباز و شاہیں کردہ اند

یہ اشعار پڑھنے سے تمام مجمع پر سکتہ جیسی کیفیت طاری ہوگئی۔ میرے سامنے ایک خوش شکل نوجوان بیٹھے تھے، وہ داد دینے میں سب سے آگے تھے اور ہر شعر پر زور سے پکار پکار کر کہتے تھے "مکرّر کہیے"۔ یہ سن کر ڈاکٹر صاحب پھر اسے دُہرا دیتے تھے۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ یہ جوان کون ہیں؟ اُنہوں نے کہا کہ سیّد داؤد غزنوی ہیں۔ میں نے کہا وہی داؤد غزنوی جو مارشل لا کی گرفت میں آئے تھے؟ انہوں نے کہا ہاں وہی داؤد غزنوی ہیں، کل ہی رہا ہوئے ہیں۔ اجلاس کے اختتام پر میں ان سے ملا اور رہائی پر مبارک باد دی۔ یہ میری پہلی مُلاقات تھی جو مولانا سیّد داؤد غزنوی سے ہوئی تھی۔ ایک مہینے کے بعد بمبئی میں خلافت کانفرنس، زیر صدارت غلام محمد بھرگری منعقد ہوئی۔ حضرت مولانا آزادؒ بھی اس میں شریک تھے اور مولانا سیّد داؤد غزنویؒ مع چند ہمراہیوں کے امرتسر سے آکر شریک ہوئے تھے۔ مظفر آباد ہال جس میں کانفرنس کی سبجکٹ کمیٹی کے اجلاس ہوا کرتے تھے، اس میں تمام ڈیلی گیٹ اقامت پذیر تھے۔ مولانا غزنویؒ بھی اس میں مقیم تھے اور راقم الحروف بھی اسی ہال میں اقامت پذیر تھا۔ رات اور دن اُن سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ دس دن تک ہم ساتھ رہے۔ آپ کو حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ سے کمال عقیدت مندی تھی اور مولانا کا زیادہ رجحان بھی مولانا سیّد داؤد غزنویؒ کی طرف تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

کانفرنس کے اجلاسوں میں مولانا آزاد نے کوئی تقریر نہیں کی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک ماہ قبل مولانا محمد علی جوہر خلافت کے نمائندہ بن کر لندن تشریف لے گئے تھے، تاکہ مسٹر لائیڈ جارج وزیراعظم برطانیہ سے درخواست کر کے ملاقات کریں اور خلافت کا مسئلہ انہیں سمجھا دیں۔ یہ کانفرنس ان کی تائید میں منعقد کی گئی تھی لیکن مولانا آزاد کو اس قسم کی وفد بازیوں اور درخواستوں سے اتفاق نہیں تھا۔ آپ کا نظریہ تھا کہ خدا پر اعتماد کرنا چاہیے اور اپنے آپ کو کامیابی کا ذریعہ بنا دینا چاہیے۔ مولانا شوکت علی صاحبؒ اور دُوسرے متعدد لیڈروں نے مولانا آزادؒ سے درخواست کی کہ آپ کوئی مؤثر تقریر فرمائیں لیکن مولانا آزادؒ تقریر کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ تمام

ڈیلیگیٹ اور خاص کر پنجابی نمائندے مولانا آزاد کی تقریر سننے کے لیے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے۔ امرتسر والے ڈیلیگیٹوں نے مولانا غزنویؒ سے کہا کہ آپ ہی مولانا آزادؒ سے کہیے کہ تقریر فرمائیں۔ مولانا غزنوی صاحبؒ نے میرے سامنے مولانا آزادؒ سے کہا کہ لوگ آپ کی تقریر سننے کی بہت خواہش رکھتے ہیں۔ مولانا آزادؒ نے کہا کہ جب آپ کہتے ہیں، تو ضرور آج رات کو عام اجلاس میں تقریر کروں گا؛ چنانچہ رات کے ۹ بجے سے ۱۰ بجے تک مولانا آزاد نے پُر حقائق اور ولولہ انگیز تقریر فرمائی۔ مسئلہ خلافت کی اہمیت اور وضاحت بڑی عمدگی کے ساتھ کی۔ مسٹر لائیڈ جارج کی وعدہ خلافی کی قلعی کھول دی اور صاف اور غیر مبہم الفاظ میں فرمایا کہ لائیڈ جارج کی یہ وعدہ خلافی آزادِ ہند کا پیش خیمہ ہے۔ انگریزی حکومت سے دو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔ ایک تو اس کے وزیر اعظم مسٹر لائیڈ جارج کی وعدہ خلافی، جو ترکی حکومت کے ساتھ کی گئی ہے اور دوسری غلطی جلیانوالہ باغ کی گولہ باری ہے۔ اوّل الذکر سے مسلمانانِ ہند جو انگریزی حکومت کے دل سے وفادار تھے سخت برافروختہ ہو گئے ہیں اور ثانی الذکر سے تمام باشندگانِ ہند کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف جذبات بھڑک گئے ہیں۔

ع   خدا شرّے بر انگیزد کہ خیرے مادراں باشد

مولانا آزادؒ کی اس پُر مغز تقریر سے تمام حاضرین بہت ہی متأثر ہوئے۔ اختتام جلسہ پر لوگ مولانا سیّد داؤد غزنویؒ کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ ان کے کہنے سے مولانا آزادؒ نے تقریر فرمائی، ورنہ وہ تقریر کرنا نہیں چاہتے تھے۔

تین مہینے کے بعد مدراس میں خلافت کانفرنس زیرِ صدارت مولانا شوکت علی منعقد ہوئی۔ اس موقع پر میں نے مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کو خط لکھا کہ کانفرنس میں آکر شریک ہو جایئے آپ نے جواب دیا کہ میں ابھی مولانا آزادؒ سے مل کر دہلی سے آیا ہوں۔ مولانا آزاد کا ارادہ مدراس کانفرنس میں شرکت کا نہیں ہے، اس لیے میں شریک نہیں ہوں گا۔

تین ماہ کے بعد کلکتہ میں کانگرس کا اسپیشل اجلاس زیرِ صدارت لالہ لاجپت رائے

منعقد ہوا۔ اس میں مولانا سیّد داؤد غزنویؒ شریک تھے۔ مَیں بھی جا کر شریک رہا۔ چار دن ہم برابر ملتے رہے۔

چار مہینے کے بعد ناگپور میں کانگریس کا سالانہ اجلاس زیرِ صدارت وجے راگھو اچاریہ منعقد ہوا۔ اس موقع پر پھر مولانا سیّد داؤد غزنویؒ چند ہمراہیوں کے ساتھ شریک اجلاس تھے میں بھی شریک تھا۔ کانگرس کیمپ میں ہم سب ایک ہی جگہ میں قیام پذیر تھے۔ مہاتما گاندھی آنجہانی کی نان کوآپریشن (ترکِ موالات) والی تحریک اس اجلاس میں بالاتفاق پاس ہُوئی۔ صرف ہندوؤں میں سے مدن موہن مالویہ نے اور مسلمانوں میں سے صرف مسٹر محمد علی جناح نے مخالفت کی تھی۔ یہ دونوں کانگرس سے نکل گئے۔ جناح صاحب تو اخیر عمر تک پھر کانگرس میں شریک نہیں ہُوئے لیکن مالویہ جی ۱۹۲۷ء میں جو مدراس میں کانگرس کا اجلاس زیرِ صدارت جناب ڈاکٹر مختار احمد انصاری منعقد ہوا تھا، اس میں آکر شریک ہُوئے۔

ناگپور کانفرنس کے موقع پر مولانا سیّد داؤد غزنویؒ سے دس دن تک مجھے ملاقات کا موقع ملا تھا۔ اس موقع پر ایک عجیب و غریب مذہبی واقعہ بھی پیش آیا تھا۔ کانگرس کیمپ میں چند مسلمانوں نے مغرب کی نماز پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اقامت تو مَیں نے کہہ دی اور امامت مولانا غزنویؒ نے کی۔ نماز میں وہ اپنے مسلک کے مطابق باقاعدہ رفع یدین کرتے رہے۔ سلام پھیرتے ہی میرے ساتھ ایک حیدر آبادی صاحب تھے۔ اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ہماری یہ نماز صحیح ادا ہُوئی؟ مَیں نے کہا ہاں! درست ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ امام تو وہابی ہیں، وہابی کے پیچھے حنفیوں کی نماز درست نہیں ہے۔ مولانا داؤدؒ نے کہا:

"مَیں وہابی نہیں ہوں بلکہ اہلحدیث ہوں۔ حنفی مذہب میں اور اہلحدیث میں کوئی فرق نہیں ہے حضرت امام ابو حنیفہ بھی تو اہلحدیث تھے۔"

اس شخص کو بہت غصہ آیا۔ مولانا نے فرمایا کہ سنو بھائی امام اعظم کا یہ قول ہے:
"اذا صح الحدیث فھو مذھبی"۔ اس قول کی آپ نے اچھی طرح تشریح فرمائی

تمام نمازیوں نے مولانا غزنوی کا نظریہ قبول کیا اور وہ شخص بھی قائل ہو گیا۔ مولانا کی تشریح و توضیح سے لوگوں کے دلوں میں غیر مقلدین کے خلاف جو شکوک تھے، وہ سب رفع ہو گئے۔

گاندھی جی کی تحریکِ ترکِ موالات کے پاس ہونے کے بعد پبلک میں حکومت کے خلاف جذبات برانگیختہ ہو گئے اور سخت و تیز تقریریں شروع ہونے لگیں۔ لوگوں میں بہت جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ گورنمنٹ بھی سختی پر اُتر آئی اور گرفتاریاں شروع کر دیں۔ کراچی میں مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا نثار احمد صاحب کی سزایابی سے مسلمانوں میں بہت جوش پیدا ہو گیا۔ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک خاتون کی ایک نظم روزنامہ زمیندار میں شائع ہوئی جس کے ایک دو شعر جو اس وقت نوکِ زبان تھے سُنیے:

جو کچھ پڑے گی مجھ پہ مصیبت اُٹھاؤں گی
خدمت کروں گی مُلک کی اور جیل جاؤں گی
جا کر کراچی جیل میں کوٹوں گی رام بانس
شوکت علی کے ساتھ میں چکّی چلاؤں گی

مہاتما جی بھی برداوہ جیل بھیج دیے گئے۔ مَیں بھی جیل چلا گیا۔ میری گرفتاری سے ایک ہفتہ قبل مولانا سیّد داؤد غزنویؒ بھی جیل جا چکے تھے۔ رہائی کے بعد ۱۹۲۴ء میں کاکناڈا میں کانگریس اور خلافت کانفرنس کے اجلاس منعقد ہُوئے۔ خلافت کانفرنس کے صدر مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ تھے اور کانگریس کے صدر مولانا محمد علی جوہر تھے۔ اس موقع پر مولانا سیّد داؤد غزنویؒ بھی مع چند ساتھیوں کے شریک اجلاس تھے۔ مَیں بھی شریک تھا اور کانگریس کیمپ میں ان کے ساتھ مقیم تھا اور ہر وقت تبادلۂ خیالات ہوتا رہتا تھا۔ خلافت کانفرنس میں میرا ایک رزولیوشن عدن کے بارے میں جس کا اعلان پہلے اخبارات میں پیش ہو چکا تھا، پیش ہونے والا تھا۔ مولانا داؤدؒ نے نجی طور پر مجھ سے کہا کہ تم میری ترمیم قبول کر لو تو پھر میں تمہارے رزولیوشن کی تائید کروں گا۔ چونکہ ترمیم رزولیوشن کے منافی نہیں تھی، اس لیے مَیں نے بطیبِ خاطر قبول کر لی، پھر عام جلسے

میں آپ نے بڑے عمدہ پیرایہ میں میری تحریک کی تائید فرمائی، جس سے میری شخصیت بہت نمایاں ہوگئی۔ اخبار "وکیل" امرتسر نے مولانا داؤدؒ پر ایک دفعہ سخت تنقید کی تھی کہ یہ سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے ہیں جس سے قوم کا پیسہ یوں ہی برباد ہو جاتا ہے۔ مَیں نے اس بارے میں ان سے ذکر کیا، تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے کہ میں کبھی دُور و دراز کا سفر کرتا ہوں تو سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھتا ہوں عیش و آرام کی خاطر نہیں بلکہ نماز کی خاطر، اب جو آیا ہوں تو سیکنڈ کلاس میں آیا ہوں اور جاؤں گا بھی سیکنڈ کلاس میں (انشاء اللہ تعالیٰ)۔ سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں اطمینان سے نماز کا موقع ملتا ہے تھرڈ کلاس میں اطمینان سے نماز کا موقع نہیں ملتا۔ مَیں اپنے پیسے سے سفر کرتا ہوں۔ خلافت کمیٹی کا اگرچہ مَیں صدر ہوں، لیکن کمیٹی کی رقم مَیں نے ذاتی مفاد میں کبھی خرچ نہیں کی ہے۔ اخبار "وکیل" امرتسر نے سمرنا فنڈ کی تمام رقوم خورد برد کر دی ہیں، اس لیے بلفحوائے "من رآ فی نفسہ فقد رآ فی غیرہ" دوسروں پر بدگمانی کرتا ہے۔ اخیر میں حافظ کا یہ شعر سنایا ؎

بیا کہ خرقۂ من گرچہ وقفِ میکدہ ہاست
زمالِ وقف نہ بینی بنامِ من درمے

کاکناڈا کانفرنس کے بعد خلافت کا مسئلہ بہت سُست پڑ گیا کیونکہ مصطفیٰ کمال نے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ ہندوستان میں اب صرف کانگریس کی تحریک چلتی تھی جب کبھی کانگریس کے اجلاس ہوتے تھے اور مَیں بھی شریک ہوتا تو مولانا داؤدؒ سے ضرور ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ تو باقاعدہ ہر ایک اجلاس میں شریک ہوتے تھے اور مَیں کبھی کبھار شریک ہو جاتا تھا۔

۱۹۳۷ء میں جامعہ دارالسلام عمرآباد کی دستاربندی کے جلسے میں آپ عمرآباد تشریف لائے۔ اس موقع پر بھی ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد پھر کوئی موقع ملاقات کا نہیں ملا۔ اب حال میں جب میں مغربی پاکستان گیا تو ۳ دسمبر ۱۹۶۳ء کو اُن سے شرفِ ملاقات کا موقع ملا۔ یکم دسمبر کو تو میں لاہور پہنچا اور مولانا غلام رسول مہر صاحب کے خوشنما بنگلہ واقع مسلم ٹاؤن میں قیام پذیر رہا۔

پھر حضرت مولانا سید داؤد غزنویؒ سے ملنے کے لیے روانہ ہُوا۔ پہلے تو مَیں مولانا محی الدین احمد قصوری سے جا کر ملا۔ پھر اُن سے کہا کہ میں مولانا سیّد داؤد غزنوی سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ نے کہا کہ وہ ہسپتال میں ہیں مَیں بھی اُن سے ملنے کی خواہش رکھتا ہوں؛ چنانچہ ہم دونوں ہسپتال گئے۔ مَیں نے نبض دیکھ کر کہا کہ خُدا کے فضل سے بیماری تو نہیں ہے؛ البتّہ نقاہت بہت ہے۔ آپ نے کہا کہ ڈاکٹر کی بھی یہی رائے ہے اور کہتے ہیں کہ اب گھر چلے جاؤ۔ چنانچہ آج گھر جانے کا قصد ہے۔ مَیں نے کہا کہ نقاہت کی دوا میرے پاس ہے۔ اس وقت تو تیّار نہیں ہے لیکن وطن سوات جا کر بناؤں گا اور ایک کورس آپ کی خدمت میں بھیجدوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ ضرور بھیجیے مَیں انشاء اللہ تعالےٰ ضرور استعمال کروں گا۔

مَیں نے مولانا ظفر علی خان کے چند طنزیہ اشعار سُنا دیے جن کو وہ سُن کر بہت ہنسے۔ بات یہ ہُوئی تھی کہ تحریک نمک میں جب پولیس نے آپ کو گرفتار کر لیا تو آپ پولیس کے ساتھ جاتے نہیں تھے۔ پولیس نے مجبُور ہو کر آپ کو اُٹھا کر موٹر میں بٹھا دیا۔ جب کورٹ پہنچائے گئے تو موٹر سے اُترتے نہ تھے، پھر پولیس نے آپ کو پکڑ کر جج کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا جب سزا ہُوئی تو جیل جاتے نہ تھے پھر پولیس نے پکڑ کر موٹر میں بٹھا دیا۔ جیل پہنچے تو اُترتے نہ تھے، پھر پولیس نے پکڑ کر موٹر سے اُتارا۔ مولانا ظفر علی خان صاحب بھی جیل میں تھے۔ یہ کشمکش دیکھ کر چند اشعار فی البدیہہ موزوں کر دیے۔ ان میں سے چند اشعار یہ ہیں:

دی مولوی داؤد کو جو چڑی جو پولیس نے ۔۔۔ احباب نے پُوچھا بہ تعجب کہ یہ کیا ہے
کیوں لد کے چلے دوشِ حکُومت پہ حضور آج ۔۔۔ حضرت کی سواری کا طریقہ یہ نیا ہے
فرمانے لگے ہنس کے کہ میں عالمِ دیں ہُوں ۔۔۔ اور مرتبہ سرکار میں عالم کا بڑا ہے
اس واسطے مرکب بجے عوض فرطِ ادب سے ۔۔۔ خود اپنے تئیں آپ حکُومت نے کیا ہے
ہے فخر یہ مُجھ کو کہ مری ران کے نیچے ۔۔۔ خود حضرت عیسیٰ کی سواری کا گدھا ہے

پھر آپ نے جامعہ دارالسلام عمر آباد کے متعلق دریافت کیا۔ مَیں نے کہا کہ اچھی حالت میں ہے

جب سے علامہ مولانا عبدالواحد صاحب ناظمِ جامعہ بنے ہیں، مدرسہ ترقی پر ہے۔ پھر میں نے جامعہ کے اساتذہ اور دُوسرے عملے کی جانب سے السلام علیکم کہا کہ سب آپ کی خدمت میں السلام علیکم عرض کر رہے تھے اور آپ کی صحت کے لیے دست بہ دُعا رہتے ہیں۔ مولانا شعیب عمری کو جب معلوم ہو گیا تھا کہ میں پاکستان جارہا ہُوں تو اُنہوں نے مجھے لکھا کہ میرا بھی پاکستان جانے کا ارادہ تھا کیونکہ اخبارات کے ذریعے سے مولانا سید داؤد غزنوی کی علالت کی وحشت ناک خبر سمع خراش ہوئی ہے۔ ان سے نیاز حاصل کرنے کا ارادہ تھا لیکن پاسپورٹ نہیں ملا۔ آپ میری طرف سے سلام کہیے؛ چنانچہ مَیں نے مولانا شعیب کی جانب سے خاص طور پر ان کی خدمت میں السلام علیکم عرض کیا۔ مولانا نے پُوچھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ مَیں نے کہا کہ وہ بنگلور میں سی عبدالحکیم صاحب کے پوتے حاجی صدیق حسن صاحب کے ساتھ مل کر تجارت کر رہے ہیں۔ ان کے نانا مولانا فقیر اللہ صاحب رح ہیں۔ یہ سُنتے ہی فوراً کہنے لگے کہ مولانا فقیر اللہ صاحب میرے والد کے شاگرد تھے۔ میں بچپن سے اُن کو جانتا ہُوں۔ میری طرف سے بھی محمد شعیب صاحب عمری کو السلام علیکم کہیے۔

مَیں جب سوات پہنچا تو شدّتِ سردی کی وجہ سے سخت علیل ہوا، اس لیے مَیں دوا تیّار نہ کر سکا۔ ایک روز میرا نواسہ روزنامہ جنگ کراچی مجھے سُنا رہا تھا جس میں حضرت مولانا سیّد داؤد غزنوی رح کے انتقالِ پُر ملال کی خبر سُننے میں آئی۔ سُن کر بہت متاثر ہُوا اور مغفرت کی دُعا کی۔

حضرت مولانا سیّد محمد داؤد غزنویؒ

سیاسی زندگی کی ابتداء اور
مُلک کا سیاسی پس منظر

ملک حسن علی بی اے (جامعی)، شرقپوری

۴؍ اگست ۱۹۱۴ء کو پہلی عالمگیر جنگ کا شرارہ وسطِ یورپ میں چمکا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام مغربی ممالک اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ اس لڑائی کی فوری وجہ یہ ہوئی کہ آسٹریا کا ولیعہد ۱۸؍ مئی ۱۹۱۴ء کو سرویا میں مارا گیا۔ آسٹریا نے سرویا کو کڑی شرائط پیش کیں جنہیں سرویا نے پورا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر آسٹریا نے سرویا کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ روس نے سرویا کا ساتھ دیا اور جرمنی نے آسٹریا کی حمایت کی۔ فرانس پرانے معاہدہ کی رُو سے رُوس کا طرف دار ہو گیا۔ کچھ دنوں بعد جرمنی نے فرانس پر حملہ کرنے کی غرض سے اپنی فوجیں بلجیم میں سے گزارنا چاہیں، بلجیم نے جرمنی کی فوجوں کو راستہ دینے سے انکار کر دیا۔ جرمنی نے بلجیم پر حملہ کر دیا۔ برطانیہ نے بلجیم کی حمایت میں اپنی فوجیں فرانس بھیج دیں، اس طرح یورپ میں عالمگیر جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں جرمنی، آسٹریا، ہنگری، بلغاریہ اور ٹرکی ایک طرف تھے اور دُوسری طرف رُوس، فرانس، بلجیئم، برطانیہ، اٹلی، رومانیہ، سرویا، پُرتگال، یُونان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ تھے۔ جرمنی کے پاس سامانِ جنگ کافی مقدار میں تھا۔ ۱۹۱۷ء تک اس کا اور اس کے حلیفوں کا پلّہ بھاری رہا۔ سرویا، بلجیم اور رُومانیہ پر جرمن فوجوں کا قبضہ ہو گیا۔ فرانس کے مشرقی حصّے اور اٹلی کے شمال مشرقی حصّے بھی جرمن فوجوں نے فتح کر لیے۔ رُوس میں انقلاب ہو گیا۔ رُوس کی نئی گورنمنٹ نے جرمنی کے ساتھ صُلح کر لی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جرمن فوجیں فرانس پر قابض ہو جائیں گی، مگر ۱۹۱۷ء

میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی جنگ میں بروقت شرکت نے لڑائی کا سارا نقشہ بدل دیا۔ امریکہ کی تازہ دم فوجوں اور کثیر سامانِ جنگ کے مقابلہ کی جرمنی تاب نہ لا سکا۔ آخر جرمنی اور اس کے حلیفوں نے ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

ہندوستان اور جنگِ عظیم

ہندوستان کے لوگوں نے اس جنگِ عظیم میں جی کھول کر برطانیہ کی فوجی و مالی امداد کی ہندوستانی سپاہی شام، فلسطین، فرانس، عراق، عرب اور مشرقی افریقہ میں نہایت بہادری سے لڑے۔ تقریباً دس لاکھ ہندوستانی سپاہی جنگِ یورپ میں شریک ہوئے۔ جن میں سے ۳۶ ہزار مقتول اور ستّر ہزار مجروح ہوئے۔ ہندوستانی خزانہ سے ایک سو چون کروڑ روپے ہندوستانی فوج کے اخراجات کے لیے حکومت ہند نے ادا کیے اور ایک سو کروڑ روپیہ حکومت برطانیہ کو بطورِ نذر پیش کیے۔ ہندوستان کے والیانِ ریاست نے بھی دامے، درمے اور دیگر طریقوں سے بڑھ چڑھ کر مدد کی۔ جنگ کے دوران ہی میں لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند اپنے عہدہ سے سبکدوش ہو کر ولایت چلا گیا اور اس کی جگہ لارڈ چیمسفورڈ ہندوستان کا وائسرائے بن کر آیا۔

لارڈ چیمسفورڈ کی آمد کے وقت جنگِ یورپ زوروں پر تھی۔ لارڈ موصوف نے ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ مالی اور فوجی امداد بھیجی۔ حکومتِ برطانیہ نے اس شاندار خدمت کے صلہ میں ہندوستان سے وعدہ کیا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو ذمہ دارانہ حکومت دے کر ہندوستان کو آزاد کر دیا جائے گا۔ اس وقت کے وزیرِ ہند لارڈ مانٹیگو نے گورنمنٹ کی پالیسی کا واشگاف الفاظ میں اعلان کیا۔

چونکہ ترکی کے شاملِ جنگ ہونے کی وجہ سے گورنمنٹ برطانیہ کو خطرہ تھا کہ شاید ہندوستان کے مسلمان اس جنگ میں جو خلیفۃ المسلمین کے ساتھ ہے، شرکت نہ کریں گے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے نہایت شاندار اور خوش کُن اعلانات کیے اور کئی سنہری وعدے کیے۔ ٹرکی کے جنگ میں شامل ہونے کے بعد ۲ نومبر ۱۹۱۴ء کو سب سے پہلا اعلان گورنمنٹ آف انڈیا نے جو کیا اس کا خلاصہ یہ ہے:

ہزایکسلنسی وائسرائے ہند ہزمیجسٹی کی گورنمنٹ کے حکم کے مطابق عرب کے مقاماتِ مقدسہ کے بارے میں جن میں عراق کے متبرک مقامات اور بندرگاہ جدہ بھی شامل ہے، مندرجہ ذیل اعلان کرتے ہیں تاکہ ہزمیجسٹی کی نہایت وفادار مسلم رعایا کو غلط فہمی پیدا نہ ہو۔ اس جنگ میں مذہبی جنگ کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اُن مقاماتِ مقدسہ اور بندرگاہ جدہ پر برطانوی بری و بحری طاقتوں سے کبھی حملہ نہ ہوگا، نہ ان کو ستایا جائے گا۔ جب تک کہ حجاج و زائرینِ ہند سے، جو ان مقاماتِ مقدسہ میں جائیں، کوئی چھیڑ نہ کی جائے۔

ہزمیجسٹی کی گورنمنٹ کی استدعا پر گورنمنٹ فرانس و رُوس نے بھی اس طرح کا یقین دلایا ہے۔"

۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو مسٹر لائیڈ جارج وزیرِ اعظم انگلستان نے اپنی مشہور تقریر میں کہا:

"ہم اس لیے جنگ نہیں کر رہے کہ ٹرکی کو اس کے دارالخلافت سے محروم کر دیں، یا ایشیائے کوچک اور تھریس کے زرخیز و شہرۂ آفاق علاقے لے لیں، جن میں ترکی النسل آبادی کا جز غالب ہے۔"

وزیرِ اعظم نے اپنی اسی تقریر میں مزید یقین دلانے کے لیے کہا:

"میں دلیری کے ساتھ اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں صرف گورنمنٹ کے مافی الضمیر ہی کی نہیں، بلکہ تمام قوم اور قلمرو کی بحیثیتِ مجموعی ترجمانی کر رہا ہوں۔"

پریذیڈنٹ امریکہ مسٹر ولسن نے ۸ جنوری ۱۹۱۸ء کو جن چودہ شرطوں کا اعلان کیا تھا، جو باتفاقِ فریقین صُلح کے لیے بُنیادی شرطیں قرار پائی تھیں، ان میں بارھویں شرط یہ تھی:

"موجودہ سلطنتِ عثمانی میں ٹرکی کا جو حصہ ہے، اس کو یقین دلایا جائے گا کہ اس کی وہ سلطنت محفوظ رہے گی لیکن دُوسری اقوام جو سلطنت ٹرکی کے زیرِ حکومت ہیں، ان کو بھی اس

کا اطمینان دلایا جائے گا کہ ان کی جان و مال محفوظ ہے اور ان کی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔

بدعہدی کی حد ہو گئی

ان مواعید کو کس طرح پورا کیا گیا، یہ ایک دردناک داستان ہے۔ جو بدسلوکی ٹرکی کے ساتھ کی گئی، وہ نہ جرمنی کے ساتھ کی گئی نہ آسٹریا کے ساتھ اور نہ کسی دوسرے فریقِ جنگ کے ساتھ۔ برٹش فوجوں نے دارالسلطنت قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور خلیفۃ المسلمین کی حیثیت ایک نظربند کی سی کر دی۔ عراق پر برطانیہ نے حکم برداری کا دعویٰ کر دیا۔ شام کو ٹرکی سے الگ کر کے فرانس کی حکم برداری و بالادستی ماننے پر مجبور کر دیا؛ چنانچہ فرانس کی فوجوں نے شام پر جبراً قبضہ کر لیا۔ بصرہ، بغداد، بیت المقدس، کوفہ، کربلائے معلّیٰ، نجفِ اشرف پر گورنمنٹ برطانیہ نے قبضہ کر لیا۔ سمرنا جو ایشیائے کوچک کا مشہور و زرخیز مقام ہے، ٹرکی سے علیحدہ کر دیا گیا۔ وہاں کی مسلمان آبادی پر یونانیوں نے بے پناہ مظالم کیے۔

۵۔ جون ۱۹۱۶ء کو خالص سرزمینِ حجاز میں سازش کر کے شریفِ مکہ سے بغاوت کرائی گئی۔ اس بغاوت کی وجہ سے اس محترم دارالامن میں کشت و خون کا بازار گرم ہوا اور حدودِ حرم میں گولہ باری ہوئی۔ جدہ پر بھی گولہ باری ہوئی۔ برطانوی ہوائی جہاز نے مدینہ طیبہ کی فضا میں چکر لگائے۔

ٹرکی کو تھریس کے کل علاقہ سے مع ایڈریانوپل کے محروم کر دیا گیا۔ ادھر ہندوستان میں جنگ کے دوران میں ہندوستان کے لیڈروں، سیاسی رہنماؤں اور ذی اثر علماء کو گورنمنٹ برطانیہ نے نظربند کر دیا اور ان کی نقل و حرکت پر کڑی پابندیاں عائد کر دیں۔ گورنمنٹ برطانیہ کی نیت بد تھی، وہ کسی قیمت پر اپنے مواعید نہ اہلِ ہند کے ساتھ اور نہ مسلمانانِ ہند کے ساتھ پورا کرنے پر آمادہ تھی۔ ملک میں بے چینی بڑھ گئی۔ انقلابی تحریکیں کروٹیں لینے لگیں۔ حکومتِ ہند نے ان تحریکوں اور سازشوں کی روک تھام کے لیے ہندوستان کی مجلسِ قانون ساز میں رولٹ

ایکٹ کے نام سے ایک بِل پیش کیا۔ غیر سرکاری اراکین کی مخالفت کے باوجود یہ بِل پاس ہو گیا۔

مسٹر گاندھی کے زیرِ کمان ہندوستان کے تمام سیاسی لیڈروں نے جن میں ہندو، مسلمان سکھ سبھی شامل تھے، ستیہ گرہ یعنی عدمِ تعاون کی تحریک جاری کر دی جس کا اصل مقصد یہ تھا کہ رولٹ ایکٹ کے بِل کا نفاذ نہ ہو سکے۔ یہ تحریک پُرامن طریقہ پر جاری نہ رہ سکی۔ دہلی، احمد آباد اور بمبئی میں اس تحریک کی وجہ سے فسادات ہوئے۔ امرتسر اور لاہور دو شہر پنجاب کی سیاسی تحریکات کا مرکز بن گئے۔ امرتسر میں عوام کے ہجوم نے مشتعل ہو کر پبلک عمارتوں کو آگ لگا دی۔ چند ایک انگریز قتل بھی ہو گئے۔ کئی اور مقامات پر بھی فسادات ہوئے۔ گورنمنٹ نے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ فوجی عدالتیں قائم کی گئیں۔ ہر قسم کے جلسے اور جلوس ممنوع قرار دیئے گئے۔ امرتسر میں اس قانون کی مخالفت کرتے ہوئے جلیانوالہ باغ میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ اہلِ جلسہ پر جنرل ڈائر نے بغیر تنبیہہ اور اطلاع کے گولی چلا دی۔ سینکڑوں لوگ مر گئے۔ اس قتلِ عام نے اہلِ ہند کے دلوں میں انتہائی بدظنی اور نفرت پیدا کر دی۔ ستیہ گرہ کی تحریک، مارشل لاء کے نفاذ اور جلیانوالا باغ کے ہولناک واقعات نے بہت زیادہ بے چینی پیدا کر دی۔ دوسری طرف سقوطِ خلافت نے اور تمام مواعید کی خلاف ورزیوں نے مسلمانوں کو برافروختہ کیا ہوا تھا۔ انگلستان کی حکومت نے ٹرکی کو نہایت ذلیل شرائط پر صلح کرنے کے لیے مجبور کیا تھا۔ سلطانِ ٹرکی ہندوستان کے مسلمانوں کے نزدیک خلیفۂ اسلام تھا۔ ٹرکی کی تباہی اسلامی خلافت کی تباہی تھی۔

ان حالات میں ملک میں بیک وقت دو تحریکیں شروع ہو گئیں۔ ایک تحریک کا سربراہ مسٹر مہاتما گاندھی تھا دوسری تحریک خلافت ایجی ٹیشن تھی۔ کانگرس اور مجلسِ خلافت کے اتحاد نے ہندوستان میں قومی وحدت کی صورت پیدا کر دی۔ ملک نے عدمِ تعاون کی تحریک شروع کی۔ اس تحریک کا منشا یہ تھا کہ انتظامی معاملات میں گورنمنٹ کے ساتھ تعاون نہ کیا جائے۔ لوگوں کو تلقین کی گئی کہ وہ سرکاری خطابات اور جاگیروں اور انعامات کو واپس کر دیں۔ سرکاری سکولوں کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ بدیشی کپڑا چھوڑا گیا۔ جمیعت العلماء ہند نے اہلِ اسلام

کے لیے پولیس اور فوج کی نوکری کو حرام قرار دیا۔ وکلاء نے عدالتوں کا بائیکاٹ کیا۔ یہ تحریک ایک دفعہ نازک مرحلہ پر پہنچ گئی۔ گورنمنٹ نے ہندوستان کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ بڑی بڑی طویل سزائیں دیں۔ ہزارہا آدمی جیلوں میں چلے گئے۔

۱۹۲۱ء میں لارڈ ریڈنگ ہندوستان کے وائسرائے بن کر آئے۔ ہندوستان کی سیاسی فضا عدمِ تعاون اور خلافت کی تحریک کی وجہ سے کافی مکدّر تھی۔ راعی اور رعایا کے باہمی تعلقات نہایت کشیدہ تھے؛ چنانچہ نومبر ۱۹۲۱ء میں جب پرنس آف ویلز بمبئی اُترے تو وہاں سخت فساد ہو گیا۔ کئی آدمی مارے گئے اور سینکڑوں زخمی ہوئے۔ کانگرس نے شہزادے کے استقبال میں کسی جگہ حصّہ نہ لیا۔

دریں اثنا مسٹر گاندھی نے کاٹھیاواڑ کے ضلع باردولی سے عدمِ ادائیگی ٹیکس کی تحریک جاری کی یعنی لوگ گورنمنٹ کو کسی قسم کا ٹیکس اور لگان ادا نہ کریں۔ مسٹر گاندھی نے ساتھ ہی پُرامن رہنے کی تاکید کر دی۔ عوام مسٹر گاندھی کے اصولوں کو نہ نباہ سکے۔ تشدّد پر اُتر آئے۔ مسٹر گاندھی نے ناراض ہو کر عدمِ ادائیگی ٹیکس کی تحریک کو واپس لے لیا۔ گورنمنٹ نے مسٹر گاندھی کو چھ سال کے لیے قید کی سزا دے دی۔ دیگر سیاسی لیڈروں کو بھی سزائیں ملیں۔ مسٹر گاندھی نے اس تحریک کو بند کر کے لوگوں کے حوصلوں کو بہت پست کر دیا۔ لارڈ ریڈنگ کو موقع مل گیا۔ اس نے ایک طرف عدمِ تعاون کی تحریک کو ناکام بنایا، دوسری طرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے جن میں فریقین کا کافی نقصان ہوا۔

مولانا داؤد غزنویؒ

ان ہی دنوں موچی دروازہ لاہور کے باہر ہندو مسلمانوں کا ایک مِلا جُلا احتجاجی جلسہ ہوا۔ لالہ گوردنداس ایک ہندو لیڈر نے تقریر کی۔ کچھ اور تقریریں ہوئیں۔ رات کا سماں تھا اور شاید ۱۹۲۰ء کا ستمبر اکتوبر کا مہینہ تھا کہ مولانا داؤد غزنوی اور مولانا

عطاء اللہ شاہ بخاریؒ ایک سیاسی سٹیج پر نمودار ہوئے۔ اس اجلاس میں سب سے آخری تقریریں انہی دونوں حضرات نے کیں۔ دونوں نوجوان، وجیہہ صورت، سحر طراز مقرّر اور انقلاب انگیز خطیب تھے۔ اس پہلی صحبت میں ہی دونوں کے زورِ بیان اور رنگینیٔ گفتار نے پبلک کا دل موہ لیا۔ ان کی زبانوں میں دریا کی روانی، جلال میں تلواروں کی کاٹ اور جمال میں صبا کی لطافت پائی جاتی تھی۔

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا اینجاست

اس کے بعد لاہور کے ہر سیاسی جلسے میں دونوں اکٹھے شمولیت فرماتے۔ دونوں میں کچھ اوصاف مشترک تھے۔ دونوں فصیح اللّسان، مجاہد، ہمہ تن ایثار، سراپا اخلاص، سرفروش غازی، جامعِ شرافتِ نسبی و شرافتِ ذاتی، طلیق الوجہ، خوش گفتار، بلند اخلاق، حسین صورت، لطیف سیرت تھے۔ علومِ مذہبی میں دستگاہ اور علومِ عصری سے آگاہ:

بہارِ عالم حسنش دل وجان تازہ مے دارد
بہ رنگ اصحابِ صورت را ببو اصحابِ معنیٰ را

یہ تھا ان دونوں سرفروشوں کی زندگی کا آغاز، علمی مشاغل سے بھی لگاؤ رکھا اور اسلامی و ملکی سیاست سے بھی گہری دلچسپی رہی۔ ملکی اور وطنی تحریک میں کئی بار جیل گئے، بلکہ دونوں کی جوانی کا زمانہ جیلوں میں کٹا۔ ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش پیدا نہ ہوئی۔ آخری دم تک اپنے اصول پر ڈٹے رہے۔

مولانا محمد داؤد غزنویؒ کچھ خاص خصائص کے حامل تھے۔ وہ علاوہ خطیب اور مقرّر ہونے کے ایک پختہ کار عالمِ دین تھے۔ تفسیر، حدیث، رجال، فقہ اور تصوّف میں کامل دستگاہ تھی۔ ان کی تقریر متین و مدلّل، پُر مغز، پُر معانی، حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی۔ نقشبندی صوفیاء کے سلسلہ سے منسلک تھے۔ ایک دفعہ نیلا گنبد کی مسجد میں اپنا طریقت کا سلسلہ یوں بیان

فرمایا کہ سلسلۂ نقشبندیہ میں میری بیعت اپنے والد حضرت مولانا عبدالجبار رحمۃ اللہ علیہ سے ہے اور حضرت مولانا عبدالجبار رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت اپنے والد حضرت مولانا عبداللہ غزنویؒ سے ہے۔ حضرت مولانا عبداللہؒ کی بیعت شیخِ وقت حضرت مولانا حبیب اللہ قندھاریؒ سے ہے۔ حضرت مولانا حبیب اللہ قندھاریؒ کی بیعت حضرت سیّد احمد شہیدؒ سے ہے۔

مولانا شہاب الدین فاضل دیوبند خطیب جامع گورنمنٹ کوارٹرز چوبرجی گارڈنز لاہور نے ایک واقعہ بیان کیا کہ میں جب دیوبند میں زیرِ تعلیم تھا۔ تو ایک دفعہ ایک ماہ کی رخصتوں کے لیے دار العلوم بند ہو گیا۔ مہتمم دار العلوم نے طلبہ کو اپیل کی کہ واپسی کے وقت اپنے اپنے علاقوں سے دار العلوم کے لیے امدادی رقوم فراہم کر کے لائیں۔ میں امرتسر کے سٹیشن پر اتر پڑا اور رات گزارنے کے لیے غزنویوں کی مسجد میں جا ٹھہرا۔ رات کے دو بجے تہجد کی نماز کے لیے ایک شخص مسجد میں آیا۔ خشیت و خوفِ الٰہی کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے آنسو مسجد کی چٹائی پر اس طرح ٹپک رہے تھے، جس طرح بارش کی وجہ سے چھت سے قطرات ٹپکتے ہیں۔ چونکہ مسجد میں اندھیرا تھا، میں نے دیا سلائی جلا کر معلوم کرنا چاہا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ معلوم ہوا کہ مولانا عبدالجبار صاحب غزنویؒ ہیں۔ مولانا عبدالجبار صاحبؒ اس وقت نماز ختم کر کے مسجد سے نکل گئے تھے۔ صبح میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور مدّعا بیان کیا کہ حضرت میں دیوبند سے آیا ہوں، طالب علم ہوں، اپنے دار العلوم کے لیے کچھ امداد کا طالب ہوں۔ حضرت مولانا عبدالجبارؒ نے جمعہ کے خطبہ میں چندہ کے لیے اپیل کی، چندہ جمع ہوا اور میرے حوالے کیا۔

حضرت مولانا عبدالجبارؒ کے برادر خورد حضرت مولانا عبدالواحد صاحب غزنویؒ مدت العمر چینیانوالی مسجد کے خطیب رہے۔ مجھے کئی دفعہ حضرت مولانا عبدالواحدؒ کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا موقع ملا۔ بہت رقیق القلب تھے۔ جب قرأت میں ایّاک نعبد و ایّاک نستعین پڑھتے تو بے اختیار آواز بھرّا جاتی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ حافظ ابن قیمؒ کے عاشق زار تھے۔ ان کی تصنیفات سے انہیں بہت مناسبت تھی۔ مولانا عبدالواحدؒ کی

وفات کے بعد چینیانوالی مسجد کی خطابت کے فرائض مولانا محمد داؤد غزنوی رح ادا کرتے رہے۔ مجھے کئی دفعہ مولانا مرحوم کے درسِ قرآن میں شرکت کا موقع ملا۔

الغرض حضرت مولانا مرحوم بے شمار محاسن کا مجموعہ تھے۔ بہت سے کمالات واوصاف سے قدرت نے انہیں نوازا تھا۔

دامانِ نگہ تنگ، گلِ حسنِ تو بسیار
گل چین نگاہ توز داماں گلہ دارد

مکتوبات حضرت مجدّدِ الفِ ثانی رحمۃ اللہ بالعموم حضرت مولانا کے زیرِ مطالعہ رہتے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ میں جیل کے زمانہ کا زیادہ وقت مکتوبات کے مطالعہ میں گزارتا ہوں۔ نماز کے بارے میں شیخ مجدّد کے جملہ مکاتیب حضرت مولانا نے یکجا ایک مسودہ کی صورت میں جمع فرمائے تھے۔ اس کی اشاعت چاہتے تھے مگر بیماری کی طوالت نے آپ کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔

یادِ رفتگاں

حضرت مولانا کی وفات کے سلسلے میں مجھے ایک ایک کر کے وہ تمام بزرگ مجاہد سرفروش غازی اور شہید یاد آرہے ہیں جنہوں نے اس ملک میں اسلام کی برتری کے لیے اور اپنے ملک کی آزادی کے لیے قید و بند کی مصیبتیں برداشت کیں۔ ان کی ایک طویل فہرست ہے بعض ان میں بڑی بلند ہستیاں ہیں۔ حضرت مولانا اسی سلسلہ کی آخری کڑی تھے۔ اب شاید جو باقی ہیں اور بقیدِ حیات ہیں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان بزرگواروں کے قدردان بھی دُنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ کیسی کیسی بابرکت ہستیاں تھیں۔ ان کی صحبتوں میں ایمان تازہ ہوتا تھا۔ وہ سب کے سب مجسمۂ اخلاص تھے۔ اللہ کریم ان سب کی قبروں کو نور سے بھر دے۔ ان کی خطاؤں سے درگزر کرے، ان کی قربانیوں کو قبول کرے اور جنت الفردوس میں ان کو جگہ دے۔ دُنیا میں حضرت مولانا محمد داؤد غزنوی رح کی ان لوگوں سے رفاقت رہی بلاواسطہ یا بالواسطہ ان سے مربوط

رہے ۔میں یقین کرتا ہوں کہ عالمِ آخرت میں بھی ان کی رفاقت قائم رہے گی۔

حضرت مولانا مسلکاً سلفی العقیدہ اہلِ حدیث اور متبعِ کتاب وسنت، مگر متشدد نہیں تھے۔ ائمہ مجتہدین بالخصوص حضرت امام ابوحنیفہؒ کا پورا پورا احترام کرتے تھے۔ فروعی مسائل میں کبھی نہیں اُلجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دیوبندی علماء آپ کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ خود مولانا صاحب کا اپنا بیان ہے کہ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم کے بعد جمعیت علماء ہند کے صدر مولانا حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند بنے اور نائب صدر کا عہدہ مجھے تفویض ہوا۔ یہ معلوم ہے کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ مذہب کے بارے میں نہایت متقشف اور سخت گیر تھے، مگر نماز کے وقت امامت کے لیے مولانا حسین احمد مرحوم مجھے آگے کر دیتے اور میری اقتدا میں نماز پڑھتے۔ حضرت مولانا احمد علی مرحوم (امیر انجمن خدام الدین لاہور) تمام عمر عیدین کی نماز حضرت مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی اقتدا میں پڑھتے رہے۔

مولانا نے شباب کا زمانہ ملکی اور سیاسی تحریکوں میں قربان کیا، مگر پاکستان بن جانے کے بعد اپنی تمام تر توجہ جمعیتِ اہلِ حدیث پاکستان کی کامیابی کے لیے مبذول کر دی۔ باوجود علالت اور بڑھاپے کے لمبے اور طویل سفر آپ کو کرنے پڑتے۔ جماعتی الجھنوں کو نہایت حسن تدبیر سے حل فرماتے۔

وا اسفا علی فراق قوم
هم المصابیح والحصون

(ہائے افسوس ان لوگوں کی جدائی پر جو روشن چراغ تھے اور ہمت کے قلعے تھے)

والمدنُ والمزن والرّواسی
والخیرُ والامنُ والسکون

(وہ شہر تھے اور بادل تھے اور پہاڑ تھے۔ خیر وبرکت تھے امن تھے اور سکون تھے)

لم تتغیر لنا اللیالی   حتّٰی توفّٰهم المنون

ہمارے لیے زمانہ نے اس وقت تک رنگ نہیں بدلا جب تک کہ موت نے
ان کو اپنے قبضہ میں نہیں کر لیا)

وکل جمر لنا قلوبٌ
وکل ماءٍ لنا عیون

(اب یہ حال رہے کہ دل انگارا ہے تو آنکھیں پانی بہا رہی ہیں یعنی اس آگ کے
سوا ہمارے پاس کوئی آگ نہیں اور اس پانی کے سوا کوئی پانی نہیں ہے ۔)

دارالعلوم تقویۃ الاسلام

ان تمام گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود جن کا ان چند پریشان اوراق میں ذکر کر چکا ہوں، مولانا کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے تقسیمِ ملک کے بعد دارالعلوم تقویۃ الاسلام یعنی مدرسہ غزنویہ کو جس کی بُنیاد مولانا کے والد مولانا عبدالجبار غزنویؒ نے امرتسر میں رکھی تھی، بدستور جاری رکھا اور باوجود بے شمار مشکلات کے اس چشمۂ فیض کو بند نہیں ہونے دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اہلِ پنجاب پر بالخصوص اور پُورے برِّصغیر پاک و ہند پر بالعموم غزنوی خاندان کا بہت بڑا احسان ہے۔ جماعت کی سعادت مندی اور محسن شناسی کا تقاضا یہی ہے کہ جماعت بیش از بیش مالی امداد سے اس دارالعلوم کو مالی مشکلات سے بے نیاز کر دے۔ لاہور میں جماعت اہلِ حدیث کا یہ مدرسہ بڑی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ حضرت مولانا اپنی مسلسل بیماری و ضعف کی وجہ سے مدرسہ کی کماحقہ، سرپرستی نہیں کر سکے۔ اب مولانا کے بعد وفاشعاری اور احسان شناسی کا تقاضا یہی ہے کہ اس درسگاہ کی طرف جس درسگاہ نے قال اللہ و قال الرسول کا غلغلہ بُلند کر کے مُلک میں علم و بصیرت کے چراغ روشن کیے اور جہالت و بدعت سے اس خطے کو پاک کیا، پُوری توجّہ مبذول فرمائیں :

در دِ دل دارم بسے از خوئے آں زیبا نگار — فرصتے یا رب! کہ دل را پیشِ وے خالی کنم
بلند مرتبہ زیں خاکِ آستاں شدہ اُم — غبارِ کوئے تو اُم گر بر آسماں شدہ اُم

مولانا غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک ملاقات

مولانا محمد داؤد راز
سابق ناظم اعلیٰ آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس
(دہلی)

زعیم الملّت، سیّد القوم، حضرت العلّام، مولانا سیّد محمد داؤد صاحب غزنوی قدس اللہ سرہ کی عظیم ترین شخصیت پر جس قدر بھی لکھا جائے، کم ہے۔ درحقیقت مرحوم ان نادرِ روزگار ہستیوں میں سے تھے جن کے لیے خلّاقِ عالم کی نوازشات رفعتِ انسانی کا اعلیٰ ترین مقام مہیّا کرتی ہیں۔ جن کے حق میں کہا گیا ہے:

لیس للہ بمستنکر ان یجمع العالم فی الواحد

یوں تو اس پاک ترین خاندان (غزنویہ) کے جملہ اکابر اپنے اپنے وقت کے آفتابِ دین اور ماہتابِ شرعِ متین ہیں، جن کے فیوضِ روحانی سے برصغیر کے کونہ کونہ نے رُوحانی تروتازگی حاصل کی لیکن اس سلسلۃ الذہب میں حضرت مولانا محمد داؤد غزنویؒ کا وجودِ گرامی بہت سی نمایاں خصوصیات کا حامل نظر آتا ہے۔ آپ ایک پختہ مذہبی انسان تھے اور احیاءِ دینِ متین آپ کا از اوّل تا آخر نصب العین رہا۔ حضرت مولانا سیّد احمد شہیدؒ اور حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے احیاءِ ملّت کا جو کام شروع کیا تھا، حضرت مولانا غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو اپنا مسلک قرار دیا۔ انگریزی اقتدار کو آپ قوم اور وطن کے لیے ایک مستقل لعنت سمجھتے تھے، اسی لیے جنگِ آزادی کے لیے آپ کی قربانیاں تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف سے لکھی جائیں گی۔ آپ نے خلافت کمیٹی، کانگریس، جمعیۃ العلماء ہند، مجلسِ احرار وغیرہ تمام تنظیموں میں شرکت فرما کر استخلاصِ وطن کے لیے بیش بہا

خدمات انجام دیں، بارہا قید و بند کے مصائب کو برداشت کیا۔ حادثۂ جلیانوالہ باغ جس کے باعث پورا پنجاب قبرستان بنا ہوا تھا اور سارے ملک میں ماتم بپا تھا، اس وقت آپ نے انگریزی اقتدار کے خلاف ایک شورِ محشر برپا کردیا۔ یہ زمانہ اس قدر مہیب تھا اور اُس وقت انگریزی استبداد اس قدر ظلم پر کمربستہ تھا کہ حق و انصاف کے لیے زبان کھولنا اور آواز بلند کرنا صرف ان ہی لوگوں کا کام ہو سکتا تھا، جو شیروں جیسا دل رکھتے تھے اور جنہیں قدرتِ کاملہ نے اس لیے وجود بخشا تھا کہ وہ ظالم انگریز کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں، مُلک کو ان کے مظالم سے نجات دلائیں اور ہندوستان کی پسماندہ اقوام کو غلامی کی ذلت سے نکال کر آزادی و حُریت کی عزت سے سرفراز کریں۔ الغرض وطن اور ملّی خدمات کے سلسلہ میں مولانا مرحوم کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔

مجھ ناچیز کو حضرتِ مولانا غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے کئی مواقع ملے اور تقسیمِ مُلک سے قبل کئی مرتبہ آپ کے دیدارِ پُرانوار اور آپ کے خطباتِ عالیہ سُننے کی سعادت نصیب ہُوئی، مگر ۱۳۸۱ھ میں بتقریبِ حج غالباً ۴ ذی الحجہ کی مُلاقات تاحیات یاد رہے گی۔ اس سال حضرت رح حکومت سعودیہ کی دعوتِ خصوصی پر حجاز تشریف لائے تھے اور بحیثیت ایک معزز رُکن کے آپ مدینہ یُونیورسٹی کی مجلس مشاورت میں شرکت فرمارہے تھے۔ مکۃ المکرمہ و حجاز کے دیگر اخبارات میں آپ کی تشریف آوری اور آپ کے خطباتِ عالیہ کا کافی تذکرہ تھا۔ میرے کئی ایک مخلصین نے جب یہ باتیں معلوم کیں تو سب نے بالاتفاق زور دیا کہ حضرت مولانا مدظلہ سے مُلاقات کی جائے۔ اس سے بہتر موقع اور نہ مل سکے گا۔ تقسیم ملک کی وجہ سے جو کچھ دُوری حضرت مولانا سے ہو گئی، وہ ظاہر ہے۔ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا مصری ہوٹل میں قیام پذیر ہیں؛ چنانچہ میں بعد مغرب اپنے پانچ سات مخلص رفقاء کے ہمراہ مصری ہوٹل کی جانب روانہ ہوا۔ وہاں پہنچنے پر بوّاب نے بتلایا کہ مولانا کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں اور جلد ہی واپس آنے والے ہیں۔

ہم لوگ انتظار میں وہاں بیٹھ گئے۔صرف دس بارہ منٹ گزرے ہوں گے کہ میرے ساتھیوں نے دیکھا ایک بہت ہی نورانی شکل والے بزرگ تشریف لا رہے ہیں، جن کی شکل وصورت سرتا پا آیتِ کریمہ سیما ھم فی وجوھم من اثر السجود کا منظر پیش کر رہی ہے۔ میں نے فرطِ مسرت میں اپنے ساتھیوں کو بتلایا کہ جس بزرگ کی زیارت کے لیے آپ حضرات تشریف لائے ہیں، وہ آپ ہی ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا جس پر حضرت مولانا قدس سرہ العزیز نے مجھ کو اپنے سینے سے لگا لیا اور آپ کے یہ الفاظِ مبارکہ میرے لیے باعثِ صد فخر ہیں جو ہمیشہ مجھے یاد رہیں گے۔ آپ نے بڑی ہی محبت آمیز آواز میں فرمایا:

"بھئی آپ سے ملنے کی ایک عرصہ سے آرزو تھی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آج حرمِ شریف میں اللہ پاک نے ملاقات کرا دی۔"

یہ فرماتے ہوئے کافی دیر تک سینہ سے لگا کر دعائیں دیتے رہے، پھر سب ساتھیوں سے فرداً فرداً مصافحہ فرمایا اور میں نے سب کا تعارف کرایا۔ اب ہم سب حضرت کے ساتھ ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ مولیناؒ نے اپنی طبیعت کا حال سنایا، پھر عامۃ المسلمینِ ہند خصوصاً جماعتی کوائف دیر تک دریافت فرماتے رہے۔ دہلی کے اکابر حضرات کا فرداً فرداً حال پوچھا۔ اہلحدیث کانفرنس اور حضرت مولانا آروی مدظلہ العالی و دیگر حضرات کے احوال دریافت فرماتے رہے۔ اس ملاقات سے ہماری خوشی کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا، مگر مرحوم بھی بیحد خوش ہوئے۔ تقریباً نصف گھنٹہ آپ کے ساتھ یہ بابرکت نشست رہی۔ رخصت کرتے وقت فرمایا کہ ہندی مسلمانوں بالخصوص جماعت اہلحدیث ہند کو میرا سلام اور خیریت پہنچا دینا اور یہ بھی فرمایا کہ شاید ابھی ایک دو روز قیام رہے۔ میں مغرب کے بعد بابِ سعود کے پاس بیٹھا کرتا ہوں، وہاں مجھ سے پھر ملنا۔ دوسرے دن بڑے اشتیاق

سے مَیں آپ کی مُلاقات کے لیے بعد مغرب باب سعُود کے پاس پہنچا تو حضرت مولانا کہیں نظر نہ آئے۔ معلوم ہوا کہ موصوف شاہی طیّارہ میں مدینۂ منوّرہ تشریف لے گئے ہیں، وہاں جامعہ اسلامیہ کی جنرل کونسل کا اجلاس شروع ہے، آپ وہاں شرکت فرمانے کے لیے بلالیے گئے ہیں۔ دُوسرے دن اخبارات کے ذریعہ آپ کی خیریت اور مدینۂ منوّرہ بعافیت پہنچنے کی خبر معلوم ہوئی۔ مرحوم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اللہ کو منظور رہا تو کبھی ہندوستان آکر سب سے ملاقات کی کوشش کروں گا۔ صد افسوس کہ مرحوم کی یہ تمنّا پُوری نہ ہوسکی اور وہ جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ امسال مَیں نے آپ کی زیارت کے قصد سے پاسپورٹ حاصل کیا ہی تھا کہ آپ کے وصال کی خبر آگئی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ پاک مرحوم کو فردوسِ بریں میں جگہ دے، لغزشوں کو معاف کرے۔ آپ کے اخلاف کو آپ کا سچّا جانشین بنائے اور پُوری مِلّت اسلامیہ کی طرف سے آپ کو بہترین جزاؤں سے نوازے، آمین۔

حضرت مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی

رحمہُ اللہ تعالیٰ

چند واقعات و تأثّرات

مولانا محمد اسحاق بھٹی

سابق مدیرِ "الاعتصام" لاہور

سُرخ و سپید رنگ ، باوقار و پُر جلال چہرہ ، کشادہ پیشانی ، فکر و تدبر کی لکیروں سے مزّین ، ستواں ناک ، تیز آنکھیں ذہانت و فطانت کی غمّاز ، سفید براق سی خوبصورت ڈاڑھی معتدل جسم ، میانہ قد ، گرجدار اور بارُعب آواز ، گفتار و کردار میں جلال و جمال کا حسین امتزاج ، متانت و سنجیدگی کا پیکرِ دل نواز ، چال میں تمکنت ، گفتگو میں اعتدال ، رائے میں توازن ، صاف ستھرے لباس میں تن پوش ، وقت کے پابند ، قاعدہ و ضابطہ میں بندھے ہُوئے ، تکلّفات سے پاک ، تصنّع سے نفور ، دوستوں کے ہمدرد ، ساتھیوں کے خیر خواہ ، چھوٹوں پر دستِ شفقت رکھنے والے ، علماء کے قدر دان ، بزرگانِ دین سے محبّت اور تعلقِ خاطر میں بے مثل ، علم و فضل میں یکتا ، فکر و دانش میں بے نظیر ، تحقیق و کاوش میں منفرد ، فہمِ مسائل میں یگانہ اور ان کی تعبیر میں درجۂ ممتاز پر فائز ، وظائف و اوراد کے خوگر ، آزادئ وطن کے قائد ، سیاسیات کے نبّاض اور اس کے نشیب و فراز پر نگاہِ عمیق رکھنے والے ، عالمانہ وقار ، صوفیانہ عادات ، بزرگانہ اطوار ، شاہانہ مزاج ، بہادرانہ خصال ، مجاہدانہ کردار ، شجاعانہ یلغار — یہ تھے حضرت مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

مولانا کی پہلی تقریر جو مَیں نے سُنی

مولانا داؤد غزنویؒ کی تقریر سُننے کی سعادت پہلی دفعہ مجھے ۱۹۳۷ء یا ۱۹۳۸ء میں حاصل

ہوئی۔ اُن دنوں میری عمر تیرہ چودہ سال تھی۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو ضلع فیروز پور کی جماعت اہلِ حدیث نے مولانا محمد علی لکھوی (مدنی) کے اہتمام و انصرام میں ایک بہت بڑی کانفرنس کے انعقاد کا انتظام کیا۔ مولانا غزنویؒ اس کانفرنس کے صدر تھے۔ مجھے یاد ہے مولانا غزنویؒ لاہور سے بذریعہ موٹر کار فیروز پور تشریف لے گئے تھے۔ جونہی وہ پنڈال میں داخل ہوئے فضا نعروں سے گونج اُٹھی اور لوگ عقیدت و مسرّت کے جذبات سے ان کی طرف دوڑے۔ مولانا نے عشاء کی نماز کے بعد بہت بڑے اجتماع میں تحریری خطبۂ صدارت پڑھا۔ سامعین نہایت انہماک و توجّہ سے ان کے خیالات و افکار سُن رہے تھے۔ یہ بات اب تک میرے ذہن میں محفوظ ہے کہ اُنھوں نے اپنے خطبے میں علمی و سیاسی اعتبار سے فیروز پور کی بعض معروف شخصیتوں کا ذکر کیا تھا، جن میں سے بعض وفات پا چکے تھے۔ اس کے علاوہ مسئلہ فلسطین، اسلامی ممالک کی رفتارِ سیاست اور انگریز کی اس سے دلچسپی کی وجوہ، بین الاقوامی حالات، مُلک کی تحریکِ حُرّیت، اس کے سیاسی کوائف، برطانوی حکومت کے ظلم و استبداد کے واقعات، اس برّ عظیم میں علمائے کرام اور زعمائے اہلِ حدیث کی انگریز دشمن سرگرمیوں کی تفصیلات بیان کی تھیں اور لوگ کامل توجّہ اور غور سے ان کے افکارِ عالیہ سے مستفید ہو رہے تھے۔ اگرچہ ان کی باتیں میرے فہم و شعور کی گرفت میں نہیں آسکیں، مگر میں اس پر بہت ہی خوش تھا کہ مَیں نے اتنے بڑے آدمی کی تقریر سُنی اور ان کو دیکھا۔

زیارت کا دُوسرا موقع

مولانا غزنویؒ کی زیارت کا دُوسرا موقع ۱۹۳۹ء میں ملا۔ جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ لاہور تشریف لائے۔ اخبارات میں اعلان ہوا کہ وہ دہلی دروازے کے باہر جلسۂ عام سے خطاب کریں گے۔ مجھے ان کو دیکھنے اور ان کی تقریر سُننے کا بے حد شوق تھا۔ لاہور آیا، جلسہ گاہ میں پہنچا تو بہت ہجوم تھا۔ مولانا ابھی جلسہ گاہ میں نہیں آئے تھے۔

مجمع دُور تک پھیلا ہوا تھا اور بڑا شور تھا۔ مَیں سٹیج کے بالکل قریب تھا۔ اتنے میں سُرخ و سفید رنگ کے ایک صاحب نہایت صاف ستھرے کھدّر کا لباس پہنے، سفید عمامہ باندھے ہوئے، بہت وجیہہ اور بارُعب سٹیج پر نمودار ہوئے۔ لوگوں نے کہا: "مولانا ابوالکلام آگئے۔" وہ مولانا داؤد غزنویؒ تھے۔ اس موقع پر انہوں نے جو الفاظ کہے، وہ اب تک میرے کانوں میں گُونج رہے ہیں:

"حضرات! مجھے معلوم ہے، آپ امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تقریر سُننے کے لیے بے تاب ہیں اور آپ کی یہ بیتابی اور جوش و خروش بالکل صحیح ہے۔ چند منٹ میں مولانا تشریف لا رہے ہیں۔ آپ خاموشی سے مولانا کی تقریر سُنیے گا۔ اگر آپ نے خاموشی اختیار نہ کی تو مولانا کے افکارِ عالیہ سے مستفید نہیں ہو سکیں گے۔" اتنے میں مولانا ابوالکلامؒ تشریف لائے، مولانا نے آگے بڑھ کر اُن کا استقبال کیا۔ دونوں بُزرگ ایک ساتھ کرسیوں پر تشریف فرما ہوئے۔ فضا میں نعروں کی آوازیں بُلند ہوئیں۔ مولانا داؤد غزنویؒ نے کھڑے ہو کر دوبارہ لوگوں کو خاموش رہنے کی تلقین کی۔

جمیعتہ علمائے ہند کا اجلاسِ لاہور

غالباً ۱۹۴۲ء کے مارچ میں جمیعتہ علمائے ہند کا سالانہ اجلاس لاہور میں مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ مولانا سیّد داؤد غزنویؒ صدرِ استقبالیہ تھے۔ مولانا نے کثیر تعداد میں علماء و زُعما کو دعوت نامے بھیجے۔ ہمارے علاقے کے بھی بہت سے لوگوں کو دعوتِ شرکت دی گئی تھی۔ دعوت نامے پر مولانا کی دستخطی مُہر ثبت تھی جس میں "داؤد غزنوی" کے الفاظ نقش تھے۔ لوگوں کے ساتھ میں بھی لاہور آیا۔ اس میں ایک عجیب واقعہ یا حادثہ پیش آیا جس کی مختصر الفاظ میں تفصیل یہ ہے کہ مولانا حسین احمدؒ کے خطبۂ صدارت کے بعض الفاظ پر پنڈال میں اچانک مخالفانہ نعرے بلند ہونے لگے۔ مولانا مدنیؒ متین اور دھیمے انداز

کے بزرگ تھے۔ انہوں نے نعرے لگانے والوں سے خاموش رہنے کی اپیل کی، مگر یہ سلسلہ بند نہ ہوا۔ مولانا داؤد غزنویؒ صدرِ استقبالیہ کی حیثیت سے سٹیج پر تشریف فرما تھے۔ وہ کھڑے ہوئے اور مولانا مدنیؒ سے اجازت لے کر مخالفانہ نعرے لگانے والوں سے کہا:

"حضرات! خاموش ہو جائیے۔ مولانا کا خطبہ اطمینان سے سُنیے۔ اگر اس میں آپ کے نزدیک کوئی اعتراض کی بات ہے تو بعد میں بیان کیجیے گا۔ آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے گی" لیکن اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ مخالفین میں پنجاب کے مشہور مسلم لیگی لیڈر عبدالباری مرحوم بھی شامل تھے۔ جب کوئی اپیل کارگر نہ ہوئی، تو مولانا غزنویؒ نے پورے رُعب و جلال کے ساتھ اعلان کیا:

"مَیں کہتا ہُوں آپ خاموش ہو جائیے۔ اگر آپ خاموش نہیں ہوں گے تو آپ کو خاموش کرا دیا جائے گا۔"

گھڑی دیکھ کر کہا: "مَیں آپ کو پانچ منٹ کی مُہلت دیتا ہُوں۔" وقت گزرنے لگا اور مولانا نے کہنا شروع کیا: "دیکھیے اب چار منٹ باقی رہ گئے ہیں، تین منٹ باقی رہ گئے ہیں، دو منٹ باقی رہ گئے ہیں۔ ہر منٹ گزر جانے کے بعد یہی اعلان کرتے جاتے۔ جب ایک منٹ باقی رہ گیا۔ تو کہا: "دیکھیے اب ایک منٹ باقی رہ گیا ہے۔" جب ایک منٹ بھی ہنگامے کی نذر ہو گیا، تو رضا کاروں سے مخاطب ہُوئے:

"والنٹیرز تیار ہو جاؤ اور انہیں خاموش کرا دو۔" اکثریت احرار رضا کاروں پر مشتمل تھی۔ اُنہوں نے اس تیزی اور مستعدی سے تعمیلِ حکم کی۔ دس منٹ کے اندر اندر جلسے میں بالکل امن تھا۔

یہ قصّہ خود مولانا بھی بیان کیا کرتے تھے اور اس میں ایک ایسا واقعہ بھی پیش آیا جس کا ذکر زبانِ قلم پر لانا مناسب نہیں۔ اس کا تعلق ایک مشہور لیڈر سے ہے جو وفات پا چکے ہیں۔ اس وقت وہ مولانا کے مخالف تھے، لیکن بعد میں بہت بڑے دوست

بن گئے تھے۔

آل مُسلم پارٹیز کانفرنس

۱۹۴۵ء میں دُوسری جنگِ عظیم ختم ہُوئی تو برطانوی حکومت نے ہندوستان کے سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا اور آزادیٔ وطن کے مسئلہ پر گفتگو شروع ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد مُلک میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا۔ سیاسی جماعتیں میدان میں اُتر آئیں۔ ۱۹۴۶ء کے مارچ میں جمعیۃ علمائے ہند نے (اپنے دفتر واقع گلی قاسم جان دہلی میں) انتخاب کے سلسلے میں آئندہ لائحہ عمل طے کرنے کے لیے (مُسلم لیگ کو چھوڑ کر) تمام مسلمان سیاسی جماعتوں کا اجلاس بُلایا۔ اس اجلاس میں مُلک کے مشہور مُسلم زعماء نے شرکت کی، جن میں مولانا حُسین احمد مدنیؒ، مولانا مُفتی کفایت اللہؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ، پروفیسر ہمایوں کبیر (جو بعد میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کے سیکرٹری مقرر ہوئے) مولوی فضل الحق، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، خواجہ عبدالمجید (سابق چانسلر مُسلم یُونیورسٹی علی گڑھ) مولانا محمد میاں، مولا بخش سومرو، مولانا عبدالمجید سوہدروی مرحوم، مولانا عطاء اللہ حنیف وغیرہ بے شمار حضرات شریک ہُوئے۔ میں بھی اس اجلاس میں شریک تھا۔ اجلاس مولانا حسین احمد مدنیؒ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یہ جمعیت کے صدر تھے اور مولانا سید داؤد غزنویؒ اس زمانے میں جمعیتِ عُلمائے ہند کے نائب صدر تھے۔ اجلاس شروع ہُوا تو مولانا غزنویؒ دہلی نہیں پہنچے تھے۔ مَیں نے دیکھا کہ ان کا شدید انتظار ہو رہا ہے اور بار بار مولانا مدنیؒ اور دیگر حضرات ایک دُوسرے سے بے تابی کے عالم میں پُوچھتے تھے کہ مولانا داؤد غزنویؒ نہیں آئے؟ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بغیر تمام فیصلے ادھورے پڑے ہیں۔ دُوسرے روز مولانا غزنویؒ تشریف لائے۔ سب حضرات ان کے استقبال کو آگے بڑھے۔ مولانا نے تاخیر سے پہنچنے پر معذرت کی۔ ان کے آتے ہی مولانا مدنیؒ نے اپنی مسند چھوڑ دی اور مولانا سے اجلاس کی مسندِ صدارت پر تشریف لانے کی درخواست کی۔ یہ سارا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے ابھی گھوم رہا ہے۔

تین روز اجلاس جاری رہا اور تمام قراردادیں اور کارروائی مولانا لکھواتے رہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی جمعیت کے ناظمِ اعلیٰ تھے۔ وہ بار بار مولانا غزنویؒ کے پاس آتے اور ضروری مشورے لیتے۔ اس اجلاس میں مولانا غزنویؒ ایک مرکزی شخصیت تھے۔ نماز کا وقت آیا تو مولانا مدنیؒ نے مولانا سے امامت کی درخواست کی، مگر انہوں نے مولانا مدنیؒ ہی کی اقتدا میں نماز پڑھنے کو ترجیح دی۔

ایک ریزولیوشن، جس کا عنوان ہے "دردِ سر"

• جمعیت علمائے ہند کے دفتر میں ایک بزرگ صوفی نذیر احمد کاشمیری قیام پذیر تھے۔ یہ اگرچہ اُن دنوں جمعیت کے دفتر میں رہائش رکھتے تھے، مگر افکار و خیالات کے اعتبار سے جمعیت کے سخت مخالف تھے اور اس کا برملا اظہار کرتے تھے۔ یہ اجلاس میں شریک نہیں ہوئے اور دروازے پر بانس کی چارپائی بچھائے بیٹھے رہے۔ شرکائے اجلاس کے سامنے جمعیت سے اشتراک کے مضر پہلوؤں کی نشاندہی کرنا انہوں نے اپنے آپ پر یُوں سمجھیے کہ فرض قرار دے لیا تھا۔ اُنہوں نے چار پانچ صفحات پر مشتمل ایک تحریر مولانا غزنویؒ کو دی اور کہا، یہ ایک ریزولیوشن ہے جو میں اس اجلاس میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے وہ ریزولیوشن لیا، اس کی چند سطریں پڑھیں اور کھڑے ہو کر فرمایا:

"حضرات! صُوفی نذیر احمد صاحب ایک ریزولیوشن پیش کرنا چاہتے ہیں، جس کا عنوان ہے 'دردِ سر'۔"

مولانا نے یہ جملہ کچھ اس انداز سے کہا کہ سب حضرات کھِل کھِلا کر ہنس پڑے اور مولانا مدنیؒ بھی اپنی متانت و جلالتِ قدر کے باوجود ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ صُوفی صاحب بڑبڑاتے ہُوئے باہر نکل گئے اور مولانا اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

پہلا سفر اور اس کے تأثّرات

اب مجھے دفتر میں رہتے اور خدمات انجام دیتے کئی مہینے گزر چکے تھے اور مولانا مجھ پر بہت مہربان تھے۔ ایک روز میرے کمرے میں تشریف لائے اور فرمایا: "مولوی اسحاق! (مجھے ہمیشہ مولوی اسحاق کہہ کر بلاتے تھے) میرے ساتھ ہمارے مریدوں کے ہاں چلیں گے؟" میں نے عرض کیا "آپ ساتھ لے جائیں گے تو میری خوش بختی ہوگی۔" فرمایا: "اچھا تیّار ہو جائیے۔ کل پہلی ٹرین سے واربرٹن جائیں گے اور دوسرے دن وہاں سے فیروز وٹواں چلیں گے۔ یہ میرا اُن کے ساتھ پہلا سفر تھا۔ عام طور پر بڑے آدمیوں کے ساتھ سفر بڑی ہی اذیّت کا باعث ثابت ہوتا ہے۔ وہ اپنے ساتھی کا کوئی خیال نہیں رکھتے اور اس کو صرف اپنا خادم سمجھتے ہیں۔ اس کی ضروریات اور کھانے پینے کا انہیں بالکل کوئی احساس نہیں ہوتا۔ ہم منڈی واربرٹن کے اسٹیشن پر ٹرین سے اُترے تو بہت سے لوگ استقبال کے لیے موجود تھے۔ مولانا نے ٹرین سے اُترتے ہی میرے متعلّق فرمایا: "ہمارے سیکرٹری صاحب کہاں ہیں؟" پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہا:

"آیئے مولوی اسحاق! آگے تشریف لے آیئے۔" اُن کے اِن الفاظ سے استقبال کرنے والے میری طرف لپکے۔ گرمیوں کا موسم تھا، رہائش گاہ پر پہنچے تو غسل کے لیے پانی رکھّا گیا۔ مولانا نے فرمایا پہلے مولوی اسحاق غسل کریں گے، میں بعد میں کروں گا۔ کھانے کے لیے بیٹھے تو بار بار کہتے: یہ بوٹی لیجیے۔ یہ چاول کھایئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ میزبانوں نے بھی ہر موقع پر میرا پورا خیال رکھّا۔

دُوسرے روز فیروز وٹواں سے لوگ گھوڑے لے کر آئے۔ (اس زمانے میں واربرٹن سے فیروز وٹواں تک سڑک تعمیر نہیں ہوئی تھی) گھوڑوں پر سوار ہونے لگے تو فرمایا: ہمارے سیکرٹری صاحب جوان ہیں، اِن کو اچھے گھوڑے پر سوار کرائیں۔ گاؤں میں پہنچے تو وہاں بھی میرا پُورا خیال رکھّا۔ اس لیے وہاں کے لوگ مجھ سے اِس طرح پیش آئے کہ مجھے شرم محسوس ہونے لگی۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں، اس قسم کے معاملات سے کسی شخص کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

عقیدت کی وجہ

فیروز وٹواں میں ہمارے اصل میزبان ملک احمد نمبردار تھے۔ اب وہ خود تو فوت ہو چکے ہیں، لیکن اُن کے بیٹے اور خاندان کے دُوسرے لوگ مولانا کے خاندان سے اسی طرح عقیدت و احترام کے جذبات رکھتے ہیں۔ ملک احمد بوڑھے آدمی تھے، دراز قامت اور وجیہہ تھے۔ بڑے نیک تھے۔ وہ حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنویؒ کے مرید تھے۔ دو تین روز ہی میں مجھ سے مانوس ہو گئے تھے۔ مَیں نے باتوں باتوں میں ان سے پُوچھا: آپ اس خاندان کے حلقۂ ارادت میں کیسے آئے؟ اُنھوں نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا:

میں اٹھارہ سال کی عمر کا تھا، مجھے گنٹھیا کا مرض لاحق ہو گیا۔ والد نے بہت علاج کرائے مگر آرام نہیں آیا۔ کسی نے بتایا کہ امرتسر میں ایک بزرگ مولانا عبدالجبار غزنویؒ رہتے ہیں، وہ دُعا کرتے ہیں اور لوگ صحتیاب ہو جاتے ہیں۔ اس زمانے میں گھوڑی کے سوا اس گاؤں سے امرتسر جانے کا کوئی ذریعہ نہ تھا؛ چنانچہ گٹھڑی کی شکل میں والد نے مجھے گھوڑی پر لادا۔ ہم امرتسر مسجد غزنویہ میں پہنچے تو فجر کی جماعت ہو رہی تھی۔ والد نے مجھے اٹھایا اور مسجد کے صحن میں رکھ دیا۔ گھوڑی باہر باندھی اور خود وضو کر کے جماعت میں شریک ہُوئے جو بزرگ امامت کرا رہے تھے وہ اس درد و سوز سے قرآن مجید پڑھ رہے تھے کہ دل ان کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ نماز کے بعد اُنھوں نے میری طرف دیکھا۔ اُدھر والد نے آگے بڑھ کر درخواستِ دُعا کی۔ اُنھوں نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ جیسے جیسے وہ دُعا مانگ رہے تھے یُوں احساس ہوتا تھا جیسے میرے جوڑوں کی بندش کُھل رہی ہے۔ تین دن ہم وہاں رہے اور اللہ کے فضل سے مَیں تندرست ہو کر واپس آیا۔ اب جسمانی حالت کے ساتھ ہماری رُوحانی دُنیا بھی بدل چکی تھی۔ اس کے بعد ہم اُن کے مرید تھے اور وہ ہمارے مُرشد۔

ایک عجیب و غریب واقعہ

حضرت الامام مولانا عبدالجبّار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے قبولیتِ دُعا کے سلسلے کے بہت سے واقعات عوام اور ان کے عقیدت مندوں میں مشہور ہیں۔ اس ضمن کا ایک عجیب و غریب واقعہ مولانا داؤد غزنویؒ نے بھی اور ایک مدراسی بزرگ عزیز اللہ صاحب (گھڑی ساز) نے بھی بیان کیا۔

عزیز اللہ صاحب ۱۹۵۸ء میں اپنے عزیزوں سے مُلاقات کے لیے مدراس سے کراچی آئے۔ کراچی سے لاہور آئے۔ اس سفر کا مقصد محض مولانا داؤد غزنویؒ اور ارکانِ جماعت سے مُلاقات تھا۔ وہ "الاعتصام" کے خریدار تھے۔ سیدھے دفتر میں آئے، اپنا نام اور پتہ بتایا۔ مَیں ان کے نام سے واقف تھا۔ بحیثیت مدیر الاعتصام وہ مُجھ سے آشنا تھے۔ مَیں نے ان کو اعزاز سے بٹھایا اور مدراسی ہونے کی وجہ سے کھانے کے لیے مچھلی پیش کی۔ مولانا اس روز لاہور سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ مَیں نے مولانا کے ساتھ ان کی عقیدت کی وجہ پُوچھی، تو اُنھوں نے بتایا کہ ایک عرصہ ہوا مدراس سے دو آدمی چمڑے کی تجارت کے لیے امرتسر آئے ان کے ساتھ ایک مدراسی ملازم بھی تھا جس کا نام اسماعیل تھا۔ اسماعیل فجر کی نماز روزانہ حضرت الامام مولانا عبدالجبّار غزنویؒ کی اقتدا و امامت میں ادا کرتا۔ ایک روز اُنھوں نے پُوچھا: "تم کون ہو؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟ اور یہاں کیا کام کرتے ہو؟"

اُس نے جواب دیا: میرا نام اسماعیل ہے، مدراس کا رہنے والا ہوں اور دو مدراسی سیٹھوں کے ساتھ ملازم کی حیثیت سے یہاں آیا ہوں۔ اس کی یہ بات سُن کر امام صاحب نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ عزیز اللہ نے اور اس کے بعد مولانا داؤد غزنویؒ نے بتایا کہ اسماعیل کہا کرتا تھا۔ امام صاحب دُعا مانگ رہے تھے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ گویا دولت میری جھولی میں گر رہی ہے۔ نماز و دُعا کے بعد وہ واپس گھر گیا تو سیٹھوں

نے کہا: اسماعیل! تُم بہت عرصے سے ہمارے ساتھ ہو، ہم نے تُم کو دیانت دار، محنتی اور امین پایا ہے۔ لہٰذا ہم نے آج سے تمہیں اپنے کاروبار میں شریک کر لیا ہے اور تمہارا ایک خاص حصّہ مقرر کر دیا ہے۔ اپنے حصّے کی رقم تُم نقد ادا نہیں کرو گے، بلکہ تمہارے حصّے کے منافع سے وضع ہوتی رہے گی۔ اس کے بعد چند مہینوں میں وہ اس درجہ امیر ہو گیا کہ اسماعیل سے کاکا اسماعیل بن گیا۔ کاکا مدراس کی زبان میں سیٹھ کو کہتے ہیں۔

کاکا اسماعیل نہایت نیک آدمی تھے۔ اُنہوں نے صُوبہ مدراس کے ضلع ارکاٹ میں کئی ایکڑ زمین خریدی، اس کو آباد کیا اور اس کا نام محمد آباد رکھّا۔ وہاں ایک بہت بڑا اسلامی دارالعلوم قائم کیا جو اب تک کامیابی سے چل رہا ہے اور ہندوستان کے مشہور اسلامی مدارس میں سے ہے۔ مولانا نے بتایا کہ اس دارالعلوم کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد میں مجھے باقاعدہ دعوتِ شرکت دی جاتی تھی۔ میں جاتا تو کاکا اسماعیل اور ان کے خاندان کے لوگ انتہائی احترام سے پیش آتے اور یہ واقعہ ضرور بیان کرتے۔

ننگے سر نماز

ننگے سر نماز پڑھنا مولانا کو ناگوار گزرتا تھا۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ ایک مرتبہ مسجد چینیاں والی میں بیٹھے تھے کہ ملک محمد رفیق جو اُن کے پُرانے عقیدت مند اور حلقۂ مسجد چینیاں والی کے رہنے والے تھے، ان کی موجودگی میں مسجد میں آئے اور ننگے سر نماز پڑھنے لگے۔ جب وہ نماز سے فارغ ہُوئے، تو اُن کو بُلایا اور فرمایا: "ملک صاحب! ایک بات عرض کروں؟" انہوں نے کہا: مولانا فرمایئے۔ کیا ارشاد ہے۔" کہا: "ننگے سر نماز نہ پڑھا کریں۔"

جمعِ تقدیم اور جمعِ تاخیر

نماز میں جمعِ تقدیم کے بھی وہ قائل نہ تھے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا اور اس پر انہیں اصرار

تھا کہ جس نماز کا وقت نہیں ہوا، وہ کیوں پڑھی جائے۔ اس سلسلے کا ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے:

ایک مرتبہ تنظیمِ جماعت کے ضمن میں مولانا غزنویؒ، مولانا محمد اسماعیل مرحوم اور مولانا عطاء اللہ حنیف ضلع لاہور کے ایک قصبے موضع کھڈیاں گئے۔ مَیں بھی ساتھ تھا۔ نمازِ جمعہ وہاں پڑھی اور علاقے کے لوگوں کو خطاب کیا۔ وہاں سے چلے تو قصور پہنچے اور نمازِ مغرب قصور کی مسجد اہلِ حدیث میں ادا کی۔ فرض پڑھنے کے بعد مولانا غزنویؒ تو حسبِ معمول وظیفے میں مشغول ہو گئے اور مولانا محمد اسماعیل مرحوم نے عشاء کی نماز پڑھنا شروع کر دی۔ وظیفے کے بعد مولانا نے مولانا محمد اسماعیلؒ صاحب سے پُوچھا "یہ آپ نے مغرب کی نماز کے بعد کیا پڑھا ہے؟" کہا: "نمازِ عشاء" فرمایا "کیوں؟" کہا: "مغرب کے ساتھ عشاء جمع کر لی ہے"

فرمایا: عشاء کا وقت تو ابھی نہیں ہوا۔ آپ نے قبل از وقت نماز کیوں پڑھی؟" لیکن مولانا اسماعیلؒ صاحب ان کا اس درجہ احترام کرتے تھے کہ بجائے اپنے حق میں دلائل دینے کے خاموش ہو گئے۔

آدابِ اکل و شرب

آپ آدابِ اکل و شرب کے بھی بہت پابند تھے۔ فرمایا کرتے تھے کھانے پینے کے کچھ خاص آداب ہیں، ان کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً چلتے پھرتے کھانا یا راستے میں کھڑے ہو کر کھانا سخت معیوب ہے۔ جو لوگ راستہ چلتے کھاتے ہیں، شرعی لحاظ سے ان کی شہادت قبول نہیں۔ کیونکہ یہ غیر مہذب اور غیر ثقہ حرکت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اگر اپنے تعلق والے کسی شخص کو راستے میں ریڑھی یا دکان پر کھڑا کھاتے ہُوئے دیکھتے، تو اس کو سختی سے روک دیتے اور صاف الفاظ میں کہتے:

"یہ حرکت تہذیب و ثقاہت اور متانت و سنجیدگی کے منافی ہے۔ یہ معقول آدمیوں کا شیوہ نہیں۔"

عُمدہ لباس

بہترین لباس زیب تن کرتے اور نہایت صاف سُتھرے رہتے۔ میٹنگ میں بالخصوص عُمدہ کپڑوں میں شریک ہوتے۔ مجلس میں بعض حضرات تہبند باندھ کر آتے تو انہیں سخت ناگوار گُزرتا۔ بعض دفعہ گرمیوں کے دنوں میں مولانا محمد اسماعیل مرحوم تہبند باندھ کر تشریف لاتے تو خاموش نہ رہ سکتے۔ ایک دن جمعیتہ اہلِ حدیث کی مجلسِ عاملہ میں مولانا محمد اسماعیل مرحوم تہبند باندھ کر شریک ہُوئے۔ مولانا محی الدّین احمد قصُوری نے کہا:

"جنابِ صدر! اپنے ناظمِ اعلیٰ سے باپردہ لباس کی وضاحت فرمایئے۔"

مولاناؒ نے مولانا محمد اسماعیلؒ کی طرف دیکھا اور فرمایا:

"میں بحیثیتِ امیر حکم دیتا ہُوں کہ آئندہ کوئی رُکنِ مجلس تہبند باندھ کر نہ آئیں شلوار پہن کر میٹنگ میں شریک ہوں۔ بالخصوص ناظمِ اعلیٰ صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ استر لباس شلوار ہے تہبند نہیں۔

ائمہ کرام کا احترام

ائمہ کرام کا ان کے دل میں انتہائی احترام تھا۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اسمِ گرامی بے حد عزّت سے لیتے۔ ایک دن میں ان کی خدمت میں حاضر تھا کہ جماعت اہلِ حدیث کی تنظیم سے متعلّق گفتگو شروع ہوئی۔ بڑے دردناک لہجے میں فرمایا:

"مولوی اسحاق! جماعت اہلِ حدیث کو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رُوحانی بددُعا لے کر بیٹھ گئی ہے۔ ہر شخص اُبو حنیفہ، اُبو حنیفہ کہہ رہا ہے۔ کوئی بہت ہی عزّت کرتا ہے تو امام ابوحنیفہؒ کہہ دیتا ہے۔ پھر اُن کے بارے میں اِن کی تحقیق یہ ہے کہ وہ تین حدیثیں جانتے تھے یا زیادہ سے زیادہ گیارہ۔ اگر کوئی بہت بڑا احسان کرے تو وہ انہیں سترہ حدیثوں کے عالم گردانتا ہے۔ جو لوگ اتنے جلیل القدر امام کے بارے میں یہ نقطہ نظر

رکھتے ہوں، اُن میں اتحاد و یک جہتی کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے۔ یا غربۃ العلم
انما اشکوا بثی و حزنی الی اللہ۔

لوگوں کے کام

مولانا کے پاس بڑے چھوٹے، امیر و غریب اور دیہاتی و شہری بے شمار لوگ آتے اور مختلف کاموں کی تفصیلات بتاتے۔ کسی کو وزیر سے، کسی کو سیکرٹری سے، کسی کو کمشنر اور ڈپٹی کمشنر سے، کسی کو پولیس سے، کسی کو بحالیات کے افسروں سے، کسی کو ہسپتال سے کسی کو کالجوں اور سکولوں سے، کسی کو یونیورسٹی سے۔ غرض لوگ بہت سی ضرورتیں لے کر حاضر ہوتے اور مولانا ہر ایک کے کام کے لیے کوشش کرتے۔ اس سلسلے میں ٹیلیفون پر بھی متعلقہ آدمی سے رابطہ پیدا کرتے اور بعض دفعہ خود بھی تشریف لے جاتے۔ جس شخص سے کسی کے کام کے لیے کہتے پورے زور سے کہتے اور اس کا باقاعدہ تعارف کراتے۔ اگر کام جماعت کے کسی رُکن کا ہوتا تو فرماتے، یہ ہماری جماعت کے آدمی ہیں اور فلاں جگہ کے رہنے والے ہیں۔ ان کا کام ضرور ہونا چاہیے۔ طالب علم کا کام ہوتا تو اس کا تعارف کرانے سے بھی کوئی تکلّف نہ محسوس فرماتے:

"یہ ہمارے مدرسے کا طالب علم ہے۔ یہ بہت پریشان ہے، اس کے کام سے آپ کو اور ہمیں اللہ اجر دے گا۔" اگر کسی دیہاتی اور غریب آدمی کے کام کے لیے جاتے، تو سفارش کا انداز یہ ہوتا:

"یہ غریب آدمی ہے اور گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ اللہ سے ڈر جایئے۔ ان کا کام کیجیے۔ بڑے آدمی رُوپے پیسے اور ذاتی اثر و رسوخ کے زور سے کام کرا لیتے ہیں۔ ان کے پاس نہ رُوپے ہیں نہ اثر و رسوخ۔ ان کے کام کا تعلق اللہ کی رضامندی سے ہے۔ اللہ اِس سے خوش ہو گا۔"

بہر حال ہر ضرورت مند کے کام آتے، ہر شخص کو ہر وقت ملتے، اس کی بات غور سے سنتے اور بڑے سے بڑے آدمی سے بھی کام ہوتا تو اس کو کہنے سے انکار نہ کرتے بلکہ کسی کے کام سے ان کو قلبی راحت ہوتی۔

علمائے کرام کی تکریم

مولانا کی بے شمار خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ علمائے کرام کی بڑی تکریم کرتے اور ان کا نام ادب و احترام سے لیتے۔ "الاعتصام" میں اختلافی اور مسلکی مضامین کی اشاعت کے سلسلے میں تاکید فرماتے کہ اسلوبِ تحریر مثبت ہونا چاہیے۔ کسی کی مخالفت خدمتِ دین نہیں ہے۔ اگر کسی صاحبِ علم کے فکری رجحانات سے عدمِ اتفاق کا اظہار ضروری ہو، تو اس کا نام عزت و احترام سے لیا جائے اور اس کی ذات کو ہدفِ تنقید نہ بنایا جائے، بلکہ دائرۂ بحث فقط اصل مسئلے تک محدود رکھا جائے۔

اپنی اسی خوبی کی بنا پر ان کو علماء کے تمام حلقوں اور فقہی مکاتبِ فکر میں مقبولیت و محبوبیت حاصل تھی۔

"کشفِ قبور"

ان کے رجحاناتِ تصوّف اور میلاناتِ فقہیہ کے بارے میں ان کے احساسات کس درجہ نازک تھے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا احمد علی مرحوم نے مجلسِ ذکر میں کشفِ قبور کے متعلق کچھ تجربات و مشاہدات بیان فرمائے اور کہا کہ قبر میں میّت جن حالات سے دوچار ہو اس کا انہیں مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ میں نے "الاعتصام" میں اس پر ایک شذرہ لکھا اور نہایت ادب سے شرعی نقطۂ نظر کی روشنی میں چند سطور میں مولانا کے نقطۂ نظر سے اظہارِ اختلاف کیا۔

اس سے تیسرے یا چوتھے روز بعد مولانا نے فرمایا:

"ایڈیٹر صاحب! مَیں نے مولانا احمد علیؒ صاحب کے کشفِ قبور کے بارے میں آپ کا ادارتی نوٹ پڑھا۔ آپ یہ فرمایئے اگر مولانا احمد علی صاحب اتنے نیک ہو جائیں کہ انہیں کشفِ قبور ہونے لگے، تو آپ کو کیا اعتراض ہے؟"

اِن چند الفاظ سے میرا مسئلہ حل ہو چکا تھا اور میرے پاس سوائے اس کے کوئی جواب نہ تھا کہ بلا تامّل عرض کر دوں "کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

اعترافِ علمیّت میں فراخدلی

کوئی صاحبِ علم اگرچہ فکر و عقیدہ کے اعتبار سے ان کا مخالف ہی ہو مگر وہ اس کی کھلے دل سے تعریف کرتے۔ اس ضمن کا ایک واقعہ لائقِ تذکرہ ہے۔

مئی ۱۹۵۶ء کی بات ہے، پنجاب یُونیورسٹی کے ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم نے یونیورسٹی کی طرف سے چند اہلِ علم پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی جس کے ذمّے علمی و تاریخی نوعیّت کے اہم اور مُشکل مسائل کو موضوعِ فکر ٹھہرانا اور ان کی عقدہ کشائی کرنا تھا۔ اس کمیٹی کے رُکن مولانا سیّد داؤد غزنویؒ بھی تھے اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم (مؤسس و ڈائریکٹر ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور) بھی۔ اس کمیٹی کے تقرر سے کچھ روز پیشتر پنجاب اسمبلی میں مولانا نے خلیفہ صاحب مرحوم پر سخت اعتراضات کیے تھے اور ان کے افکار و رجحانات کو ہدفِ تنقید بنایا تھا۔ یہ تقریر اخبارات میں شائع ہُوئی تو خلیفہ صاحب مرحوم کو یہ سخت ناگوار گزری تھی۔

خلیفہ صاحب، مولانا کو صرف ایک سیاسی شخصیّت سمجھتے تھے اور ان کے علم و فضل سے واقف نہ تھے۔ ادھر مولانا بھی خلیفہ صاحب کے بارے میں اچھی رائے نہ رکھتے تھے اور ان کو ذی علم شخص نہ مانتے تھے، لیکن جب اس کمیٹی کی پہلی میٹنگ ہُوئی اور دونوں کے درمیان بعض علمی مباحث میں پنجہ آزمائی کی نوبت پہنچی تو دونوں ایک دُوسرے کے مدّاح

اور علمیت کے معترف ہو گئے۔ ایک بجے دوپہر کا عمل تھا۔ میں دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے بڑے دروازے میں کھڑا تھا کہ سامنے سیاہ رنگ کی موٹر کار آ کر رُکی۔ اسے سُرخ و سفید رنگ اور مضبوط جسم کے ایک صاحب چلا رہے تھے، جنہوں نے سُوٹ پہن رکھّا تھا۔ مولانا فرنٹ سیٹ پر تشریف فرما تھے۔ وہ صاحب جلدی سے موٹر کار سے نیچے اُترے۔ مولانا کی طرف سے کھڑکی کھولی اور نہایت ادب سے انہیں اُتارا۔ دروازے تک چھوڑنے آئے اور پھر پورے احترام سے سلام کر کے موٹر میں بیٹھے اور چلے گئے۔ مولانا مجھے اپنے کمرے میں لے گئے اور فرمایا:

"معلوم ہے یہ کون تھے؟"

عرض کیا: "جی نہیں۔"

فرمایا: یہ خلیفہ عبدالحکیم تھے۔ مَیں نے تو آج پہلی مرتبہ ان کو کسی علمی و تحقیقی مجلس میں بحث و مذاکرہ میں حصّہ لیتے دیکھا ہے۔ یہ تو بہت معلومات کے حامل ہیں اور ان کا دائرہ علم بڑا وسیع ہے۔"

اِسی طرح شام کی مُلاقات میں مولانا محمد حنیف ندوی نے بتایا کہ خلیفہ صاحب، مولانا داؤد غزنوی کی علمی رسائی، درکِ مسائل اور وسعتِ مطالعہ میں رطب اللّسان ہیں اور افسوس کرتے ہیں کہ وہ اب تک ان سے علمی استفادہ سے محروم رہے۔

مولانا ابوالکلامؒ سے تعلّقات

مولانا داؤد غزنویؒ، مولانا ابوالکلام سے بڑے گہرے اور مخلصانہ مراسم رکھتے تھے۔ اس کا اظہار وہ کسی نہ کسی انداز سے اکثر کیا کرتے تھے۔ ۱۹۵۱ء کے صُوبائی انتخاب میں مسلم لیگ اور عوامی لیگ کے درمیان سخت مقابلہ تھا۔ حُسین شہید سہروردی، مولانا داؤد غزنوی، میاں عبدالباری اور نواب افتخار حُسین خاں آف ممدوٹ پنجاب میں عوامی لیگ کے سرگرم رہنما تھے اور صوبہ

سرحد میں پیرِ صاحب مانکی پیش پیش تھے۔ مولانا داؤد غزنویؒ حلقہ تحصیل چُونیاں کی مہاجر سیٹ سے صُوبائی اسمبلی کے لیے انتخاب لڑ رہے تھے۔ اس اثنا میں مجھے مولانا کے ساتھ سفر کرنے، ان کو قریب سے دیکھنے اور مختلف لوگوں سے مِلنے کا موقع ملا۔

ایک دن ہم دونوں باتوں میں جو مصروف ہُوئے، تو رات کے دو بج گئے۔ اثنائے گفتگو میں مَیں نے ان کی گزشتہ سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں سوالات کرنے شروع کر دیے۔ مجلسِ احرار کو چھوڑ کر کانگریس میں اور پھر کانگریس سے مسلم لیگ میں آنے کی وجہ پُوچھی۔ مولانا بہت مُوڈ میں تھے۔ کہنے لگے:

"جتنا عرصہ میں مجلسِ احرار میں رہا، ذہنی طور پر بہت پریشان رہا کیونکہ مجلس احرار نہ پُوری طرح کانگریس کی مؤیّد تھی نہ مُسلم لیگ کی۔ کانگریس سے بھی اس کو کچھ شکایات تھیں اور مسلم لیگ سے بھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ نہ کانگریس والے اس پر اعتماد کرتے تھے اور نہ مسلم لیگ والے۔ مَیں اس صُورتِ حال سے پریشان تھا۔ مَیں ذہنی طور سے کانگریس کی طرف مائل تھا۔ میرے لیے سیاسی اعتبار سے وہ دَور بڑا کٹھن تھا۔ اور میری کیفیت لا یموت فیھا ولا یحییٰ کی سی تھی اور مَیں اپنے رفقائے احرار سے اکثر یہ تذکرہ کرتا تھا۔ بالآخر مَیں نے احرار سے نکل کر کانگریس میں شمولیت کا فیصلہ کر لیا۔"

کانگریس سے وہ ۱۹۴۶ء میں الگ ہُوئے۔ اس سلسلے میں بڑی تفصیلات بیان کیں جو مجھے اب بھی یاد ہیں۔ اُنہوں نے یہ بھی بتایا کہ میں کانگریس کو چھوڑ کر مُسلم لیگ میں شامل ہونے کے بعد پہلی دفعہ دہلی میں مولانا ابوالکلامؒ سے ملنے گیا، تو اُن کے چہرے اور اندازِ مُلاقات سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مُجھ سے ناراض ہیں۔ اُنہوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا، مگر اس میں وہ پہلے کا سا معاملہ نہ تھا۔ پھر عام ملاقاتیوں کے کمرے میں مُلاقات کی حالانکہ اس سے پہلے وہ اپنے خاص کمرے میں لے جا کر مُجھ سے کئی قسم کی سیاسی اور علمی باتیں کیا کرتے، نئی کتابوں کا تذکرہ ہوتا، مگر یہ مُلاقات ان سب چیزوں سے خالی تھی۔

میں وجہِ ناراضی سمجھ رہا تھا۔ لہٰذا چند منٹ بعد رخصت لے کر چلا گیا۔ گھر جا کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ ان کو ایک مفصّل خط لکھّا جس میں کانگریس سے نکلنے اور مُسلم لیگ میں شامل ہونے کی وجوہ بیان کیں۔ اس لیے کہ خود میں بھی مولانا کے اس تنغُّض سے بہت متاثّر اور پریشان تھا۔ یہ خط میں نے مُلازم کے ہاتھ مولانا کو بھیجا اور دُوسرے دن آنے کا وقت بھی اس میں لکھ دیا؛ چنانچہ وقتِ مقررّہ پر دُوسرے روز گیا، تو پہلے کی طرح تپاک سے ملے۔ بہت خوش ہُوئے اور مختلف عنوانات پر باتیں کیں۔ سیاسیات سے متعلّق خود اُنہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ مَیں نے کُچھ کہنا چاہا، تو فرمایا:

"اگر آپ مجُھ سے مشورہ کر لیتے تو مَیں آپ کو کانگریس سے مستعفی ہونے اور مُسلم لیگ میں شامل ہونے کا ایسا ذریعہ بتاتا کہ جس سے کسی کو کوئی گلہ نہ ہوتا۔"

پھر فرمایا: "مَیں نے کانگریس کو چھوڑ کر جو سب سے بڑی قُربانی دی، وہ مولانا ابو الکلامؒ سے قطعِ تعلّق ہے اور مجھے اس کا بہت احساس ہے۔" ساتھ ہی کہا: "سیاسیات میں کوئی شئے قطعی نہیں ہے۔ یہ جامد نہیں ہے کہ اپنی جگہ سے ہِل نہ سکتی ہو۔ اس میں حالات کے مطابق تغیّر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔"

مولانا ابو الکلامؒ کے علم و فضل، کتابوں سے بے پناہ دلچسپی اور کثرتِ مطالعہ کے بارے میں گفتگو کرتے ہُوئے ایک دن فرمایا کہ وہ کسی سلسلے میں پنجاب تشریف لاتے یا میں اُن سے ملتا، تو یہ ضرور پُوچھتے کہ کوئی نئی کتاب آئی ہے اور آپ کے پاس ہے۔ ایک دفعہ امرتسر ایک میٹنگ میں آئے، تو فرمایا: "میٹنگ سے فارغ ہو کر آپ کے کُتب خانے کی سیر کرنے کا خیال ہے۔" چنانچہ میرے مکان پر گئے اور کُتب خانہ دیکھ کر بہت خوش ہُوئے اور اُن کی جلد بندی اور ترتیب پر دل کھول کر داد دی۔

مولانا غزنویؒ نے فقہ حنبلی سے متعلق ایک کتاب کا نام لیا[1]، جو میرے ذہن میں نہیں رہا کہ وہ پُورے ہندوستان میں کسی کے پاس نہ تھی اور چند روز بیشتر میں نے مصر سے

---

[1] یہ کتاب طبقات الحنابلہ تھی۔ (مرتّب)

منگوائی تھی۔ مولانا نے دیکھی، تو اسے الگ کر لیا، بہت خوش ہوئے اور کہا اسے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ چند روز میں واپس آجائے گی۔

مولانا آزادؒ کے بارے میں اُن کا سلسلۂ کلام عام طور پر طویل بلکہ طویل تر ہو جاتا تھا۔ ۱۹۵۷ء میں ہندوستان گئے، تو واپس آکر بتایا کہ پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ میں پارلیمنٹ ہال میں پہنچ گیا۔ مولانا کو اطلاع بھجوائی تو کارروائی چھوڑ کر باہر آئے، بڑی شفقت اور محبّت سے ملے، اپنے کمرے میں لے گئے اور دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا ابوالکلامؒ کی خبرِ وفات پہنچی تو بہت مغموم ہوئے۔ "الاعتصام" میں خود ایک مضمون لکھّا، غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھائی اور بہت حزن و ملال کا اظہار کیا۔

"داؤد غزنویؒ اور محمود غزنوی"

ستمبر ۱۹۴۵ء میں جنگِ عظیم ختم ہوئی اور حکومت برطانیہ نے آزادئ ملک کے سلسلے میں مختلف سیاسی جماعتوں سے بات چیت شروع کی اور پھر عام انتخابات کے لیے سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ یہ دَور ملکی سیاسیات میں بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ آل انڈیا کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلامؒ تھے اور پنجاب کانگریس کے صدر مولانا داؤد غزنوی۔ اور دونوں ظاہر ہے بڑے زوردار لیڈر تھے۔ مجھے یاد ہے، اکالی دَل کے لیڈر ماسٹر تارا سنگھ، مولانا داؤد غزنوی کے ایک بیان سے بہت جھنجلائے اور جواب میں کہا کہ اس ملک کی کانگریس کی سیاست پر دو مولانا قابض ہیں۔ ایک نے پورے ہندوستان کی کانگریس پر قبضہ کر رکھا ہے اور ایک نے پنجاب کی کانگریس پر! پنجاب کانگریس کے صدر داؤد غزنویؒ، محمود غزنوی سے تعلق رکھتے ہیں جس نے پورے ہندوستان کو فتح کر لیا تھا۔ اب داؤد غزنویؒ نے سیاسی طور پر ہندو سکھ سب کو اپنا مطیع بنا لیا ہے۔

وسعتِ قلب

مولانا غزنویؒ کی عظیم خصوصیت یہ تھی کہ اُن کا ظرف بہت وسیع تھا۔ انتہائی وسعتِ قلب

کے مالک تھے اور ایک خاص مسلکِ فقہ کے پابند ہونے کے باوجود تعصبات سے اُن کا دل بالکل صاف تھا۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عیدین کی نماز ہمیشہ ان کی اقتدا میں ادا فرماتے حالانکہ خود اُن کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ پھر نہ صرف مولانا غزنویؒ کی موجودگی میں بلکہ ان کی غیر حاضری اور زمانۂ اسارت میں بھی انہوں نے اپنے پورے حلقۂ ارادت کے ساتھ منٹو پارک میں عیدین کی نماز پڑھی اور صفِ اوّل میں بیٹھے۔

مولانا احمد علیؒ سے ان کے تعلقات بہت گہرے تھے اور یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کی انتہائی تکریم کرتے۔ مشترکہ معاملات اور اسلام اور مسلمانوں کے عام مفاد کا کوئی مسئلہ سامنے آتا، تو مولانا غزنویؒ یا تو خود ان کی خدمت میں تشریف لے جاتے یا ٹیلیفون پر رابطہ پیدا کرتے۔

مولانا احمد علیؒ مرحوم کی وفات کی اطلاع ملی، تو مولانا نے نہایت حزن و ملال کا اظہار کیا اور فرمایا آج دین کا ایک ستون گر گیا ہے اور میرے قریبی رفقاء میں ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکے گا۔ ساتھ ہی فرمایا: اب ہم بھی چند روز کے مہمان ہیں اور آہستہ آہستہ یہ دَور ختم ہو جائے گا۔

مولانا احمد علیؒ کے جنازے پر آئے تو یہ عاجز ان کے ہمراہ تھا۔ راستے میں انہی کی زندگی کے واقعات بیان کر کے روتے رہے۔

مولانا مُفتی محمد حسنؒ

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مکتبِ فکر سے متعلق حضرات سے بھی ان کے بہت مراسم تھے بالخصوص مولانا تھانویؒ کے خلیفۂ خاص مولانا مُفتی محمد حسن مرحوم سے قلبی لگاؤ تھا۔ مُفتی صاحب مرحوم ایک ٹانگ سے معذور تھے، اس لیے ان کو گھر سے باہر نکلنے میں مشکل پیش آتی تھی، لیکن وہ اپنی اس معذوری کے باوجود مولانا کے پاس آتے اور دونوں کے درمیان خاصی دیر تصوّف اور دیگر مسائل پر سلسلۂ گفتگو جاری رہتا۔

مولانا تو نمازِ عصر کے بعد ہفتے عشرے میں ایک دو مرتبہ بالعموم ان کے ہاں تشریف لے جاتے۔ مُفتی صاحب کا بھی اصل موضوع تصوّف تھا اور مولانا کا بھی۔ یہ دونوں بزرگ اکثر اسی موضوع سے متعلق گفتگو فرماتے تھے۔

مولانا سیّد ابوالحسنات مرحوم

مولانا سیّد ابوالحسنات مرحوم' بریلوی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے، لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے مسلکی تعصّبات سے ان کا دل صاف تھا۔ تحریکِ ختمِ نبوّت کے زمانے میں مولانا کی وساطت سے ان کو کسی حد تک قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ نماز کا وقت آتا، تو مولانا ان سے امامت کے لیے اصرار کرتے اور وہ مولانا سے۔

مجھے کئی دفعہ مولانا کے پیغام بر کی حیثیت سے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ وہ ان کا ذکر بہترین الفاظ سے کرتے۔

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

بہت سے مسائل کی تعبیر میں اختلاف رائے کے باوجود مولانا غزنویؒ، مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کا احترام کرتے اور مجموعی اعتبار سے ان کی خدمات کو سراہتے اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ خود مولانا مودودی مشترکہ اسلامی معاملات میں ان سے مشورہ کرتے اور ان کی رائے کو اہمیّت دیتے۔ ایک معاملہ تو ایسا پیش آیا کہ مولانا غزنویؒ بار بار اس کا ذکر کرتے اور مولانا مودودی کو دُعا دیتے تھے۔ وہ یہ کہ ۱۹۶۲ء میں حج کے موقع پر شاہ سعود مرحوم نے مدینہ یونیورسٹی کے زیرِ ترتیب نصاب اور ضروری امور میں مشوروں کے لیے مختلف ممالک کے اہلِ علم کو دعوت دی جس میں پاکستان سے مولانا داؤد غزنویؒ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو دعوتِ شرکت دی گئی تھی۔ مدینہ منوّرہ میں ان کے قیام کا انتظام ایک ہوٹل میں کیا گیا تھا۔

مولانا غزنویؒ کی بڑی صاحب زادی بھی ساتھ تھیں۔ ایک دن مولانا کو دل کا دورہ پڑ گیا اور تکلیف بہت زیادہ ہو گئی۔ ان کی صاحبزادی سخت پریشان ہوئیں، کیونکہ ڈاکٹر کو بلانا اُن کے لیے مشکل تھا۔ مولانا مودودی کو معلوم ہُوا تو فوراً تشریف لائے اور ڈاکٹر کو بُلایا۔ دیر تک مولانا کے پاس بیٹھے رہے۔ لڑکی کو تسلّی دی، ضروری دوائیں منگوائیں اور کئی بار مولانا کے پاس آئے۔ واپس آئے تو یہ واقعہ پُوری تفصیل سے مولانا نے مختلف مواقع پر کئی بار بیان فرمایا اور ہر دفعہ مولانا مودودی کا ذکر احترام سے کیا اور اُن کے لیے دُعائے خیر کی۔

لکھوی خاندان سے تعلّقات

لکھوی اور غزنوی خاندان پنجاب کے دو مشہور خاندان ہیں۔ اہلِ حدیث کے علاوہ دوسرے مسالک سے منسلک لوگ بھی ان سے متأثر اور ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہیں۔ ان دو خاندانوں کے اہلِ علم بھی آپس میں بہت ربط و تعلّق اور اُنس و محبت رکھتے ہیں۔ اور یہ سلسلۂ روابط بہت عرصے سے قائم ہے۔ غزنوی خاندان کے بزرگ افغانستان سے تشریف لائے تھے اور لکھوی بزرگ ضلع فیروز پُور (مشرقی پنجاب) کے ایک گاؤں "لکھوکے" سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دو عظیم خاندانوں کے درمیان باہم کس طرح تعارف کی راہیں کُھلیں اور پھر یہ تعارف کیونکر گہرے روابط کے قالب میں ڈھلا، اس کی تفصیل مولانا داؤد غزنویؒ نے راقم الحروف کو ایک سے زائد مرتبہ سُنائی اور ہر مرتبہ یہی فرمایا کہ ہم دونوں لکھوی اور غزنوی خاندان، ایک دوسرے سے بہت ہی قریب ہیں اور ہمارے تعلقات کی بُنیاد خالص دینی اور مسلکی ہے

مولانا نے بتایا کہ حضرت حافظ محمد لکھوی رحمۃ اللہ علیہ پنجاب کے بہت بڑے عالمِ دین بھی تھے اور انتہا درجہ کے نیک اور متقّی بھی۔ ان کے ہاں اولادِ نرینہ نہ تھی۔ اُنہوں نے اللہ سے دُعا مانگی اور عہد کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ انہیں لڑکا عطا فرمائے، تو وہ اس کو اللہ کی راہ

میں وقف کردیں گے۔ اُس سے دُنیا کا کوئی کام نہ لیں گے۔ ان کی دعا قبول ہوئی، اللہ نے ان کو لڑکا عطا فرمایا۔ اس کا نام اُنہوں نے محی الدّین رکھا اور اللہ کی راہ میں وقف کر دیا۔ یہ لڑکا بہت نیک اور پرہیز گار تھا۔ اپنے اس لڑکے کی تعلیم و تربیت کا حافظ محمد صاحب مرحوم نے خاص طور سے اہتمام کیا۔ جب یہ بڑے ہوئے، تو معلوم ہوا کہ غزنی میں ایک بزرگ رہتے ہیں جن کا نام عبداللہ ہے۔ یہ بزرگ نیکی و تدیّن میں مرجع خلائق ہیں اور ہمہ وقت دعوت و ارشاد میں مصروف رہتے ہیں۔ حضرت حافظ صاحب مرحوم نے اپنے بیٹے مولانا محی الدّین رحمۃ اللہ علیہ کو لکھوکے سے حضرت عبداللہ غزنویؒ کی خدمت میں غزنی روانہ کر دیا۔

مولانا یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے تو بات میں زور پیدا کر کے فرماتے:

"اندازہ لگایئے، حافظ محمد صاحب نے مولانا محی الدین کو اس زمانے میں یعنی آج سے تقریباً ایک صدی پیشتر فیروز پور سے غزنی تک کے لیے سو روپے زادِ راہ دیا۔ "سو روپے" کے لفظ پر خصوصیّت سے زور دیتے اور ساتھ ہی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرماتے کہ مولانا محی الدّین اتنے نیک تھے کہ جب وہ غزنی کے قریب پہنچے تو دادا صاحب کو اللہ کی طرف سے بذریعہ الہام معلوم ہو گیا کہ ایک بزرگ ملاقات کے لیے آرہے ہیں؛ چنانچہ وہ ان کے استقبال کے لیے گھر سے باہر نکلے اور جاتے ہوئے گھر میں کہہ گئے کہ پنجاب سے ایک بزرگ آرہے ہیں، ان کے لیے کھانا تیار کرو اور اچھا کھانا تیار کرو۔ (یہ لفظ بھی وہ دو تین بار کہتے، پھر ہنس کر کہتے: —— "اچھا کھانا کیا ہو گا، حلوا پکانے کو کہا ہو گا۔"

مولانا کہا کرتے تھے کہ مولانا محی الدّین دُور سے آتے دکھائی دیے، تو دادا صاحب احترام سے ان کی طرف بڑھے، انہیں گھر لائے، خیر خیریت پُوچھی، کھانا کھلایا اور باتیں کیں۔ ان سے نام پُوچھا، تو جواب دیا۔ "میرا نام محی الدین ہے۔" فرمایا: "اپنا نام عبدالرحمٰن رکھ لیجیے، میرا نام محمد اعظم تھا۔ اس میں عظمت اور بڑائی پائی جاتی ہے، اس لیے مَیں نے اپنا نام عبداللہ

رکھ لیا ہے۔ عبداللہ اور عبدالرحمٰن میں اللہ کے حضور عجز و انکسار پایا جاتا ہے، اسی لیے یہ دونوں نام اللہ کو محبوب ہیں۔ معلوم نہیں آپ احیائے دین کرتے ہیں یا نہیں۔ مگر رحمٰن کے بندے ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں۔" چنانچہ غزنویوں میں وہ محی الدین کے بجائے مولانا عبدالرحمٰن لکھوی کے نام سے مشہور تھے۔ مولانا بھی یہ واقعہ "مولانا عبدالرحمٰن" کہہ کر ہی بیان فرماتے۔

یہ مولانا عبدالرحمٰن یا مولانا محی الدین مولانا محمد علی لکھوی مدنی کے والد اور مولانا محی الدین اور معین الدین کے دادا تھے۔

مولانا عبدالرحمٰن لکھوی غالباً دو مرتبہ غزنی گئے اور حضرت مولانا عبداللہ غزنویؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوئے۔

اسی خاندانی تعلق کی بناء پر مولانا محمد علی لکھوی (نزیل مدینہ منورہ) مدظلہ اور مولانا داؤد غزنویؒ ایک دوسرے سے بہت تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ تو اس کا عملی اظہار اس طرح بھی ہوا کہ مولانا غزنویؒ ایک سیاسی تحریک میں گرفتار ہوئے تو مسجد چینیاں والی میں خطابت و تدریس کے لیے مولانا نے خاص طور پر مولانا محمد علی لکھوی کو تکلیف دی۔

اسی قدیم خاندانی تعلق کی وجہ سے مولانا داؤد غزنوی مرحوم، مولانا معین الدین لکھوی اور ان کے بڑے بھائی مولانا محی الدین لکھوی کو اپنے عزیز گردانتے تھے۔

دارالعلوم کے اساتذۂ کرام

مولانا داؤد غزنویؒ جن حضرات کو خصوصیت سے عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے، ان میں دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے اساتذہ کرام قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا محمد اسحاق صاحب، مولانا حافظ عبدالرشید صاحب اور دیگر حضرات کا عمدہ الفاظ میں ذکر کرتے۔ حافظ عبدالرشید صاحب سے تو قلبی لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ ان کو خاص طور سے بعض مضامین کی تیاری کرائی اور اس کے لیے ان کو ماہانہ وظیفہ بھی دیتے رہے۔

"کیکر کا سایہ"

مولانا میں یہ خوبی تھی کہ جس موضوع سے متعلق بات کرتے اس کی اس انداز سے تشریح فرماتے کہ اصل چیز آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ میں مولانا کے پاس بیٹھا تھا کہ دارالعلوم کے چند طلبا آئے۔ مولانا نے فرمایا: "کیسے مولوی صاحبان! کس طرح تشریف لائے؟" انہوں نے آہنگی سے کہا: "دو ہفتوں کی چھٹیوں کی درخواست ہے۔" فرمایا: "کیوں؟"

کہا: "اس لیے کہ گرمی بہت پڑ رہی ہے۔ ہم اپنے اپنے گاؤں میں جانا چاہتے ہیں۔"

فرمایا: یہاں گرمیوں کے لیے تمام انتظامات موجود ہیں۔ ٹھنڈا پانی ہے، نہانے کا انتظام ہے، بجلی کے پنکھے ہیں، کھلی عمارت ہے۔ اس سے زیادہ تمہیں اور کیا چاہیے۔ طلباء نے کہا: "دیہات کی فضا آج کل بہت اچھی ہوتی ہے۔ کھلی جگہ ہے، سایہ دار درخت ہیں اور باغات ہیں۔"

مولانا نے ایک طالب علم سے پوچھا: تمہارا باغ ہے؟ کہا نہیں۔ دوسرے سے پوچھا تمہارا باغ ہے؟ بولا نہیں۔ تیسرے سے پوچھا: تمہارا باغ ہے؟ جواب دیا: نہیں۔ فرمایا: تو تمہیں لوگوں کے باغوں سے کیا تعلق؟ پھر میری طرف متوجہ ہوئے، فرمایا:

"مولوی اسحاق! آپ دیہات کی زندگی سے واقف ہیں۔ لوگ کھیتوں میں جا کر کیکر کے درخت کے نیچے چارپائی ڈال لیتے ہیں۔ اس سے دھوپ جھانکتی رہتی ہے، پھر جیسے جیسے سایہ بدلتا رہتا ہے۔ لوگ اپنی چارپائیاں کھینچتے جاتے ہیں۔ دس منٹ بھی آرام سے ایک جگہ نہیں بیٹھ سکتے۔ یہ کہہ کر طلبا کی طرف رُخ کیا اور کہا: جاؤ آرام کرو، جا کر پڑھو۔ کوئی چھٹی نہیں۔ پڑھنے کے لیے آئے ہو یا چھٹیاں لینے کے لیے!"

ہمدردی کی ایک مثال

۲۷، ۲۸، ۲۹ مئی ۱۹۴۹ء کو جمعیۃ اہلِ حدیث مغربی پاکستان کی پہلی کانفرنس دارالعلوم

دارالعلوم سے ان کے تعلقِ خاطر کا یہ عالم تھا کہ مختلف مضامین کے لیے بہتر سے بہترین اساتذہ کا تقرر عمل میں لاتے۔ وسعتِ قلب ملاحظہ ہو کہ دارالعلوم میں دو مدرّس حنفی المسلک تھے، ایک مولانا شریف اللہ خاں صاحب اور دوسرے مولانا محمد موسیٰ خاں صاحب۔

ایک واقعہ یا لطیفہ؟

دارالعلوم کے سلسلے میں ایک لطیفہ سُنیے جو ایک دن مولانا نے بڑے مزے لے لے کر بیان کیا:

جناب اے ایچ قریشی صاحب، محکمۂ اوقاف کے ناظمِ اعلیٰ تھے۔ دارالعلوم کی عمارت کے سلسلے میں مولانا ان سے ملنے گئے تو بتایا کہ ہمارے دارالعلوم میں لاہور سے باہر کے طلباء تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ کئی اساتذہ ان کو تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر علوم کی تعلیم دینے پر متعیّن ہیں۔ ہم دارالعلوم کی طرف سے طلباء کے لیے کتابیں، چارپائیاں، مُفت رہائش، کھانا اور صابن وغیرہ مہیّا کرتے ہیں۔ قریشی صاحب نے کہا، اچھّا مولانا پھر آپ کے یتیم خانے میں اور کیا انتظام کیا گیا ہے۔ مَیں نے کہا: قریشی صاحب! ہم دارالعلوم کی طرف سے ان کی تمام ضروریات پُورا کرتے ہیں اور ضروریات کی تفصیل دوبارہ بیان کی۔ قریشی صاحب نے پھر کہا اچھّا اپنے اس یتیم خانے میں آپ اور کیا کُچھ سہولتیں دیتے ہیں۔ مَیں نے کہا، حضور! میں عرض کر رہا ہوں، یہ دارالعلوم ہے جہاں ہم مختلف مقامات سے آئے ہُوئے طلبا کو قرآن و حدیث وغیرہ علوم کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کی ضروریات کی کفالت کرتے ہیں۔ قریشی صاحب نے جواب دیا۔ مولانا آپ اس کی جو تعریف کر رہے ہیں، وہ تو یتیم خانے کی ہے اور نام اس کو دارالعلوم کا دے رہے ہیں۔

مولانا نے قریشی صاحب کے ہاں سے آتے ہی یہ لطیفہ سنایا اور فرمایا: مَیں نے بڑی مشکل سے ان کو یقین دلایا کہ یہ یتیم خانہ نہیں، دارالعلوم ہے۔

نام میں احتیاط

مولانا دُوسروں کا پُورا نام لینے کے عادی تھے اور اس میں بہت احتیاط کرتے تھے اس کی ایک مثال قابلِ ذکر ہے۔ میں ۱۹۴۸ء کے آخر میں جمعیتِ اہل حدیث کے ناظمِ دفتر کی حیثیت سے لاہور آیا۔ مولانا جمعیت کے صدر تھے اور پروفیسر عبدالقیوم صاحب ناظمِ اعلیٰ۔ پروفیسر صاحب موصوف اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ عربی میں تھے۔ ان کا اصُول تھا کہ کالج سے فارغ ہو کر ڈیڑھ دو بجے روزانہ دفتر تشریف لاتے اور ضروری کاغذات دیکھتے۔ ایک روز مولانا نے مجھ سے اُن کے بارے میں پُوچھا تو میں نے عرض کیا: "قیوم صاحب آئے تھے، خاصی دیر بیٹھے رہے ہیں۔"

مولانا نے فرمایا:

"قیوم صاحب مت کہیے۔ عبدالقیوم صاحب کہیے۔ قیّوم صاحب، حیّ صاحب، غفار صاحب، جبّار صاحب، قہّار صاحب، رحمٰن صاحب کہنا غلط ہے۔ عبدالقیوم، عبدالحیّ، عبدالغفّار، عبدالجبّار، عبدالقہّار، عبدالرحمٰن کہنا چاہیے۔ یہ وہ صفات ہیں جو صرف اللہ کے لیے مخصوص ہیں۔ البتہ آپ کریم، وکیل، حفیظ وغیرہ صفات کسی انسان کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

مولانا کا خادمِ خاص

مولانا باہر تشریف لے جاتے یا گھر میں قیام فرما ہوتے، اُن کا ملازم اور خادمِ خاص محمد عمر تبتّی ان کے ساتھ ہوتا۔ مولانا اس پر بہت اعتماد کرتے تھے اور اس کی دیانت و امانت کی قدر کرتے تھے اور اُس کی اِس خوبی کا بارہا ذکر کرتے۔ اس کو آواز دیتے، تو ہمیشہ محمد عمر کہہ کر پکارتے۔ باہر سے جو شخص بھی مولانا سے ملنے آتا، محمد عمر سے رابطہ پیدا کرتا اور وہی مولانا سے

ملاقات کا ذریعہ بنتا۔ وہ قدرے بہرہ ہے۔ بعض دفعہ مولانا کی بات سمجھ نہ سکتا، تو زبان کے بجائے سمجھنے کے لیے آنکھ سے اشارہ کرتا۔ کوئی اور بھی موجود ہوتا، تو مولانا اس کی اس ادا پر ہنستے اور فرماتے: "اس کو سمجھاؤ مجلس کے آداب کا تو خیال رکھے"۔ یہ بارہ سال دہلی میں رہا ہے اور بھاڑ جھونکتا رہا ہے۔

محمد عُمر کوئی سودا لے کر آتا، تو مولانا اگرچہ کتنے مصروف ہوں اور ان کے پاس کوئی بھی بیٹھا ہو، محمد عمر بغیر کچھ دیکھے سیدھا اُن کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا اور کہتا:

"یہ لو، اتنے پیسے بچے، پکڑو۔ مجھے اتنے پیسے باقی دو"۔

مولانا لاکھ سمجھاتے کہ پھر حساب کریں گے۔ اب تم جاؤ مگر وہ ایک نہ سُنتا اور کہتا:

"پھر بھول جائیں گے، یہ لے ہی لو"۔ اِس کے جانے کے بعد مولانا اس کی بڑی تعریف کرتے۔

مولانا سے ملاقات کے لیے یہ بڑے بڑوں کی پروا نہ کرتا اور لوگ اس کے محتاج ہوتے۔ کوئی مولانا کے متعلق پوچھتا تو جواب دیتا:

"مولانا صاحب ابھی نہیں آیا" یا کہتا: "ابھی آیا ہے، تھوڑی دیر ٹھہرو"، ملاقاتی اس کو ایک اہم "شخصیت" قرار دیتے اور مولانا مسکرا پڑتے۔

ایک مرتبہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ مولانا نے محمد عمر سے کسی کام کے لیے بات کہی۔ وہ سمجھ نہ پایا اور کام نہ ہو سکا۔ کام کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ مولانا سخت پریشان ہوئے اور جلال میں آگئے اور محمد عُمر کو ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ محمد عمر کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور مُلازمت ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مولانا نے حافظ عبدالرشید کو بُلایا وہ بڑی مُشکل سے محمد عمر کو مولانا کے پاس لائے۔ مولانا بھی رو پڑے اور محمد عمر بھی رو پڑا۔ مولانا نے حافظ عبدالرشید کو سارا واقعہ سنایا اور پھر محمد عُمر کی طرف متوجہ ہو کر کہا:

"لو محمد عمر میں حاضر ہوں، مَیں نے تُم کو تھپڑ مارا، تو تُم مجھے تھپڑ مارو اور اپنا بدلہ لے لو

یا مجھے معاف کر دو، مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ مولانا رو رہے تھے اور بار بار یہ الفاظ دُہراتے جاتے تھے۔ بہرحال بڑی مشکل سے محمد عمر کو منانے میں کامیاب ہُوئے۔ اس سے ان کی اخلاقی عظمت اور کردار کی بلندی کا اندازہ لگائیے۔

بعض دفعہ مولانا اس کو چھیڑ دیتے۔ محمد عمر کوئی دِلّی کی بات سناؤ۔ وہ "سنو مولانا صاحب"! کہہ کر شروع ہو جاتا اور بات ختم ہونے میں نہ آتی۔ مولانا فرماتے:

"اچھا محمد عمر باقی آئندہ۔ اب تم کام کرو۔ یہ داستانِ امیر حمزہ ابھی ختم نہیں ہو گی۔"

محمد عمر اب بھی دار العلوم تقویۃ الاسلام کے اسی کمرے میں رہ رہا ہے۔ وہاں جائیں تو خیال ہوتا ہے، "ابھی محمد عمر" کہہ کر مولانا اس کو آواز دیں گے۔ وہ جواب نہیں دے گا تو فرمائیں گے: "حُقّہ پی رہا ہو گا۔ اس کو سمجھاؤ، مجھے پریشان نہ کیا کرے۔ بات سمجھ لیا کرے۔" بولے بدّل میری بات بھی سنو!"

"جماعتِ اہلحدیث اور جماعتِ اسلامی سوئی پڑی ہیں"

میں الاعتصام سے مُنسلک تھا اور مولوی محی الدین سلفی جماعتِ اسلامی سے تعلّق رکنیت رکھتے تھے اور جماعت کے ترجمان سہ روزہ "کوثر" میں کام کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ دار العلوم تقویۃ الاسلام میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور ان کی رہائش دار العلوم ہی میں تھی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ ہم لوگ باہر سوئے ہُوئے تھے۔ فجر کی اذان ہُوئی اور جماعت بھی ہو گئی، لیکن میں اور مولوی محی الدّین نیند میں اس درجہ مستغرق تھے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ نماز سے فارغ ہو کر مولانا باہر آئے، دیکھا کہ ہم سوئے پڑے ہیں۔ جگایا نہیں، فرمایا:

"جماعتِ اہل حدیث اور جماعتِ اسلامی سوئی پڑی ہیں۔" یہ الفاظ بیک وقت ہم دونوں کے کانوں میں گونجے اور ہم جلدی سے اُٹھ بیٹھے۔ مولانا نے اس سے آگے کچھ نہیں کہا اور اُوپر چلے گئے۔

تقویۃ الاسلام (لاہور) میں منعقد ہوئی۔ اس کے صدر مجلس استقبالیہ مولانا محمد حنیف ندوی اور صدر کانفرنس مولانا حافظ محمد ابراہیم میر سیالکوٹی تھے۔ میرا تعلق جمعیۃ کی نظامت دفتر سے تھا۔ اس کانفرنس کے سلسلے میں مجھے بڑی بھاگ دوڑ کرنا پڑی۔ ۲۹ مئی کو کانفرنس ختم ہوئی اور ۳۰ مئی کو میں بیمار پڑ گیا اور ایک مہینہ سخت تکلیف میں مبتلا رہا۔ مولانا روزانہ میرے لیے شام کو پھولوں کے ہار لاتے، کئی دفعہ میری عیادت کو تشریف لاتے اور مجھے تسلّی دیتے۔ طلباء کو میری خبر گیری کی تاکید فرماتے۔ مجھے یاد ہے ان کے صاحبزادہ گرامی قدر سیّد ابوبکر غزنوی ایک دو مرتبہ روزانہ مجھ سے پوچھتے۔ مولانا نے میری بیماری کے سلسلے میں کئی مشہور ایلوپیتھک اور یونانی معالجوں کو بلایا اور علاج کا بہترین انتظام کیا۔ ان کی اور مولانا محمد حنیف ندوی کی تجویز سے علاج کے تمام اخراجات مرکزی جمعیۃ نے ادا کیے۔ یہ ان کی انسانی ہمدردی کی وہ مثال ہے، جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔

"یہ کپڑا آپ کی قمیص کے لیے ہے"

مولانا عام طور پر عصر کے بعد اپنے چھوٹے بھائی حافظ سلیمان غزنوی مرحوم کی دوکان پر انارکلی بازار جاتے اور خاصی دیر وہاں بیٹھتے۔ کبھی کبھی مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ حافظ صاحب مرحوم کی کپڑے کی خاصی بڑی دکان تھی۔ ایک روز میں ساتھ تھا۔ مولانا نے کپڑا خریدا اور مجھ سے بھی مشورہ لیا کہ قمیصوں کے لیے یہ کپڑا کیسا رہے گا اور یہ کیسا؟ میں "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے" کہتا رہا۔ مولانا نے میرے لیے قمیص کا کپڑا خریدا اور فرمایا:

"یہ آپ کی قمیص کے لیے، پسند ہے آپ کو؟"

میں نے انکار کیا تو بولے: "بس خاموش رہیے۔ یہ فیصلہ ہو چکا۔"

پھر خود ہی سلائی کے لیے درزی کو دیا اور اس کی سلائی کی اجرت بھی اپنی گرہ سے ادا کی۔

جذبۂ انسانیت

وقت گزر جاتا ہے اور انسان اپنا دور ختم کر کے دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے لیکن اس کی بعض باتیں ایسا اثر چھوڑ جاتی ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتا اور وہ باتیں اس وقت زیادہ نمایاں ہو کر سطحِ ذہن پر اُبھرتی ہیں جب اس کی مثالیں معدوم ہوتی جا رہی ہوں اور پرانے نقش مٹتے جا رہے ہوں۔ یہ سطور لکھنے بیٹھا ہوں تو مولانا کی اس قسم کی بے شمار باتیں لوحِ ذہن پر ہجوم کر آئی ہیں، جو صرف اسی کردار کے لوگوں کے ساتھ مختص تھیں۔ اس سلسلے کی ایک بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

دسمبر کے دن تھے۔ رات کے ڈیڑھ بجے میرے گاؤں سے بذریعہ ٹیلیفون میری ایک عزیزہ کی وفات کی اطلاع آئی۔ ٹیلیفون مولانا نے سنا۔ ٹیلیفون کرنے والے سے میرے رشتے کی نوعیت پوچھی، متوفیہ کا نام اور اس کا مجھ سے رشتہ و تعلق دریافت کیا، جنازے کا وقت پوچھا اور پھر اس سے اظہارِ افسوس کیا۔ اسی وقت نیچے اُترے، دفتر کے ملازم محمد یوسف کے مکان پر گئے۔ اس کو جگایا اور میرے گھر بھیجا۔ مجھے یاد ہے، سوموار تھا جو 'الاعتصام' کی ترتیب کے سلسلے میں شدید مصروفیت کا دن تھا۔ مولانا نے محمد یوسف کو میرے بارے میں تاکید کی کہ دفتر آنے کی ضرورت نہیں، صبح جلد سے جلد گاؤں پہنچیں، اخبار کا کوئی فکر نہ کریں، سارا کام ہو جائے گا اور پھر وہاں سے آج ہی لوٹنے کی ضرورت نہیں، انسان کی موت کا معاملہ ہے، دو چار روز ٹھہر کر آئیں۔ آہ! اس قسم کے جذبۂ انسانیت کے حامل لوگ اب کہاں پیدا ہوں گے۔

اس قسم کا ایک اور واقعہ بھی سنانے کو جی چاہتا ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ میں گاؤں گیا۔ وہاں سے چلنے لگا تو ایک بزرگ کی وفات کی اطلاع ملی۔ مجھے وہاں رکنا پڑا۔ لاہور ٹیلیفون کیا۔ مولانا سے بات ہوئی تو بہت حزن و ملال کا اظہار کیا اور اسی وقت

آدمی بھیج کر میرے گھر اطلاع کرائی، تاکہ بچے میرا انتظار نہ کریں اور پریشان نہ ہوں۔

"فقۂ حنفی کو سمجھنے کی کوشش کیجیے"

۱۹۵۹ء میں لاہور کی بادشاہی مسجد کے سابق خطیب اور مشہور عالم مولانا غلام مرشد نے عید الاضحیٰ کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے ایوب خاں کی حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ اربابِ اقتدار کو پاکستان میں جانوروں کی قربانی کی ایک حد مقرر کر دینی چاہیے۔ اگر ہماری حکومت منصوبہ بندی کرے تو ملّی مفاد کی خاطر لاکھوں جانوروں کی قیمت قربانی کے نام پر وصول کر کے بہت سے ہسپتال اور تعلیم گاہیں تعمیر کر سکتی ہے ——— ساتھ ہی اُنھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ اگر قربانی کے جانوروں کی قیمت کسی قومی فنڈ میں ادا کر دی جائے تو اس رقم کی ادائیگی مذہبیاً قربانی تصور کی جائے گی۔

مولانا غلام مرشد کے اس خطبے پر اخبارات میں سخت تنقید کی گئی تھی۔ "الاعتصام" میں بھی اس عاجز نے اپنی علمی بساط کے مطابق لکھا۔ لیکن اس سلسلے میں مولانا غزنوی کا مقالہ نہایت زوردار تھا۔ یہ مقالہ اُنھوں نے مولانا مفتی محمد حسن مرحوم کی فرمائش پر "الاعتصام" میں سپردِ قلم فرمایا تھا۔ مولانا نے قرآن، حدیث، عملِ صحابہ کے علاوہ فقہِ حنفیہ کی مستند کتابوں سے ثابت کیا کہ اضحیہ یعنی قربانی، اہراقِ دم (خون بہانے) کے سوا ہرگز نہیں ہو سکتی۔ یہ اُنھوں نے اس لیے ثابت کیا کہ مولانا غلام مرشد نے فقہِ حنفیہ سے اپنے استدلال کا دعویٰ کیا تھا۔ مولانا نے ان دنوں ٹیلیفون پر مولانا غلام مرشد سے بھی بات کی اور اس اندازِ استدلال پر سخت افسوس کا اظہار کیا۔ یہ بھی فرمایا: "مولانا غلام مرشد! فقہ حنفی کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ آپ فقہ کی کسی مستند کتاب سے ثابت نہیں کر سکتے کہ قربانی بغیر "اہراقِ دم" کے بھی ادا ہو سکتی ہے۔"

"مستعلیق عالمِ دین"

مولانا چراغ حسن حسرتؔ مرحوم نے ایک مرتبہ "امروز" کے حرف و حکایت میں مولانا داؤد

غزنوی" کی خوش ذوقی و خوش پوشی اور نفاستِ طبع کا ذکر کرتے ہوئے انہیں "نستعلیق عالمِ دین" قرار دیا تھا اور لکھا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا داؤد غزنویؒ اگر کہیں ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے تو دروازے بند کر کے محوِ گفتگو ہو جاتے۔ پھر انہیں کوئی پروا نہ ہوتی کہ باہر بھی کوئی بیٹھا ہے۔ اتفاق سے اُن میں فکری و علمی اتحاد کے ساتھ ساتھ نفاست اور خوش ذوقی و خوش پوشی کا بھی اتحاد تھا۔ حسرت مرحوم نے یہ بھی لکھا تھا کہ ممکن ہے دونوں ایک دوسرے کا حُسن دیکھتے رہتے ہوں۔

حسرت مرحوم کی یہ بات بالکل صحیح تھی۔ مولانا داؤد غزنویؒ واقعی نفیس الطبع تھے۔ وہ قلم اور کاغذ کے استعمال میں بھی اپنی خوش ذوقی اور نفاستِ طبع کو مجروح نہ ہونے دیتے۔ مولانا محمد اسماعیل مرحوم مضمون بھیجتے تو عام طور پر ایک طرف سے مطبوعہ کاغذ یعنی اشتہار وغیرہ کی پُشت پر لکھا ہوتا۔ مولانا اس پر سخت ناگواری کا اظہار کرتے اور کہا کرتے کہ میں اس قسم کے کاغذ پر لکھ ہی نہیں سکتا۔ مجھے میلے کچیلے اور مطبوعہ کاغذ سامنے رکھ کر مضمون سُوجھتا ہی نہیں۔ اُن کی عادت تھی کہ نہایت عُمدہ اور سفید کاغذ پر لکھتے۔ انہیں دو چار سطریں بھی لکھنا ہوتیں، تو بھی بہتر کاغذ استعمال کرتے۔

مولانا کا کُتب خانہ

ان کا کُتب خانہ انفرادی کُتب خانوں میں سے بہت بڑا کُتب خانہ تھا اور ہر موضوع سے متعلّق کتابیں عُمدہ ترتیب سے بہترین الماریوں میں سلیقے اور قرینے سے رکھی تھیں۔ ان کے پاس تفسیر، حدیث، شروح، فقہ اور اصولِ فقہ، اصولِ حدیث اور فنون کی تمام کتابیں موجود تھیں۔ ان کی عادت تھی کہ کتابوں کی جلد سازی کے لیے بہترین جلد ساز کی خدمات حاصل کرتے اور کتاب مجلّد ہو کر واپس آتی تو اس کا ایک ایک ورق کھول کر دیکھتے کہ کہیں کوئی ورق جُز بندی سے باہر تو نہیں رہ گیا ہے یا کسی ورق کے الفاظ تو جز بندی

میں نہیں آ گئے ہیں۔

کتابوں کو دیمک اور گرد و غبار وغیرہ سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کرتے۔ کپڑے سے کتابیں خود صاف کرتے۔ کیڑے مکوڑے سے حفاظت کی غرض سے نیم کے پتے کتابوں میں ڈالتے۔ کہا کرتے کہ یہ کتابیں میری جائیداد ہے۔ میں انہیں اپنا اور بچوں کا پیٹ کاٹ کر خریدتا ہوں۔

علم فقہ سے ان کو بہت دلچسپی تھی۔ چنانچہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ تمام مسالکِ فقہ کی کتابیں ان کے پاس موجود تھیں۔ فتاویٰ نویسی میں چونکہ ان کو خاص درک تھا، اس لیے اکثر عربی اور اردو پر مشتمل کُتبِ فتاویٰ ان کے پاس موجود تھیں۔ وہ ہر موضوع سے متعلق کتابوں کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے اور اہم مقامات پر نوٹ لکھتے۔

لاہور میں تجوید و قراءت کا پہلا مدرسہ

قرآنِ مجید سے ان کو خصوصیت سے تعلقِ خاطر تھا بعض اہلِ حدیث حضرات جس انداز سے قرآن پڑھتے اور مخارجِ حروف کی صحت سے بے نیازی برتتے ہیں، اس سے انہیں سخت ذہنی کوفت ہوتی۔ ایک دن انھوں نے بتایا (غالباً ۱۹۳۰ء کا ذکر کیا) کہ لاہور میں قرآنِ مجید کی قراءت و تجوید کا پہلا مدرسہ مسجد چینیاں والی میں، مَیں نے قائم کیا اور اس کے لیے قاری فضل کریم (مرحوم) کی خدمات حاصل کیں۔ مولانا کو اس مدرسے سے بہت دلچسپی تھی۔ اس کے لیے مسجد چینیاں والی کی مجلسِ منتظمہ طلباء کو بیس بیس روپے مہینہ وظیفہ دیتی تھی تاکہ اہلِ حدیث حضرات میں قراءت و تجوید کا ذوق پیدا ہو۔ اس خدمتِ قرآن پر کئی مشہور قاری متعین تھے۔ جن میں قاری فضل کریم مرحوم، قاری اظہار احمد تھانوی مدظلہ اور قاری محمد صدیق کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں

طلبائے قراءت کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر مولانا خود تشریف لاتے اور

قراءت کی اس مجلس میں شرکت کرتے اور جب قاری صاحب قرآن کی تلاوت کرتے تو ان پر رقّت طاری ہو جاتی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے۔

"یہ کون صاحب ہیں؟"

وہ پُر وقار اور بارُعب شخصیّت کے مالک تھے۔ جدھر سے گزر جاتے، اُنہیں دیکھ کر واقف اور ناواقف کے قدم وہیں رُک جاتے اور آنکھیں اُن کے چہرے پر گڑ جاتیں۔ واقف جُھک کر سلام کرتے اور ناواقف تعجّب سے پُوچھتے کہ یہ کون بزرگ ہیں؟ اس کی ایک مثال پیش کرتا ہُوں۔

جماعت کی تنظیم کے سلسلے میں، لاہور سے بذریعہ ٹرین مُلتان روانہ ہُوئے۔ ساہیوال کے ارکانِ جماعت کو ٹیلیفون کے ذریعے پہلے سے پروگرام کی اطلاع دی جا چکی تھی۔ وہ سٹیشن پر آئے۔ مولانا اپنے ڈبّے سے اُتر کر پلیٹ فارم پر تشریف لائے۔ مُلتان ڈویژن کے کمشنر بھی پلیٹ فارم پر موجود تھے۔ وہ ساہیوال کے سرکاری دَورے پر آئے تھے اور اُن کو اسی گاڑی سے مُلتان جانا تھا۔ ساہیوال کے ڈپٹی کمشنر، اور دُوسرے سرکاری حکّام ان کو الوداع کہنے کے لیے حاضر تھے۔ مولانا پلیٹ فارم پر آئے تو کمشنر، ڈپٹی کمشنر اور اُن کے ساتھیوں نے ان کی طرف دیکھا۔ آپس میں کوئی بات کی اور ڈپٹی کمشنر نے چودھری عبدالقادر (مرحوم) کی طرف قدم بڑھائے وہ چودھری صاحب سے متعارف تھے۔ پوچھا: "یہ کون صاحب ہیں؟" کہا: مولانا داؤد غزنوی!" پھر وہ دونوں مولانا کے پاس آئے۔ چودھری صاحب نے ساہیوال کے ڈپٹی کمشنر اور ڈپٹی کمشنر نے کمشنر صاحب کا تعارف کرایا۔ دونوں نے اَدب سے جُھک کر سلام کیا اور کہا: آپ کے بارے میں سُنا تو بہت کچھ تھا لیکن نیازمندی کا شرف آج ہی حاصل ہوا۔ گفتگو چونکہ جماعتی نوعیّت کی ہو رہی تھی، اسلیے کمشنر اور ڈپٹی کمشنر دُعا کی درخواست کر کے علیحدہ کھڑے ہو گئے اور جب تک مولانا کھڑے رہے، وہ ان کو دیکھتے رہے۔

ایک عظیم کردار

مولانا صبح کو دس بجے اپنے دفتر آجاتے، پھر دوپہر کو کھانے کے وقت اُوپر جاتے۔ تھوڑی دیر بعد پھر آجاتے اور مغرب کی نماز کے بعد تک نیچے تشریف رکھتے۔ وفات سے پانچ چھ سال پہلے دل کی تکلیف زیادہ بڑھ گئی تھی، اس لیے بعض دفعہ یہ پابندی قائم نہ رہ سکتی۔ مُلاقات کے لیے ہر قسم کے لوگ آتے اور الگ الگ مقصد لے کر آتے، مگر وہ ہر ایک سے ملتے۔ کسی کی دل شکنی نہ کرتے۔ بارہا ایسا ہوتا کہ اُوپر جاتے، اسی وقت کوئی ملنے والا آجاتا، اطلاع پہنچتی تو پھر نیچے آجاتے۔ ان کو چار منزلیں اُوپر جانا پڑتا تھا۔ دل پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ اُوپر چڑھتے اور اسی دھیمی رفتار سے نیچے آتے۔ اکثر کہا کرتے کہ "یہ سیڑھیاں" میرے لیے ایک عذاب ہے۔ وہ "سیڑھیاں" نہیں "سیڑھییں" کہتے تھے۔ "اندازہ کیجیے کتنی سیڑھییں اُوپر چڑھتا ہوں اور پھر کتنی نیچے آتا ہوں"۔ بعض دفعہ یہ بھی کہتے کہ جی چاہتا ہے کہ سیڑھیوں کی مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لیے نیچے ہی دو تین کمرے تعمیر کر لیے جائیں، مگر تعمیر کے لیے خرچ کہاں سے لاؤں؟" فرمایا کرتے: "مَیں کسی ملنے والے کو ملنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس لیے اُوپر نیچے آنا جانا ضروری ہے لیکن یہ سیڑھییں بڑی تکلیف کا باعث ہیں۔ یہ مجھے مار ڈالیں گی۔"

یہ ان کا ایک عظیم کردار تھا کہ تکلیف کے باوجود نیچے تشریف لاتے، فقط اس لیے کہ مُلاقات کرنے والے پریشان نہ ہوں اور انہیں مایوس نہ لوٹنا پڑے۔

پیر صاحب نے مسند خالی کر دی!

کبھی کبھی اپنی زندگی کے گزشتہ دَور کی باتیں بھی خوش ہو کر سناتے۔ ایک دن بتایا کہ تحریکِ عدمِ تعاون کے زمانے میں مَیں اور مولانا ظفر علی خاں سیالکوٹ کے دَورے پر گئے۔ ایک جگہ جا رہے تھے کہ اثنائے سفر میں علی پُور سیداں پہنچ گئے۔ مَیں نے مولانا ظفر علی خاں سے کہا چلیے

پیر جماعت علی شاہ صاحب سے ملتے چلیں۔ وہ سیاسیات میں ہمارے شدید مخالف تھے۔ اور مولانا ظفر علی خاںؒ نے تو "زمیندار" میں بے شمار نظمیں اور مضامین اُن کے خلاف لکھے تھے۔ اُنہوں نے کہا وہ ہماری مخالفت کریں گے۔ اُن کے پاس نہیں جانا چاہیے مگر مَیں نے ان سے ملنے پر اصرار کیا۔ بالآخر ہم انکے مکان پر پہنچ گئے۔ پیغام بھیجا۔ فوراً اندر بُلا لیا اور میرے لیے مسند خالی کر دی۔ کہا آپ سیّد ہیں، بہت بڑے علمی اور مجاہد خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ خود بھی عالم ہیں اور نیک کام کے لیے نکلے ہیں۔ ہمارے معزّز مہمان ہیں اس مسند پر آپ ہی تشریف رکھیں گے۔ مَیں نے ہر چند معذرت کی مگر وہ نہ مانے۔ آخر ان کے اصرار پر میں بیٹھ گیا اور مولانا ظفر علی خاں کو بھی اُنہوں نے میرے برابر بٹھایا۔ پھر ہم نے یہ کہہ کر مسند چھوڑ دی کہ "تعمیلِ ارشاد ہو گئی ہے۔" مولانا نے بتایا کہ جب تک ہم بیٹھے رہے وہ اپنی مسند پر نہیں بیٹھے۔ ہمارے برابر بیٹھے رہے۔ پانی پلایا، کھانا کھلایا۔ رات رہنے پر اصرار کیا اور بہت اچھی طرح پیش آئے۔

معذرت خواہ ہوں کہ مضمون لمبا ہو گیا ہے اور وفورِ شوق کے باعث مرتّب اور مربُوط بھی نہیں ہے۔

میرے استاد

مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

—— محی الدین سلفی

۱۹۴۶ء کی بات ہے جب میں پہلی دفعہ حضرت مولانا سیّد محمد داؤد غزنویؒ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ مسجد قدس امرتسر میں ایک مبتدی طالب علم کی حیثیت سے زیرِ تعلیم تھا۔ شعور ابھی پختگی کے مراحل طے کر رہا تھا۔ ایک دن طلبہ سے معلوم ہوا کہ مدرسۂ غزنویہ کے مہتمم حضرت مولانا داؤد غزنویؒ امرتسر تشریف لا رہے ہیں۔ مَیں بھی شوقِ زیارت لے کر مدرسہ غزنویہ پہنچ گیا۔ میرے پہنچنے سے پہلے مولانا تشریف لا چکے تھے۔ مَیں نے آپ سے مصافحہ کیا اور طلبہ کے حلقے میں بیٹھ گیا۔ ملکی مسائل اور مدرسہ کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ ملک تقسیم ہو گیا تو مَیں نے عربی تعلیم کی تکمیل کے لیے دارالعلوم تقویۃ الاسلام لاہور میں، جو امرتسر سے منتقل ہو کر آیا تھا، داخلہ لے لیا۔

مولانا علیہ الرحمۃ کو جب معلوم ہوا کہ ایک میٹرک پاس طالب علم بھی ہمارے مدرسہ میں داخل ہوا ہے تو آپ نے مجھے بُلایا۔ تعارف کے بعد آپ بے حد خوش ہُوئے۔ اس لیے بھی کہ ہمارے بزرگوں کی عقیدتیں اس خاندان کے ساتھ وابستہ رہی ہیں۔ مدرسہ چونکہ ابتدائی مراحل میں تھا اور اس کے حسابات اور خط و کتابت کے لیے ایک ناظم دفتر کی ضرورت تھی۔ مولانا مرحوم نے مجھے اس کام پر لگایا، تعلیم کے علاوہ مَیں نے اس کام کو بھی اپنے ذمّہ لے لیا۔ مَیں چونکہ سکُول کے ماحول سے نکل کر وہاں پہنچا تھا، اس لیے بعض چیزیں طبیعت سے میل نہ کھاتی تھیں جو پُرانے عربی مدارس میں رائج ہیں۔ کھانے کا انتظام اگرچہ مدرسہ کے

مطبخ میں ہوتا تھا، لیکن طلبہ انفرادی طور پر کھاتے تھے جس سے وقار اور نظم متاثر ہوتا تھا۔
میں نے اپنے رفقاء کی معیت میں مولاناؒ سے عرض کیا کہ ہم اجتماعی کھانے کا بندوبست کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے ہم سے تعاون کا اظہار فرمایا اور برتنوں اور دیگر اشیاء کا انتظام کر دیا گیا۔ اس طرح مجھے مولانا علیہ الرحمۃ کے زیادہ قریب ہونے کا موقع ملا۔ مدرسہ کے حسابات اور خط و کتابت کے سلسلے میں ہر دُوسرے تیسرے دن مولاناؒ کی خدمت میں حاضری ہوتی لیکن طالب علمی کے ابتدائی دَور کی وجہ سے جب مولاناؒ مجھے بلاتے تو مجھ پر کپکپی طاری ہو جاتی۔ ان کی گرج دار آواز سے سہم جاتا۔ یہ آواز ظاہراً اگرچہ دار تھی لیکن حقیقت میں ایک مشفق کی آواز تھی۔ میرا یہ ڈر روز بروز کم ہونے لگا اور میں ان سے مانوس ہونے لگا، پھر یہ کیفیت ہُوئی کہ کبھی کبھار آپ مجھے کھانے کی کوئی چیز دے دیتے اور عید کے موقع پر بعض اوقات عیدی سے بھی میری حوصلہ افزائی ہونے لگی۔ مولاناؒ کے اس سلوک سے میں نے اپنے آپ کو طلبہ سے برتر محسوس کرنا شروع کر دیا۔ مدرسہ میں ہم نے ایک جمعیت بھی قائم کی تھی۔ مولانا علیہ الرحمۃ کبھی کبھار اُس میں شرکت فرماتے اور ہمیں فنِ تقریر اور علمی ترقی کے لیے ہدایات دیتے۔ اُن کے ارشادات آج بھی میرے کانوں میں گُونج رہے ہیں۔
ایک دفعہ آپ نے فرمایا عزیزو! تقریر تمہارے علم کا پیمانہ ہے۔ اپنے آپ کو ایک بہتر مقرّر بنانے کی کوشش کرو۔ ایک مقرّر خوشی، غم اور یاس کی حالتوں میں بھی عوام کے جذبات کو بے قابو نہیں ہونے دیتا۔ اس کے حق میں آپ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اُس خطبے کی مثال بیان کی جو آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے وصال کے موقع پر ارشاد فرمایا۔ حضرت عمرؓ لوگوں سے یہ کہہ رہے تھے کہ جو شخص یہ کہے گا "محمّد (صلی اللہ علیہ وسلّم) انتقال کر گئے ہیں، مَیں اُس کا سَر قلم کر دوں گا۔ حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے۔ آپ نے خطبۂ مسنونہ پڑھا اور اس کے بعد فرمایا: من کان یعبد محمداً فان محمداً قدمات ومن کان یعبد اللّٰہ فان اللّٰہ حی لا یموت۔

اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی : وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل افائن مات او قُتل انقلبتم علی اعقابکم۔
اس خطبے کا ارشاد فرمانا تھا کہ مجمع کی حالت بدل گئی اور لوگ جو سہمے ہُوئے تھے آپ کے وصال کا تذکرہ کرنے لگے۔

مولانا علیہ الرحمۃ میں سلیقہ، نظم وضبط بدرجۂ غایت تھا۔ چنانچہ آپ طلبہ کو بھی انہی باتوں کی تلقین فرماتے۔ آپ نے انہی اجلاسوں میں ایک دفعہ فرمایا کہ آپ اپنے اندر نظم وضبط، سلیقہ اور صفائی کے اوصاف پیدا کریں۔ میں تمام طلبہ سے کہتا ہُوں کہ وہ اُجلا لباس پہنیں، اپنی گفتگو، نشست وبرخاست اور تعلیم میں اپنے آپ کو ایک مہذّب اور شائستہ طالب علم کی حیثیت سے پیش کریں۔ آپ کسی چیز کو بے قرینہ رکھنے کو پسند نہ فرماتے۔ کتابیں، تپائیاں، چٹائیاں، ان میں سے کوئی چیز بھی بغیر قرینے کے پڑی ہوتی تو آپ طلبہ کو ڈانٹتے اور فرماتے، نہ معلوم تمہیں کب تمیز آئے گی ؟ لیکن جہاں آپ ڈانٹتے، وہاں آپ طلبہ کو اچھّی طرح سمجھاتے کہ کس طرح چیزوں کو رکھّا جاتا ہے۔ مدرسۂ تقویۃ الاسلام میں وضوگاہ چونکہ جائے نماز سے متصل ہے، اس لیے بعض طلبہ یا نمازی وضو کرنے کے بعد ننگے پاؤں صفوں پر آ دھمکتے۔ آپ ایسے موقعوں پر خفگی کا اظہار کرتے اور فرماتے : مالِھولاءِ القوم لا یکادون یفقھون حدیثًا۔ مولانا عمومًا اپنے دلائل کی تائید میں آیاتِ قرآنیہ پڑھتے، جن سے ایک طرف آپ کی قرآن مجید سے شیفتگی کا اظہار ہوتا۔ دُوسری طرف ان لوگوں کا جواب بھی ہو جاتا جو یہ کہتے ہیں کہ اصحاب الحدیث صرف حدیث پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ قوّتِ بیان کا زور بھی بڑھ جاتا۔
مَیں نے آپ کے طریقۂ تبلیغ کو مبنی بر حکمت پایا ہے۔ طلبہ کے علاوہ اگر انہیں کسی کو منع کرنا ہوتا تو بڑی حکمت اور سُلجھے ہُوئے انداز میں منع فرماتے۔ مجھے اچھّی طرح یاد ہے کہ ایک شخص نماز ادا کرنے آیا اور صرف تکبیر تحریمہ کہہ کر بغیر ہاتھ باندھے رکن نماز میں شامل ہوگیا۔

مولاناؒ اس کے ساتھ کھڑے تھے۔ آپ نے نماز کے بعد بڑے سُلجھے ہُوئے انداز میں فرمایا کہ اس طرح نماز نہیں ہوتی۔ تکبیر کے بعد ہاتھ باندھنے چاہئیں۔

چھوٹوں کو بھی آپ بڑی عزّت و احترام سے بُلاتے۔ چنانچہ میرے ذہن میں یہ بات اچھّی طرح مرتسم ہے کہ جن دنوں میں مشکوٰۃ پڑھتا تھا، مولاناؒ مجھے مولوی محی الدین کہہ کر بُلاتے۔ مَیں دل میں بڑا خوش ہوتا کہ مولوی تو بن گیا ہُوں، یہی کیفیت کم و بیش دوسرے طلبہ اور لوگوں سے تھی۔

آپ کی زندگی بڑے ہنگامے کی تھی، لیکن اس کے باوجود آپ نے جن چیزوں کو اپنے لیے لازم کر لیا تھا، ان کی بڑی باقاعدگی کی۔ سیاست کی خار دار وادی میں قدم رکھتے ہُوئے بھی آپ نماز، نوافل اور اوراد و وظائف کو کمال باقاعدگی سے انجام دیتے رہے۔ مسجد چینیاں والی میں خطبۂ جُمعہ آپ نے اپنی زندگی کے ہر دَور میں پابندی کے ساتھ دیا۔ آخری تین چار سالوں کے خطبے نہایت علمی ہونے کے ساتھ ساتھ تصوّف کا غالب رنگ اپنے اندر لیے ہُوئے تھے۔ ان خطبوں کو آپ باقاعدہ ترتیب کے ساتھ نوٹ کر کے دیتے۔

ہماری تعلیم کے آخری سال مولانا علیہ الرحمۃ نے مؤطّا امام مالکؒ کے درس کا اظہار فرمایا۔ ہمارے لیے یہ چیز نہایت خوش کن تھی۔ چنانچہ چند دن کے بعد آپ نے مؤطّا کا درس شروع کر دیا۔ مولاناؒ نے اپنے درس میں اس وقار اور عظمت کو برقرار رکھنے کی پُوری کوشش فرمائی جو امام مالکؒ کے بارے میں منقول ہے۔ مولانا محترمؒ نہایت اُجلا لباس پہن کر تشریف لاتے، دو زانو ہو کر بیٹھتے اور سارا درس اسی حالت میں بیٹھے رہتے۔ طلبہ کو ننگے سر درس میں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ طریقۂ تعلیم بھی دُوسرے اساتذہ سے مختلف تھا۔ شروع میں طالب علم سے عربی عبارت پڑھواتے، پھر اُس کا بامحاورہ ترجمہ کرواتے۔ پھر مشکل الفاظ کی تشریح ہوتی۔ اس کے بارے میں امام مالکؒ اور دُوسرے ائمہ کا مسلک بیان فرماتے، آخر میں فقہ الحدیث بڑی خصوصیت سے ذکر فرماتے۔

بعض طلبہ جو صرف و نحو کے لحاظ سے اپنے رفقاء سے آگے تھے، لیکن با محاورہ ترجمہ کرنے میں سب سے پیچھے تھے۔ مولاناؒ انہیں اپنی زبان ترشوانے کی ترغیب دلاتے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم مؤطا کے گھنٹے کا شدت سے انتظار کرتے۔ جس دن ناغہ ہو جاتا ہمیں اس کا نہایت دُکھ ہوتا۔ مولاناؒ کے درس میں علم بھی تھا، وقار بھی، ادب بھی، زبان بھی، اختلافِ رائے کے باوجود ائمہؒ کا نام اتنے ادب و احترام سے لیتے کہ سُننے والوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے۔

مولانا علیہ الرحمۃ میں یہ خوبی بدرجۂ غایت موجود تھی کہ مسائل میں اعتدال کی راہ اختیار فرماتے۔ پُورا درس نہایت دلچسپ ماحول میں ہوتا۔ تکان اور یبوست نام کو نہ ہوتی جیسا کہ عام اساتذہ کے اسباق میں ہوتی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب اُنہیں کوئی علمی نکتہ بیان فرمانا ہوتا تو طلبہ کو پوری طرح اپنی طرف متوجّہ فرماتے اور کہتے العلم، العلم۔

بار بار سمجھانے کے بعد بھی کوئی مسئلہ کسی کے ذہن نشین نہ ہوتا تو آپ یا قلة العلم کے الفاظ فرماتے۔

ہمارے مدارس میں یہ بات دیکھی گئی ہے کہ بعض اساتذہ دورانِ درس طلبہ کو اپنے گردِ اس طرح جمع کیے رکھتے ہیں جیسے شہد کا چھتّہ مکھیوں کو، لیکن مولانا علیہ الرحمۃ حلقے کو وسیع کرنے پر بہت زور دیتے۔

آپ کے درس کی نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ دورانِ درس دُنیا کی کسی بات کا تذکرہ نہ فرماتے۔ اگر کوئی صاحب مُلاقات کے لیے آتے تو کیا مجال کہ آپ سے دورانِ درس بات کر سکے۔ آپ ہاتھ کے اشارے سے اُسے بیٹھنے کو کہتے۔ درس کے بعد اُس سے گفتگو فرماتے۔ آپ کے ہاں یہ طریقہ ہرگز رائج نہ تھا کہ مسندِ حدیث پر بھی بیٹھے ہُوئے ہیں اور دُنیاداری کے تذکرے بھی ہو رہے ہیں۔ آپ طلبہ کو مختلف نصیحتیں فرماتے رہتے۔ خریدِ کُتب اور مطالعے

کی طرف آپ خصوصیت سے توجّہ دلاتے۔ کُتبِ اصولِ فقہ کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا اگر میں یہ دعویٰ کروں کہ اصولِ فقہ پر جتنی کتابیں میرے پاس ہیں، پاکستان میں کسی عالمِ دین کے پاس نہیں ہیں تو یہ دعویٰ بے جا نہ ہوگا۔

ایک دفعہ آپ نے طلبہ سے خطاب کرتے ہُوئے فرمایا میں تمہیں شیخین (امام ابن تیمیہ، اور ابن قیم علیہما الرحمۃ) کی کُتب اپنے مطالعہ میں رکھنے کی تلقین کرتا ہوں۔ ان دونوں حضرات کے ہاں علم کے خزانے ہیں اور کوئی اہلِ علم ان سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ دورانِ درس آپ ضروری اشارات لکھواتے۔ غرض کہ درس اس طرز پر ہوتا کہ خود بخود ذہن نشین ہوتا جاتا۔

افسوس! کہ ہم آج ایسی جامع الصفات ہستی سے محروم ہیں جن میں علم بھی تھا، عمل بھی۔ نظم بھی تھا، وقار بھی، دین بھی تھا سیاست بھی۔ حسن بھی تھا اور سلیقہ شعاری بھی۔ جمال بھی تھا اور جلال بھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دل کو تقویٰ کے لیے منتخب کر لیا تھا اور اُس سے مزیّن کر دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ آپ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

ایں دُعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

اللّٰھم اغفرلہٗ وادخلہ جنّۃ الفردوس

میرے مشفق اُستاد

حافظ عبدالرشید
مدرس دارالعلوم تقویۃ الاسلام
لاہور

حضرۃ الاستاذ مرحوم سے میری پہلی ملاقات ہمارے گاؤں گوہڑ چک میں ہوئی۔ الیکشن کا زمانہ تھا۔ حضرت مولاناؒ ہمارے علاقہ میں انتخاب لڑ رہے تھے۔ پہلی دفعہ گوہڑ چک تشریف لائے۔ اُنہیں دیکھ کر دل کو رُوحانی طور پر خوشی ہُوئی۔ حضرت سے ملاقات کا شرف حاصل ہُوا۔ آپ اہلحدیث مسجد میں قیام پذیر تھے اور میرا تعلق اہل سُنّت والجماعت کی جامع مسجد سے تھا۔ مَیں نے عرض کیا کہ حضرت اہلحدیث تو آپ ہی کو ووٹ دیں گے، آپ جمعۃ المبارک کا خُطبہ ہماری مسجد میں ارشاد فرمائیں۔ حضرت نے بخوشی منظور فرما لیا اور جُمعہ کا خُطبہ مسجدِ حنفیہ میں ارشاد فرمایا۔ اس دن سے میری برادری حضرت کے شیدائیوں میں سے ہے۔

مَیں نے انتخاب میں چونکہ بڑا کام کیا تھا، اس لیے حضرت مولاناؒ کی خصوصی توجہ بندہ کی طرف ہو گئی۔ انتخاب کے بعد حضرت نے مجھے حکم دیا کہ مَیں دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے آجاؤں۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء میں مَیں نے دارالعلوم میں داخلہ لے لیا۔ حضرۃ الاستاذ سے مَیں نے مؤطا امام مالکؒ، حجۃ اللہ البالغہ، الفوز الکبیر اور تفسیر اتقان کے کچھ حصّے پڑھے۔

امام مالکؒ سے حضرۃ الاستاذ کو خصوصی تعلق تھا اور آپ فقہِ حنابلہ پر پُورا عبُور رکھتے تھے۔ جب حضرت پڑھانے کے لیے تشریف لاتے تو خوب اُجلا لباس پہن

کر اور خوشبو لگا کر درس ارشاد فرماتے۔

طلباء کی تعداد جو صرف مؤطّا امام مالک پڑھتے تھے، تقریبًا بائیس تھی لیکن عبارت اکثر مجھے پڑھنے کا حکم دیتے اور ایسے نکات بیان فرماتے کہ ہم حیران ہو جاتے کہ مولانا اتنی مصروفیات کے ہوتے ہوئے مطالعہ کب فرماتے ہیں۔ درس کے دوران میں ہال میں سنّاٹا چھا جاتا اور کوئی طالب علم ادھر اُدھر نہیں جھانکتا تھا۔ خود حضرت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ دورانِ سبق میں ڈی سی صاحب لاہور یا کوئی دُوسرا افسر تشریف لائے، حضرت سبق پڑھا رہے تھے۔ آپ نے اشارہ فرمایا کہ بیٹھ جاؤ۔ ڈپٹی کمشنر صاحب یا وہ افسر بیٹھ گئے۔

سبق سے فارغ ہو کر فرمایا کہ میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کی حدیث پاک پڑھا رہا تھا۔ حدیث کو درمیان میں چھوڑ کر دُوسری طرف توجّہ کرنا توہینِ حدیث سمجھتا ہُوں۔ (سُبحان اللہ)

دورانِ سبق میں پُورے جمال اور جلال کے ساتھ تشریف رکھتے اور طلباء کے سوالوں کا جواب اس طرح دیتے کہ دوبارہ سوال کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

یدع الجواب فلا یراجع ھیبۃً ادب الوقار وعز سلطان التقی
والسائلون نواکس الاذقانِ فھو المطاع ولیس ذا سُلطانِ

حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ کے آپ بڑے شیدائی تھے۔ حجۃ اللہ پڑھاتے وقت شاہ صاحبؒ کے فلسفۂ اسلام سے خوب لُطف اندوز ہوتے اور بڑے مزے لے لے کر پڑھاتے۔

اسی طرح الفوز الکبیر میں وہ تفسیری نکات بیان فرماتے کہ اگر آج بھی مجھے ان میں سے دورانِ تدریس یاد آجائیں تو حضرۃ مولاناؒ کے لیے زبان سے دُعائیں جاری ہو جاتی ہیں۔

غرض مولٰینا جس طرح سیاسی بصیرت کے حامل تھے، اس سے بڑھ کر حضرت کو درسِ نظامی کی کتابوں پر عبور حاصل تھا۔ صرف و نحو اور تفسیر و حدیث اور فقہ میں پوری دسترس رکھتے تھے۔

مولانا صاحبؒ، صاحبِ جلال و جمال تھے۔ ایک دفعہ نماز مغرب کا وقت تھا، اس وقت ہمارے اسباق کے ساتھی مولانا بشیر احمد صاحب پتو کی والے حضرت کے حکم سے دارالعلوم میں امامت کرایا کرتے تھے۔ امام صاحب ابھی وضو کر رہے تھے کہ اذان ختم ہو گئی۔ حضرت مولانا نے ایک دُوسرے طالب علم کو جماعت کرانے کا حکم فرمایا۔ مولوی بشیر صاحب فوراً بول اُٹھے کہ مَیں امام ہوں اور امام راتب کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر کسی کو امامت کرنے کی اجازت نہیں۔ حضرة مولانا صاحبؒ نے یہ بات سنی تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور مولوی بشیر کے وضو کرنے تک آپ اسی حالت میں رہے۔ مولوی بشیر صاحب نے جماعت کرائی۔ بعد میں حضرت نے فرمایا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے کہ مَیں نے آپ کی اجازت کے بغیر کسی دُوسرے کو امامت کے لیے کہہ دیا۔ میں بیمار ہوں، اتنی لمبی سیڑھیاں اُتر کر آتا ہوں۔ آپ بھی ذرا میرا خیال رکھا کریں۔"

اسی طرح کا ایک دُوسرا واقعہ ہے کہ ایک دن صبح کی اذان ہوئی تو مولانا فوراً نیچے تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ ابھی اذان کا وقت نہیں ہوا تھا بلکہ دو منٹ باقی تھے، اس لیے دوبارہ اذان کہو اور یہ بات حضرتؒ نے بڑے جلال میں کہی۔ نماز کے بعد وظیفہ مکمّل کر کے اُوپر تشریف لے گئے، پھر نیچے تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ صبح کی اذان وقت پر ہوئی تھی۔

ادرا الخطاء منی واللہ ورسولہ بریئان۔ جن لوگوں پر میں ناراض ہوا تھا، ان سے معافی چاہتا ہوں۔ آپ کے یہ الفاظ سن کر کئی نمازیوں کی آنکھوں میں آنسو

آ گئے۔ایک بزرگ اُن کا نام مجھے نہیں آتا۔غالباً حضرت سیّد میاں نذیر حُسینؒ کے خاندان میں سے تھے، وہ حضرت مولاناؒ کے اس فعل پر بڑے حیران ہُوئے اور زبان سے سُبحان اللہ سُبحان اللہ کافی دیر تک کہتے رہے۔ صدق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم من تواضع لِلّٰہ رفعہ اللہ

طلباء کے ساتھ اتنی شفقت فرماتے تھے کہ ہم طلباء میں اکثر مقابلے کراتے اور جیتنے والے کو انعام دیتے۔

ایک دفعہ میرے درمیان اور مولوی محمد حُسین صاحب طُور کے درمیان حضرت نے ایک مضمون پر مقابلہ کرایا تھا اور بندۂ عاجز کو خوب انعام سے نوازا اور علمِ دین کی خدمت کرنے کی دُعائیں دیں۔

اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ وادخلہ الجنّة الفردوس واجعل قبرہ روضة من ریاض الجنّة۔

مولانا سیّد محمد داؤد غزنویؒ

(چند یادیں، چند باتیں)

خالد بزمی ایم اے

مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی مرحوم کا نام پہلی بار میں نے حضرت مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ کی زبان سے جمعتہ المبارک کے ایک خطبے میں سُنا تھا جس میں غالباً وہ مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی کسی قید کا ذکر کر رہے تھے۔

یہ واقعہ آج سے تقریباً تیس برس پہلے کا ہے، جب میری عُمر زیادہ سے زیادہ دس بارہ برس ہوگی۔

اس واقعے کے کُچھ عرصہ بعد جب مولانا داؤد غزنوی مرحوم انڈین نیشنل کانگرس کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تو امرتسر کی مشہور اجتماع گاہ مسجد خیر الدین مرحوم (واقع ہال بازار) میں اُن کی تقریر کا اہتمام کیا گیا۔ میرے دل میں مولانا کی زیارت کا اشتیاق بہت پہلے سے موجود تھا۔ میں اُن کی تقریر کے بارے میں اعلان سن کر اپنے والدِ مرحوم اور بڑے بھائی کے ساتھ کشاں کشاں مذکورہ مسجد میں گیا۔ وہاں لوگ اس کثرت سے مولانا موصوف کے ارشادات سے مستفید ہونے کے لیے آئے تھے کہ جلسہ گاہ اپنی وسعتوں کے باوجود تنگیٔ داماں کا گلہ کر رہی تھی۔ لوگ ایک دُوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ مولانا ابھی تک تشریف نہیں لائے تھے۔ اُس روز اُنہیں لاہور سے وہاں پہنچنا تھا۔ لوگوں کا اشتیاق اور ہجوم دم بدم بڑھتا جا رہا تھا اور ان کی آنکھیں مولانا کے چہرے کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے مسجد کے بڑے دروازے پر لگی تھیں۔ عین اس کیفیت میں لاہور سے غالباً تار پہنچا یا ٹیلیفون پر اطلاع ملی کہ مولانا کو جس ہوائی جہاز سے

امرتسر پہنچنا تھا، انہیں اس میں جگہ نہیں مل سکی، اس لیے وہ تشریف نہیں لا سکے۔ اس خبر سے لوگوں کو سخت مایوسی ہوئی اور اُن میں سے اکثر ٹوٹے دلوں اور بوجھل قدموں کے ساتھ گھروں کو واپس گئے۔

منتظمینِ جلسہ نے مولانا کی جگہ پر سیّد خالد گیلانی اور مولوی بشیر اخگر کی تقریریں کرا دیں لیکن ظاہر ہے کہ جو لوگ فقط مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات سُننے کی غرض سے وہاں پہنچے تھے، اُنہیں اس وقت کسی اور مقرر سے کم ہی دلچسپی ہو سکتی تھی۔ ہم بھی انہی لوگوں میں شامل تھے جو مولانا کے نہ آسکنے کی خبر سُن کر گھروں کو واپس چلے آئے۔

اس واقعے کے کچھ عرصہ بعد برِصغیر پاک و ہند کے سیاسی حالات یکسر کچھ ایسی صُورت اختیار کر گئے کہ امرتسر کا شہر شعلوں کا مرکز بن گیا۔ یہاں تک کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک شاید امرتسر کا کوئی بھی فرد ایسا نہیں ہو گا جو پاکستان کی طرف ہجرت پر مجبور نہ ہو گیا ہو۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے اور امرتسر سے ہجرت پر مجبور ہو جانے کے باعث میں امرتسر میں مولانا کی زیارت نہ کر سکا اور اُنہیں پہلی بار دیکھنے کا موقع مجھے لاہور ہی میں آ کر نصیب ہو سکا۔

جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت میں ابھی سکُول کا طالب علم تھا اور آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ لاہور آنے کے بعد جب میں نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا، تو گھر والوں نے مجھے اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں داخل کرا دیا۔ یہاں میرے داخل ہونے کے چند ماہ بعد سیّد ابوبکر غزنوی صاحب اِسی کالج میں عربی کے لیکچرار کی حیثیت سے تشریف لے آئے۔ مَیں عربی کا طالب علم تھا۔ مجھے اُن سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہو گئی۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے نئے پروفیسر صاحب مولانا سیّد داؤد غزنوی ؒ کے فرزندِ ارجمند ہیں تو مجھے خاص طور پر اس لیے زیادہ خوشی ہوئی کہ میرے دل میں موروثی طور پر

خاندانِ غزنویہ کے لیے احترام و عقیدت کے دیرینہ جذبات موجود تھے۔ کچھ ہی عرصہ بعد پروفیسر صاحب کی بدولت مجھے مولانا داؤد غزنوی (مرحوم) کا قُرب حاصل کرنے میں بہت زیادہ مدد ملی اور اُن کی زیارت کے متعدّد مواقع حاصل ہو گئے جو میرے لیے ہمیشہ ہمیشہ باعثِ افتخار رہیں گے۔

مولانا مرحوم کی ذات میں قُدرت نے متعدّد اوصاف پیدا فرمائے تھے۔ میں ذاتی طور پر اُن کی جس خوبی کا سب سے زیادہ معترف ہُوں، وہ مسلک کے اعتبار سے اُن کی کشادہ دلی اور بلند نظری تھی۔ مَیں نے مولانا کی زبان سے کبھی ایسے الفاظ نہیں سُنے جن سے کسی بھی مسلک کے کسی شخص کی دلآزاری ہوتی ہو۔

مجھے اکثر اہلحدیث کے علاوہ بعض دُوسرے مسلک کے ایسے لوگوں سے مولانا کے بارے میں گفتگو کا موقعہ ملا جو کسی طرح بھی اپنے محدود دائروں سے باہر نکلنا پسند نہیں کرتے، لیکن مولانا کے بارے میں اُن لوگوں کی زبانوں پر بھی میں نے احترام اور عقیدت کے الفاظ سُنے۔ بلاشُبہ یہ اعتراف مولانا مرحوم کی عظمت کو بہت بڑا خراج ہے۔

مسلک کے اعتبار سے مولانا کی کشادہ دلی اور بلند نظری ہی کا نتیجہ تھا کہ دیگر مسالکِ حقّہ کے جیّد علماء مثلاً مفتی محمد حسنؒ، مولانا احمد علیؒ اور سیّد ابوالحسن علی ندوی وغیرہ سے مولانا کے مخلصانہ اور گہرے روابط تھے۔

مَیں نے دیکھا کہ حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ (بانی جامعۂ اشرفیہ لاہور) اپنی ایک ٹانگ سے محرومی اور فالج زدہ ہونے کے باوجود ایک بار ایک جیپ نما گاڑی میں مولانا داؤد غزنویؒ سے ملنے کے لیے شیش محل روڈ پر تشریف لائے۔

مولانا داؤد غزنویؒ اور مولانا احمد علی مرحوم کے درمیان جو محبت آمیز روابط تھے، ان سے

ان دونوں بزرگوں کے ملنے والے باخبر ہیں۔

مجھے مولانا احمد علی مرحوم کی زندگی میں اکثر مسجد شیرانوالہ میں جمعہ پڑھنے کا موقعہ ملا ہے۔ ایک بار مولانا احمد علی مرحوم جمعۃ المبارک کا خُطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ عورتوں کی صفوں سے کچھ شور سا سنائی دیا۔ مولانا نے شور کا سبب معلوم کرنا چاہا تو انہیں بتایا گیا کہ کوئی دو عورتیں حنفی اور وہابی کے سوال پر جھگڑ پڑی ہیں۔ مولانا احمد علی مرحوم نے یہ بات سُنی تو خطبے ہی میں فرمانے لگے:

"اس قسم کی فضول باتوں پر عورتیں کیوں جھگڑتی ہیں؟ ہم مردوں میں تو کبھی اس قسم کا اختلاف نہیں ہوتا۔ میں ہمیشہ عید کی نماز مولانا داؤد غزنویؒ کی قیادت میں ادا کرتا ہُوں۔"

مولانا احمد علیؒ کے ارادتمندوں نے کئی بار اُن سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ عید کی نماز الگ پڑھانے کا انتظام کریں، لیکن مولانا احمد علی مرحوم نے اپنی زندگی میں اس وضعداری میں کوئی فرق نہ آنے دیا اور آخری وقت تک عید کی نماز اقبال پارک لاہور میں مولانا داؤد غزنویؒ کی امامت ہی میں ادا فرماتے رہے۔

جب مولانا احمد علی مرحوم انتقال فرما گئے، تو مولانا داؤد غزنویؒ اپنی علالت اور نقاہت کے باوجود شیرانوالہ دروازہ سے یونیورسٹی گراؤنڈ تک جنازے کے ساتھ گئے اور مولانا احمد علی مرحوم کے اوصاف و محاسن یاد کر کے اُن کی وفات پر گہرے افسوس اور صدمے کا اظہار کرتے رہے۔

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی ایک موقعے پر پاکستان تشریف لائے اور لاہور میں بھی وُرود فرمایا۔ مولانا داؤد غزنوی مرحوم نے دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے طلبہ کی طرف سے انہیں مدعو فرمایا۔ اس موقعے پر سیّد صاحب موصوف نے دیگر فرمودات کے علاوہ خود مولانا داؤد غزنویؒ اور خاندانِ غزنویہ کے دیگر بزرگوں کی دینی اور علمی خدمات کے بارے میں جو کچھ ارشاد فرمایا وہ حقیقتاً بہت بڑا اعترافِ عظمت ہے۔

مفتی محمد حسنؒ، مولانا احمد علیؒ اور سید ابوالحسن علی ندوی ایسے بزرگوں کے ساتھ مولانا داؤد غزنوی مرحوم کے تعلقات ان کی شخصیت کی جامعیت اور ہمہ گیری کا بہت بڑا ثبوت ہیں۔

آج سے چند سال پہلے جب پنجاب یونیورسٹی نے "بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ" کا انتظام کیا تو اس موقعے پر مولانا داؤد غزنوی مرحوم نے بعض مندوبین کو دارالعلوم تقویۃ الاسلام میں چائے کی دعوت دی اور اس موقعے پر نہایت فصیح عربی میں خطبہ پیش فرمایا جسے معروف عرب عالمِ دین جناب مصطفٰے الزرقا، اور دیگر مصری و شامی مندوبین مذاکرہ نے قدر و تحسین کی نگاہ سے دیکھا۔

کچھ عرصہ بعد جب مصر کے ڈاکٹر فہام محکمۂ اوقاف کے مشیر کی حیثیت سے لاہور آئے تو پروفیسر سیّد ابوبکر غزنوی صاحب نے اسلامیہ کالج (سول لائنز) کی مجلسِ عربی و فارسی کی طرف سے اُن کو چائے کی دعوت دی۔ اِس تقریب کی صدارت مولانا داؤد غزنویؒ نے فرمائی اور اس موقعے پر بھی عربی میں نہایت شاندار خطبہ دیا۔

ڈاکٹر فہّام نے خطبہ سن کر مولانا مرحوم اور خاندانِ غزنویہ کی علمی اور دینی خدمات کا اعتراف نہایت زوردار الفاظ میں کیا۔ وہ اس موقع پر پروفیسر ابوبکر غزنوی صاحب کی عربی دانی اور زورِ خطابت پر بھی داد دیتے رہے۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد جہاں اکثر کل ہند سطح کی دینی تنظیمیں ختم ہوگئیں یا اگر حالات کی دستبرد سے بچ رہیں، تو بہت حد تک کمزور ہوگئیں، وہاں جماعت اہلحدیث کو بھی اس اعتبار سے کافی نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جماعت کے کئی علماء، کئی مدرسے اور کئی کتب خانے بھارت میں رہ گئے۔

یہ جماعت نہ جانے کب تک اسی حالت میں رہتی لیکن خدا نے اس جماعت

کی تنظیمِ نو کے عظیم مقصد کی بجا آوری کے لیے جس شخصیت کو منتخب کیا، وہ بھی مولانا سیّد داؤد غزنوی ؒ تھے۔ انہوں نے پاکستان میں جمعیتِ اہلحدیث کے نام سے اس جماعت کے وابستگان کو ایک نہج پر اکٹھے کیا اور توحید و سُنت کے نظریۂ عظیمہ کی اشاعت و تبلیغ کے لیے از سرِ نو کام کرنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں کچھ ہی دیر بعد ایسی عظیم الشّان کانفرنسوں کا اہتمام کیا گیا، جن کی مثالیں اس سے پہلے مفقود و معدوم تھیں۔

ایسے اجلاس مولانا کے ارادتمندوں اور عقیدت کیشوں کے لیے ان کی زیارت سے مستفید ہونے اور ان کے ارشادات سے راہنمائی حاصل کرنے کے لیے بہترین مواقع ہوتے تھے۔

راقم الحروف کو مولانا مرحوم کی ذات سے متعدّد فائدے پہنچے ہیں جو مجھے زندگی کے ہر مقام پر ہمیشہ یاد رہیں گے اور کبھی فراموش نہیں ہو سکیں گے۔

۱۹۵۶ء میں مجھے ایم اے (عربی) کا امتحان دینا تھا۔ نصاب میں کچھ کتابیں ایسی بھی شامل تھیں جو نہ بازار میں ملتی تھیں اور نہ لائبریریوں سے حاصل ہو سکتی تھیں۔ میں ایک روز مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے بر سبیلِ تذکرہ اُن سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کیا۔ مولانا نے فوراً مجھے اپنے ذاتی کتب خانے سے ایسی کتابیں مہیّا فرما کر میری ذہنی پریشانی دُور کر دی۔ اگر اس موقعے پر مجھے وہ کتابیں حاصل نہ ہو سکتیں تو میں اپنے مذکورہ امتحان کے سلسلے میں خاطر خواہ تیّاری نہیں کر سکتا تھا۔

۱۹۵۷ء میں میری چھوٹی ہمشیرہ کی شادی ہوئی۔ حسنِ اتفاق سے میری ہمشیرہ کے سسرال بھی مولانا مرحوم کے عقیدت مند اور ہم مسلک تھے۔ اس موقعے پر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اگر اس تقریب میں خطبۂ نکاح مولانا پڑھ دیں، تو یہ ہمارے لیے بہت بڑی سعادت ہو سکتی ہے۔ مولانا سے عرض کیا گیا، تو مولانا ازراہِ نوازش تشریف لے آئے اور اُنہوں نے نکاح کا خطبہ بھی ارشاد فرما دیا لیکن خطبے سے فارغ ہو کر فوراً تشریف لے جانے لگے۔ میں

نے عرض کیا: "آپ کھانے سے فراغت کے بعد تشریف لے جائیے"۔ فرمانے لگے: مجھے صرف نکاح پڑھانے کے لیے کہا گیا تھا۔ اُس وقت کھانا کھانے کا ذکر نہیں آیا تھا، اس لیے مَیں گھر سے کھانا کھا آیا تھا۔"

اس جواب سے میں ایک طرف اپنی کوتاہی پر نادم ہُوا اور دُوسری طرف مولانا کی اس اصول پسندی پر ششدر رہ گیا۔

۱۹۶۰ء میں میری شادی کا موقع آیا تو میرے دل میں یہ خواہش شدت سے گھر کر گئی کہ ایسا موقعہ تو زندگی میں عام طور پر ایک ہی بار آتا ہے، اگر میرا نکاح کسی اور نے پڑھایا تو میں ایک بہت بڑے اعزاز اور سعادت سے محروم رہ جاؤں گا۔ کیوں نہ اس بار بھی مولانا کو زحمت دی جائے اور اُن سے استدعا کی جائے۔

مَیں نے شادی سے ایک دو روز پیشتر اپنے محترم اُستاد پروفیسر سیّد ابوبکر غزنوی صاحب سے کہا:

"آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ مولانا کے گھر میں پیدا ہُوئے اور آپ کا نکاح انہوں نے پڑھایا۔ اے کاش! مجھے بھی یہ فخر حاصل ہو سکے اور زندگی کی یہ آرزو بھی پُوری ہو جائے۔"

پروفیسر صاحب موصوف نے میرا اشتیاق دیکھا تو فرمایا:

"آپ کوئی فکر نہ کیجئے۔ آپ کا نکاح بھی وہی پڑھائیں گے۔ آپ مطمئن رہیئے۔"

میری برات کے روز مولانا تشریف لائے اور مجھے یہ سعادت بھی نصیب ہو گئی۔ جس پر مَیں ساری زندگی فخر کر سکوں گا۔

مجھے کُچھ دیر مولانا کے ساتھ ہفت روزہ "الاعتصام" کی ادارت کے سلسلے میں بھی کام کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ میں اس واقعے کو بھی اپنے لیے باعثِ افتخار خیال کرتا رہوں گا۔

پروفیسر ابوبکر غزنوی صاحب کی شادی کے موقعے پر مولانا نے مجھے جو دعوت نامہ ارسال فرمایا وہ مولانا کے اپنے ہاتھ کا لکھّا ہوا تھا۔ یہ دعوت نامہ میرے پاس محفوظ ہے اور انشاءاللہ

ان کی یاد کے طور پر ہمیشہ میرے پاس محفوظ رہے گا۔ مولانا نے اس موقعے پر بہت کم لوگوں کو اپنے ہاتھ سے دعوت نامے لکھے تھے۔

مولانا اپنی وفاتِ حسرت آیات سے پہلے ایک طویل مدّت تک شدید علالت میں مُبتلا رہے۔ ایک موقعے پر ہسپتال سے کچھ دنوں کے لیے اپنے گھر تشریف لے آئے تو میں عیادت کے لیے حاضر ہُوا۔ اُن دنوں ڈاکٹروں نے انہیں عیادت کے لیے آنے والوں سے ملنے سے منع کر رکھّا تھا۔ مولانا کو میرے آنے کی خبر ہُوئی تو نقاہت کے باوجود بستر سے اُٹھ کر دُوسری منزل کی منڈیر تک آئے اور اپنے خادم محمد عمر کو آواز دے کر فرمایا:

"عمرؔ! نیچے بزمی صاحب آئے ہیں۔ اُن سے کہو کہ مَیں پہلے سے بہتر ہُوں۔"

علالت اور نقاہت کے باوجود مولانا کی آواز اسی طرح بارُعب اور گُونج دار تھی۔ مذکورہ الفاظ مَیں نے اپنے کانوں سے سُنے اور مطمئن ہو کر واپس آیا۔

مَیں نے اس مختصر مضمون میں دانستہ فقط چند یادوں اور چند باتوں کا ذکر کیا ہے جن میں سے اکثر میری ذات سے متعلّق ہیں۔ مولانا کے انتقالِ پُرملال کے بعد خاص طور پر علمی اور دینی حلقے ایک عظیم شخصیت سے محروم ہو چکے ہیں اور اُن کے عقیدتمندوں کی مشتاق نگاہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُن کی زیارت کے شرف سے محروم ہو چکی ہیں۔ مولانا کے علمی اور دینی مقام و فضیلت کا اندازہ کرنا اور اس کے بارے میں کچھ کہنا میرا منصب نہیں، اس سلسلے میں اُن کے بارے میں لکھنے والے علمائے کرام کے ارشادات اور اُن کی نگارشات سے استفادہ کرنا چاہیے۔

حضرت مولانا داؤد غزنوی رح

اور

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رح

کے باہمی تعلّقات

صاحبزادہ حافظ عبدالرحمٰن صاحب
خلف الرشید
حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رح

حضرت مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حضرت والد علیہ الرحمہ کے گہرے مراسم تھے اور یہ تعلقات للّٰہیت اور رُوحانیت کی اساس پر قائم تھے۔

آئندہ صفحات میں جو واقعات اور یادیں آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں، ان کی روایت حضرت مفتی صاحب کے صاحبزادہ مولانا حافظ عبدالرحمان صاحب نے کی ہے اور اُنہیں قلمبند عزیزم خالد بزمی صاحب نے کیا ہے۔ (مرتّب)

حافظ عبدالرحمٰن صاحب نے فرمایا:

مولانا داؤد غزنوی رح جب بھی میرے والدِ مرحوم کے پاس تشریف لاتے تو عام طور پر ان دونوں بزرگوں میں گفتگو علمی ہی ہوا کرتی تھی۔

مفتی محمد حسن مرحوم ایسی محفلوں کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ مولانا داؤد غزنوی جب بھی تشریف لاتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ ہم دونوں کے درمیان علمی گفتگو ہوتی رہے۔ مفتی صاحب نے ایک موقع پر یہ بھی فرمایا کہ

"اللہ تعالٰے نے مولانا داؤد غزنوی کو وہ فہم اور بصیرت عطا فرمائی ہے کہ اُن کی گفتگو سے میری علمی پیاس بجھتی ہے۔

اِس موقع پر حافظ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ حضرت مُفتی محمد حسن، حضرت مولانا داؤد غزنوی کے والدِ گرامی حضرت مولانا عبدالجبّار غزنوی کے شاگرد تھے۔ مُفتی صاحب ایک زمانے میں ہزارہ میں اپنے ایک اُستاد مولانا محمد معصوم صاحب سے پڑھتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا عبدالجبّار

غزنویؒ نے مولانا محمد معصوم کو مدرّس کی حیثیت سے اپنے مدرسۂ غزنویہ میں بلا لیا۔ مفتی صاحب اپنے پہلے اُستاد مولانا محمد معصوم کے ساتھ ہی اس مدرسے میں چلے آئے۔ یہاں انہیں مولانا عبدالجبّار غزنویؒ سے پڑھنے کا موقع ملا اور اُنہوں نے دَورۂ حدیث کی تکمیل یہیں کی۔ یہاں مولانا داؤد غزنویؒ اور مفتی محمد حسنؒ صاحب دونوں ہم درس تھے۔

حضرت مفتی محمد حسنؒ فرماتے تھے:

"مولانا داؤد غزنویؒ ایک بہت بڑے ولی کے صاحبزادے ہیں اور خود بھی ولی ہیں گویا ولی ابنِ ولی ہیں۔"

مولانا داؤد غزنویؒ اور حضرت مفتی صاحب کے درمیان جو محبت تھی، وہ عشق کے درجے میں تھی۔ مفتی صاحب نے ایک موقع پر کہا تھا:

"مولانا داؤد غزنویؒ کو نسبتِ باطنی حاصل ہے اور نسبتِ باطنی ایک دولتِ عظمیٰ ہے جو سخت مجاہدات اور ریاضتوں کے بعد ایک بندے کو اپنے اللہ سے حاصل ہوتی ہے۔

حضرت مفتی محمد حسنؒ کی رائے میں مولانا داؤد غزنویؒ صاحبِ قال نہ تھے، بلکہ صاحبِ حال تھے، وہ جب آخرت کے بارے میں گفتگو فرماتے تو لوگوں کو یوں محسوس ہوتا تھا گویا وہ جنّت اور جہنّم کا مشاہدہ کر کے باتیں کرتے ہیں۔

مولانا داؤد غزنویؒ اور مفتی محمد حسنؒ کی ملاقاتوں میں بعض اوقات مفتی محمد شفیع صاحب بھی شامل ہوتے تھے۔ مولانا داؤد غزنویؒ اور مفتی محمد شفیع صاحب کے درمیان بھی گہرے روابط تھے۔

مفتی محمد شفیع صاحب نے مولانا داؤد غزنویؒ اور مفتی محمد حسنؒ دونوں کی وفات کے بعد ایک محفل میں فرمایا تھا۔ اب میرا کراچی سے لاہور آنے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ مجھے مولانا داؤد غزنویؒ اور مفتی محمد حسنؒ نظر نہیں آتے اور مَیں اُن دونوں کی علمی گفتگوؤں سے محظوظ نہیں ہو سکتا

مفتی محمد حسنؒ نے ایک بار مولانا عبدالجبار غزنویؒ کی ولایت کا ایک واقعہ سنایا۔ وہ واقعہ یوں تھا کہ امرتسر میں ایک محلّہ تیلیاں تھا، جس میں اہلحدیث حضرات کی اکثریت تھی۔ اس محلّے کی مسجد اسی نسبت سے مسجد تیلیاں والی کہلاتی تھی۔ وہاں عبدالعلی نامی ایک مولوی امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ وہ مدرسۂ غزنویہ میں مولانا عبدالجبّار غزنویؒ سے پڑھا کرتے تھے ایک بار مولوی عبدالعلی نے کہا کہ ابُو حنیفہ سے تو میں اچھا اور بڑا ہُوں کیونکہ اُنہیں صرف سترہ حدیثیں یاد تھیں اور مجھے اُن سے کہیں زیادہ یاد ہیں۔

اس بات کی اطلاع مولانا عبدالجبار غزنویؒ کو پہنچی، وہ بزرگوں کا نہایت ادب و احترام کیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے یہ بات سُنی تو اُن کا چہرۂ مُبارک غُصّے سے سُرخ ہوگیا۔ اُنہوں نے حکم دیا کہ اس نالائق (عبدالعلی) کو مدرسے سے نکال دو۔ وہ طالب علم جب مدرسے سے نکالا گیا تو مولانا عبدالجبّار غزنویؒ نے فرمایا:

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ شخص عنقریب مرتدّ ہو جائے گا۔"

مُفتی محمد حسنؒ راوی ہیں کہ ایک ہفتہ نہ گُزرا تھا کہ وہ شخص مرزائی ہوگیا اور لوگوں نے اُسے ذلیل کر کے مسجد سے نکال دیا۔

اس واقعہ کے بعد کسی نے امام صاحب مولانا عبدالجبار غزنویؒ سے سوال کیا:

"حضرت! آپ کو یہ کیسے علم ہوگیا تھا کہ وہ عنقریب کافر ہو جائے گا۔"

فرمانے لگے کہ جس وقت مجھے اس کی گُستاخی کی اطلاع ملی، اُسی وقت بخاری شریف کی یہ حدیث میرے سامنے آگئی کہ:

مَنْ عَادَى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ (حدیث قدسی)

(جس شخص نے میرے کسی دوست سے دشمنی کی تو میں اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہوں)

میری نظر میں امام ابوحنیفہؒ ولی اللہ تھے۔ جب اللہ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہوگیا، تو

جنگ میں ہر فریق دُوسرے کی اعلیٰ چیز کو چھینتا ہے۔ اللہ کی نظر میں ایمان سے اعلیٰ کوئی چیز نہیں، اس لیے اس شخص کے پاس ایمان کیسے رہ سکتا تھا۔

اپنے انتقال سے پیشتر مولانا داؤد غزنویؒ کافی عرصہ تک بیمار، مضمحل اور کمزور رہے۔ وہ بعض اوقات اپنی کمزوری اور نقاہت کے باوجود مفتی محمد حسنؒ صاحب سے ملاقات کے لیے جامعہ اشرفیہ تشریف لاتے۔ ان دنوں جامعہ نیلا گنبد کے پاس انارکلی بازار کی مول چند سٹریٹ میں تھا۔ مفتی صاحب چوتھی منزل پر مقیم تھے۔ مولانا داؤد غزنویؒ وہاں تشریف لاتے تو سیڑھیاں چڑھ کر چوتھی منزل تک پہنچتے اور بعض اوقات سیڑھیوں میں رُک کر دم لیتے تھے، لیکن ملاقات کے معمول میں فرق نہ آنے دیتے تھے۔

مَیں مولانا داؤد غزنویؒ اور والدِ گرامی کی ملاقات کے وقت اکثر پاس ہوتا تھا کیونکہ چائے وغیرہ کا انتظام میرے ہی سپرد تھا۔ پھر جب مولانا داؤد غزنویؒ واپس تشریف لے جاتے تو اُن کے لیے تانگے کا بندوبست بھی میری ذمّہ داری تھی۔ اس خدمت اور مفتی صاحب سے نسبتِ فرزندی کے باعث مولانا مجھ پر خاص شفقت فرمایا کرتے تھے۔

مولانا داؤد غزنویؒ ایک شگفتہ مزاج بزرگ تھے۔ اُن کی گفتگو سے میرے والدِ گرامی بہت محظوظ ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار مولانا گفتگو کرتے کرتے کچھ دیر کے لیے رُکے، تو والد صاحب نے کہا:

پھر ذرا مطرب! اُسی انداز سے
جاگ اُٹھے مُردے تری آواز سے

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ایک اپریشن میں مفتی صاحب کی ایک ٹانگ کٹ چکی تھی۔ اُنہوں نے مولانا داؤد غزنویؒ کی گفتگو سے خوش ہو کر فرمایا:

"مَیں تو جسمانی طور پر معذور ہوں، آپ کی باتوں سے میرے جسم میں زندگی آتی ہے۔"
مولانا داؤد غزنویؒ اور والد صاحب میں زیادہ تر آخرت کی باتیں ہوتی تھیں ایسی ملاقاتوں میں اکثر میں نے اُنہیں روتے ہوئے دیکھا ہے۔

ایک دفعہ مولانا داؤد غزنویؒ والد صاحب کے پاس تشریف لائے۔ اُن کے سامنے چائے رکھی گئی۔ مولانا داؤد غزنویؒ نے کسی وجہ سے کچھ دیر توقّف فرمایا تو والد صاحب نے کہا: "آپ چائے پیتے کیوں نہیں؟" پھر مُفتی صاحب نے کہا: "دیکھیے مَیں نے یہ نہیں کہا کہ "آپ چائے پئیں"۔ کیونکہ اس صُورت میں مطلب یہ ہوتا کہ دراصل چیز تو میری ہے لیکن آپ حاصل کر سکتے ہیں اور پہلی صُورت میں مفہوم یہ ہے کہ یہ چیز آپ ہی کا حِصّہ ہے، پھر آپ استعمال کیوں نہیں کرتے؟

اِس نُکتے پر مولانا داؤد غزنویؒ نے ذُومعنین بات کہی۔ فرمایا: "واہ مُفتی صاحب! یہ آپ ہی کا حِصّہ ہے۔"

ایک زمانے میں مولانا داؤد غزنویؒ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کی تفسیر نہایت شوق سے پڑھا کرتے تھے۔ اُن دنوں وہ جب کبھی مُفتی صاحب سے ملنے تشریف لاتے تو اُس تفسیر کے بارے میں اپنے خوشگوار تاثّرات بیان فرماتے تھے۔ ایک روز فرمانے لگے کہ مولانا تھانویؒ کی تفسیر کے مطالعے کے دَوران بعض اوقات میرا جی چاہتا ہے کہ مَیں اُن کا کوئی فقرہ یا لفظ بدل دوں لیکن آخر غور و خوض کے بعد مَیں اس نتیجے پر پہنچتا ہُوں کہ وہاں وہی فقرہ یا لفظ ٹھیک بیٹھتا ہے۔

یہ بات سُن کر مُفتی صاحب نے جواب میں کہا:

"یہ فہم بھی آپ ہی کو عطا ہُوا ہے، یہ بھلا کس کس کو نصیب ہے۔"

مولانا غزنویؒ اور حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ کی ملاقاتوں کا مقصد زیادہ تر ایمان تازہ کرنا اور آخرت کی یاد تھا۔

والد صاحب اکثر مولانا داؤد غزنویؒ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے:

مجھے مولانا داؤد غزنویؒ کی بیباکی اور دلیری بہت پسند ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی بات ہو تو میں اُن سے کہہ دوں اور وہ آگے لوگوں تک پہنچا دیں کیونکہ اُن کی تقریر کا انداز بہت واضح اور دل نشیں ہے۔ بات اُن کے دل سے نکلتی ہے اور دلوں میں جاگزیں ہو جاتی ہے۔

مفتی صاحبؒ اور مولانا داؤد غزنویؒ دونوں میں اس قدر بے تکلفی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے اپنی باتیں چھپاتے نہیں تھے۔ جب مفتی صاحبؒ کی ٹانگ اپریشن کے ذریعے کاٹ دی گئی تو ایک روز مولانا داؤد غزنویؒ والد صاحب کی عیادت کے لیے ہسپتال میں تشریف لائے۔ وہاں مولانا سیّد سلیمان ندویؒ پہلے سے موجود تھے۔ اُنہوں نے مولانا داؤد غزنویؒ کو یہ واقعہ سنایا کہ مفتی صاحب نے اپریشن کے وقت بے ہوشی کا ٹیکہ لگوانے سے انکار کر دیا تھا اور ڈاکٹروں سے کہا تھا کہ آپ لوگ اپنا کام کریں، مَیں اپنا کام کروں گا اور وہ کام یہ تھا کہ مفتی صاحب اس وقت اللہ کی یاد میں محو ہو گئے تھے۔

اس موقع پر مفتی صاحب نے بتایا کہ اپریشن کی رات بھی اُن کی نمازِ تہجد فوت نہیں ہوئی تو مولانا داؤد غزنویؒ یہ سن کر آبدیدہ ہو گئے۔

گزشتہ سال میری والدہ حج کے لیے تشریف لے گئیں۔ وہاں ایک روز مدینہ منورہ میں ایک وظیفے کے سلسلے میں مولٰنا داؤد غزنویؒ کا ذکر اس طرح آیا کہ والدہ نے وہ وظیفہ پڑھا اور فرمایا: یہ وظیفہ تمہارے والد کو مولانا داؤد غزنویؒ نے بتایا تھا اور کہا تھا کہ صبح کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان یہ چالیس بار پڑھنا چاہیے۔ وہ وظیفہ یہ تھا:

يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ۔

یہ واقعہ سُن کر مجھے خیال آیا کہ مولانا داؤد غزنویؒ اور والد صاحبؒ کے درمیان اکثر تبادلۂ افکار کی جگہ تبادلۂ اذکار بھی ہوا کرتا تھا۔

میرے والد صاحب نے ایک موقع پر مجھے یہ واقعہ سنایا کہ ایک دن مولانا داؤد غزنویؒ آئے اور کہنے لگے:

"میں درود شریف پڑھتا ہوں تو اُس کی عظمت بڑھانے کے لیے کچھ اور کلمات اس میں شامل کر لیتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ یہ بے ادبی یا سُنّت کی خلاف ورزی تو نہیں؟"

یہ بات ہو رہی تھی کہ اچانک مولانا محمد ادریس کاندھلوی تشریف لے آئے۔ مُفتی صاحب نے اُنہیں مخاطب کر کے کہا۔ آیئے مولانا! اس وقت آپ کی ضرورت پڑ گئی۔ پھر انہیں مولانا داؤد غزنویؒ کا سوال سُنایا۔ مولانا ادریس صاحب نے کہا۔ اس میں کوئی اشکال نہیں اور قرآن کی اس آیت سے استنباط فرمایا کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

اس میں صَلُّوْا اور سَلِّمُوْا کے صیغے مطلق ہیں۔ اس اطلاق میں یہ خاص شکل بھی شامل ہے۔

مُفتی صاحبؒ نے یہ بات سُنی تو فرمایا:

"جزاک اللہ! آپ نے خوب جواب دیا۔

مولانا داؤد غزنویؒ، مفتی محمد حسنؒ اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی کبھی محفل میں یکجا ہوتے تو گفتگو میں مزید شگفتگی پیدا ہو جاتی تھی۔

مولانا ادریس صاحب اپنے ضعفِ جسمانی کے باعث دو سجدوں کے درمیان ذرا وقفہ کرتے ہیں۔ مولانا داؤدؒ ایک بار یہ صورت دیکھ کر فرمانے لگے:

"مولانا محمد ادریس کاندھلوی قولاً حنفی ہیں لیکن عملاً اہلحدیث ہیں۔"

مفتی صاحبؒ نے اس بات سے محظوظ ہو کر کہا:

"کیوں نہ ہوں، حدیث کے اُستاد ہیں۔"

اس سے آپ اِن بزرگوں کی بے تعصبی اور وسعتِ مسلک کا اندازہ کر سکتے ہیں!

والدِ محترم کی وفات کے بعد ایک بار مولانا داؤد غزنویؒ کی علالت کی خبر آئی۔ میں اس خیال سے عیادت کو نہ جا سکا کہ بہت سے لوگ آتے ہوں گے اور مولانا کی استراحت میں خلل ہوگا۔ آخر ایک روز رہ نہ سکا اور حاضرِ خدمت ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر مولانا فرمانے لگے:

"آپ کے والد تو مجھ سے بڑی محبّت کرتے تھے، آپ نے آنے میں اتنی دیر کر دی۔"

واقعتاً اِن دونوں بزرگوں کے رگ و ریشہ میں ایک دُوسرے کی محبّت رچی ہُوئی تھی۔ جب مولانا داؤد غزنویؒ مفتی صاحبؒ سے ملنے تشریف لاتے تو مفتی صاحبؒ کے چہرے پر خوشی کی لہر پھیل جاتی تھی، وہ الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔

جب پاکستان کے ۳۳ عُلماء نے متفقہ طور پر اسلامی دستور کے نفاذ کے لیے ۲۲ نکات طے کیے، تو اجلاس کی صدارت مفتی صاحبؒ کر رہے تھے۔ اس بات پر بحث ہو رہی تھی کہ الفاظ کیا ہوں:

- قانون اسلام کے مطابق ہوگا یا
- قانون اسلام کے منافی نہیں ہوگا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا احتشام الحق تھانوی بحث میں زیادہ حصّہ لے رہے تھے کُچھ دیر کے بعد مُفتی صاحب نے مولانا داؤد غزنوی سے کہا:

"مولانا! آپ بھی تو کچھ فرمائیں نا۔"

اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مُفتی صاحب، مولانا داؤد غزنوی کی رائے کو کس قدر صائب اور وقیع سمجھتے تھے۔

ایک بار مولانا داؤد غزنویؒ میرے والد صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ باتوں باتوں میں اُنہوں نے ایامِ قید کا قصّہ سناتے ہُوئے کہا:

"مجھے جیل میں اتنی تکلیفیں پہنچیں کہ بعض اوقات میرا دم گھٹنے لگتا تھا۔ ایک بار جیل کی کوٹھڑی میں اس قدر حبس تھا کہ اندر ہوا بالکل نہیں آ رہی تھی اور مَیں دروازے کی دہلیز کے پاس ناک لگا کر باہر کی ہوا حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔"

یہ واقعہ سُن کر مُفتی صاحب بے چین ہو گئے اور کہنے لگے:

"مولانا! بس کیجیے، سُننے کی ہمّت نہیں۔"

پھر مُفتی صاحب نے کہا. بزرگوں نے سچ کہا ہے:

اَلْعَطَایَا عَلٰی مَتْنِ الْبَلَایَا

اور اَلْمُشَاهَدَةُ بِقَدْرِ الْمُجَاهَدَةِ

آپ کا موجودہ مقام اسلام کی خاطر انہی تکالیف کے باعث ہے۔

پھر مُفتی صاحب نے کہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس شعر کے مصداق ہیں:

ابرِ رحمت ہے سراسر یہ بلاؤں کا ہجوم
صبر کر اے دل! کہ اب فضلِ خُدا ہونے کو ہے

اس کے بعد مُفتی صاحب نے یہ دو شعر بھی پڑھے:

مصائب میں اُلجھ کر مُسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں میں اشک برسانا نہیں آتا
نگاہیں جن کی پڑ جاتی ہیں مستقبل کے چہرے پر
اُنہیں ماضی کے افسانوں کو دُہرانا نہیں آتا

آپ ان مصائب کے مقابلے پر کیسے ڈٹے رہے ! اللہ اکبر

مُفتی محمد حسنؒ کا انتقال کراچی میں ہُوا۔ اُن دنوں میرے دو بھائی عبیداللہ اور فضل الرحیم حج کر کے کراچی آ رہے تھے مُفتی صاحب اسی خیال سے کراچی چلے گئے کہ دونوں کا استقبال بھی کر لیں گے اور دوستوں سے بھی مِل لیں گے۔

اس موقعے پر مولانا داؤد غزنویؒ، مفتی صاحبؒ کو کراچی کے سفر سے روک رہے تھے۔ ایک بار اُنھوں نے غصّے سے کہا:

"مجھے اُس ڈاکٹر سے ملائیے جس نے آپ کو اجازت دی ہے"۔

پھر جب مفتی صاحب بعض اعزّہ کی خواہش پر سفر کے لیے روانہ ہو گئے تو لاہور کے ہوائی اڈّے پر کہنے لگے:

"سب لوگوں نے مجھے لاہور سے نکال دیا لیکن داؤد غزنوی نے نہیں۔ وہ مجھے اب تک اجازت نہیں دے رہے ہیں"۔

اُس وقت کسی کو کیا خبر تھی کہ یہ سفر مُفتی صاحب کا سفرِ آخرت ثابت ہو گا۔

ایک بار مولانا داؤد غزنویؒ، مُفتی صاحبؒ سے کہنے لگے۔ مَیں نے بیان القرآن میں مولانا تھانویؒ کا ایک استنباط دیکھا جو مجھے بہت پسند آیا ہے۔ مذکورہ استنباط اس آیت کے ضمن میں تھا: وَمَا یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَ

اُس روز بہت دیر تک دونوں میں زیادہ باتیں حضرت تھانویؒ ہی کے بارے میں ہوتی رہیں۔ اس موقعے پر مولانا داؤدؒ کہنے لگے۔ "مجھے حضرت تھانویؒ سے نہایت اُنس ہے لیکن وہ امام ابنِ تیمیہؒ کے بارے میں بڑے سخت ہیں لیکن مَیں مؤخر الذکر کو اسلام کی شمشیرِ برہنہ سمجھتا ہوں۔"

مُفتی صاحب نے یہ سُن کر تبسّم فرمایا۔

آپ نے دیکھا کہ مولانا داؤد غزنویؒ کس قدر صاف گو تھے۔ وہ اختلاف کی بات بھی واضح طور پر کہہ دیتے تھے۔

ایک روز مولانا داؤد غزنویؒ فرمانے لگے:

"مَیں جب ذکرِ الٰہی میں مشغول ہوتا ہوں تو کبھی جی چاہتا ہے کہ درود پڑھوں اور کبھی جی چاہتا ہے کہ بعض دُوسرے اذکار میں سے کچھ پڑھوں۔ اس سلسلے میں انسب کیا ہے؟"

مُفتی صاحبؒ نے کہا: یہ سوال ایک بار میرے بھی دل میں پیدا ہوا تھا اور مَیں نے حضرت تھانویؒ کو لکھا کہ آپ نے مجھے جو وظیفہ بتایا تھا، اُس سے فراغت کے بعد کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ فلاں ذکر کروں اور کبھی جی میں آتا ہے کہ فلاں ذکر کروں۔ اس سلسلے میں میری رہنمائی فرمایئے۔

حضرت تھانویؒ نے جواب میں لکھا:

یہ سب دسترخوانِ باطنی کے کھانے ہیں۔ جب ایک میز پر بہت سے کھانے پڑے ہیں تو اُن میں ترتیب قائم نہیں کی جا سکتی۔ ایسے ہی اوراد و اذکار میں بھی طبیعت کے مطابق عمل کیا جا سکتا ہے۔

مولانا داؤدؒ یہ بات سن کر بولے:

"جزاک اللہ! آپ نے میرے دل سے بڑا بوجھ اُتار دیا۔

ایک روز مولانا داؤد غزنویؒ والد صاحبؒ سے فرمانے لگے:

مشکوٰۃ کی بہت سی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں مُلّا علی قاری کی تعبیرات بہت اچھی لگتی ہیں۔ مثلاً

فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلَى أَدْنَاكُمْ

اِس میں مُلّا علی قاری نے یہ نکتہ پیدا فرمایا ہے کہ عالم کا جاہل سے مقابلہ نہیں کیا گیا بلکہ عابد کے ساتھ ہے کیونکہ نفلی عبادت کے مقابلے میں علم حاصل کرنے میں وقت لگانا افضل ہے۔ مُفتی صاحب یہ بات سُن کر بہت محظوظ ہوئے۔

مولانا داؤد غزنویؒ علمی نکات سے لذت حاصل کرتے تھے۔ ایک بار کہنے لگے قرآن میں آیا ہے:

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

اس میں مال کے ساتھ بنون (بیٹوں) کو دنیوی زندگی کی زینت کہا گیا ہے، بنات (بیٹیوں) کو نہیں کیونکہ وہ پردے کی چیز ہیں۔

ایک موقعے پر مُفتی محمد حسنؒ صاحب نے مولانا داؤد غزنویؒ کے بارے میں فرمایا:

" داؤد غزنوی علم میں بے نظیر، عمل میں بے نظیر اور تواضع میں بھی بے نظیر ہیں۔ وہ ان اوصاف میں حدِ کمال تک پہنچے ہوئے ہیں۔"

ایک بار مولانا داؤد غزنویؒ تشریف لائے تو فرمانے لگے:

"مُفتی صاحب! تصوّف کے بارے میں کوئی اچھّی کتاب بتائیے۔"

مُفتی صاحب نے کہا: آپ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب "تعلیم الدین" دیکھ لیجیے۔

مولانا داؤدؒ نے بازار سے کتاب منگوائی تو اُس میں تصوّف کا باب شامل نہیں تھا۔

اس پر مُفتی صاحب نے انہیں اپنا نسخہ دے دیا اور فرمایا:

"میں سمجھتا ہُوں کہ اصلی صُوفی تو اہلحدیث کو ہونا چاہیے کیونکہ احادیث کی کتابوں میں حسد، کینہ، کبر، غضب وغیرہ کے ابواب آتے ہیں جن میں ان بدعادات سے اجتناب کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کے برعکس فقہ کی کُتب میں ایسے ابواب نہیں ہیں۔"

اس موقعے پر مُفتی صاحب نے مولانا کو مخاطب کر کے فرمایا:

"مولانا! آپ کو دیکھ کر میرا جی بہت خوش ہوتا ہے۔"

مجھے خود مولانا داؤد غزنویؒ سے دلی اُنس تھا۔ وہ جب بھی تشریف لاتے، میں نہایت دلچسپی سے اُن کی باتیں سُنا کرتا تھا اور میرا جی چاہتا تھا کہ مولانا یُونہی تشریف فرما رہیں اور میں اُنہیں دیکھتا رہوں۔

مولانا سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی نظر میں

انٹرویو از : عابد نظامی

سوال : مولانا داؤد غزنوی علیہ الرحمہ سے آپ کی پہلی مُلاقات کب اور کہاں ہُوئی تھی ؟

جواب : میرا اُن سے ابتدائی تعارف تحریکِ خلافت کے زمانے میں ہوا تھا، لیکن اب یہ یاد نہیں کہ وہ تعارف کب اور کہاں ہُوا تھا۔ اُس وقت سے ہم دونوں ایک دُوسرے کو جانتے تھے لیکن تقسیم سے قبل کچھ زیادہ میل جول کا اتفاق نہیں ہوا تھا، کیونکہ مَیں دہلی یا حیدر آباد میں تھا اور وہ پنجاب میں تھے۔

تقسیم کے بعد البتّہ کچھ ملاقات بڑھی، لیکن زیادہ تر مَیں اپنے کاموں میں مشغول رہا اور وہ اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اِلّا یہ کہ کسی مجلس یا کمیٹی میں یکجا ہوتے ہوں۔

۱۹۵۱ء میں جب پاکستان کے تینتیس ۳۳ عُلمائے نے اسلامی دستور کے بائیس ۲۲ نکات طے کیے، اُس مجلس میں ہم دونوں شریک تھے۔

۱۹۵۲ء میں خواجہ ناظم الدین کی دستوری ترامیم پر نظرِ ثانی کے لیے اُنہی علماء کا دوبارہ اجتماع ہُوا تو ہم دونوں پھر شریکِ مجلس رہے۔

پھر ایوب صاحب کے فیملی لاز آرڈی ننس کے خلاف عُلماء نے جو تنقید کی تھی، اُس میں بھی ہم شریک رہے۔ جب ایُوب صاحب نے دستوری سوالنامہ جاری کیا اور علماء کی طرف سے اُس کا مشترکہ جواب دیا گیا، تو اُس میں بھی مَیں

اور وہ برابر شریک رہے۔ اِس طرح مسلسل بعض اہم مواقع پر مجھے اُن کے ساتھ شمولیّت کا موقع حاصل رہا۔ باہم کم ملنے کے باوجود ہم خیالی کی وجہ سے ہمارے درمیان محبّت اور اخلاص کے تعلقات تھے۔

سوال: آپ کو اُن کی شخصیّت کا کونسا پہلو خاص طور پر سب سے زیادہ پسند تھا؟

جواب: اُن کی شخصیت کا یہ پہلو خصوصاً مستحسن تھا کہ وہ جب سے قومی زندگی میں نمایاں ہو کر آئے، اُنہوں نے ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے اخلاص کے ساتھ کام کیا۔ اُن کی زندگی میں کبھی دورنگی نہیں پائی گئی۔ مَیں چونکہ خود یک رنگ آدمی ہُوں، اِس لحاظ سے مجھے اُن کی یک رنگی زیادہ پسند تھی۔

سوال: اُن کی وسعتِ مشرب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: مَیں نے اُن کو کبھی تنگ نظر اور متعصب نہیں پایا۔ مُسلمانوں کے مِلّی مسائل میں وہ کسی تعصّب کے بغیر دُوسرے مسلک کے لوگوں کے ساتھ تعاون کرتے تھے اور اپنا ایک مَسلک رکھنے کے باوُجود دوسرے مسلک کے لوگوں کے خلاف جنگ آزمائی کبھی اُن کا طریقہ نہیں رہا۔

سوال: مولانؒا کے علمی میلانات کے بارے میں آپ کی رائے؟

جواب: وہ بہرحال ایک عالم و فاضل آدمی تھے۔ اُن کے علم و فضل میں کسی شک و شُبہ کی گنجائش نہیں۔ جو شخص اُن سے مِلتا تھا، وہ اُن کے علم و فضیلت اور شریفانہ طرز سے متأثر ہوتا تھا۔

سوال: آپ دونوں کو جیل میں اکٹھے رہنے کا کوئی موقع تو نہیں ملا؟

جواب: نہیں ہم دونوں کبھی جیل میں اکٹھے نہیں رہے۔

سوال: سُنا ہے کہ مدینہ منورہ میں آپ دونوں ایک ہی ہوٹل میں مقیم رہے۔ اس قیام و ملاقات کی کوئی تفصیل؟

جواب: مدینہ منوّرہ میں ملاقات کی صورت یہ تھی کہ وہ مدینہ یونیورسٹی کی کونسل کی میٹنگ میں شریک ہونے کے لیے وہاں گئے ہوئے تھے اور یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں بھی وہاں گیا ہوا تھا۔ ہم دونوں وہاں ایک ہی ہوٹل "فندق التیسیر" میں مقیم تھے۔ اِس قیام کے دَوران میں ایک روز یکایک مجھے معلوم ہُوا کہ انہیں دل کا دَورہ پڑا ہے۔ مَیں یہ افسوسناک خبر سن کر فوراً اُن کے پاس گیا اور جو کُچھ خدمت میرے بس میں تھی، وہ مَیں نے انجام دی اور جب تک انہیں افاقہ نہ ہو گیا، مَیں برابر اُن کے کمرے میں جاتا رہا۔

مولٰنا مودودی نے اس سوال کے جواب کے آخر میں فرمایا:

یہ بات میرے خیال میں قابلِ ذکر نہ تھی، مگر آپ نے پُوچھا ہے، اس لیے مَیں نے ذکر کر دیا، ورنہ یہ میرا اخلاقی فرض تھا۔

مولانا غزنوی کا حکیمانہ اندازِ تبلیغ

مولانا عبدالماجد دریا آبادی

مولانا محمد داؤد غزنوی مرحوم سے متعلق اخباروں میں غیر مسلموں کے لکھے ہوئے مضمون نظر سے گزرے کہ مرحوم جب جیل میں جاتے، تو اُن کے فیضِ اثر سے دہریے میں خدا پرستی اور مُشرک میں توحید پیدا ہونے لگی اور وہ دونوں اسلام سے قریب تر ہو گئے ـــ جب سے یہ پڑھا' مولانا کی قدر و وقعت جو پہلے بھی کم نہ تھی، دل میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔

یہی معنی ہیں حکیمانہ تبلیغ کے، جو ہر پُرجوش مناظرہ سے کہیں بڑھ کر قیمتی ہے۔ یہی طریقہ تھا ہمارے پُرانے بزرگانِ طریقت کا بلکہ خود صحابۂ کرام کا کہ ان کی خود ایک خاموش و مؤثر وعظ کا کام دیتی تھی اور " روئے و آوازِ پیمبر معجزہ ست " کی عملی تفسیر ہوتی تھی۔

اس کے بعد اس میں شبہ کیا رہ جاتا ہے کہ وہ دین کے ایک بڑے اور حقیقی خادم تھے۔

باقی جو کچھ کہنا تھا، صدقِ میں عرض کر چکا ہوں اور صاحب "الاعتصام" کی خدمت میں تعزیت نامہ خبرِ وفات سُنتے ہی لکھ دیا تھا۔

حضرت مولٰینا مفتی محمد شفیع صاحب کا مکتوبِ گرامی

خلیفۂ اجل حضرت مولٰینا اشرف علی تھانویؒ

کرمفرمائے محترم مولانا سید ابوبکر غزنوی دام مجدہٗ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ گرامی نامہ سے مشرف فرمایا۔ تعمیلِ حکم کے لیے چند سطریں لکھی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ دل کا داعیہ بہت کچھ لکھنے کا تھا، مگر معذور ہوگیا اسی کو قبول فرما کر ممنون فرمائیں۔ والسّلام

بندہ محمد شفیع
۱۸ ۶/۹۳

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کی ذاتِ گرامی سے احقر کا تعارف تو بہت قدیم سے تھا، لیکن ۱۳۶۸ھ، ۱۹۴۸ء میں ہجرت پاکستان کے بعد سے مسلسل ملاقاتوں اور بہت سے دینی کاموں میں رفاقت کا شرف اللہ تعالےٰ نے عطا فرمایا۔ مولانا کو قریب سے دیکھا۔ اُن کے حسن علمی، عملی، اخلاقی فضائل و کمالات کا مشاہدہ ہوا، افسوس ہے کہ اپنی طویل علالت اور ضعف عمر کے سبب اب یہ ناکارہ اُن میں سے کوئی حصّہ بھی لکھنے پر قادر نہیں۔

اس وقت صرف چند جملے لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ احقر نے حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ کو علمی کمالات کے علاوہ عملی اور اخلاقی کمالات سے بہت آراستہ پایا۔ وہ ایک باخدا بزرگ تھے۔ اہلحدیث ہونے کے باوجود ائمۂ مجتہدین اور علما سلف صالحین کا احترام و عقیدت اُن کے قلب میں ان حضرات کے مقلدین سے کم نہ تھا حنفی علماء سے روابط اور تعلقات بہت گہرے تھے۔ اُنہوں نے اپنے عمل سے اجتہادی اختلافات کی حدود لوگوں کو اچھی طرح بتلادی تھیں۔ وظائف و نوافل کے پابند تھے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد چالیس مرتبہ یہ دعا پڑھا کرتے

تھے۔ یا حی یا قیوم لَا اِلٰہ الا اَنْتَ بَرحمتکَ استغیث اَصْلِح لی شَانی کُلّہ وَ لَا تَکِلْنی الیٰ نفسی طَرْفَۃَ عَیْن اور فرمایا کہ میرا بھی معمول ہے۔

جب سے احقر نے اُن سے سنا تھا الحمد للہ احقر کا بھی معمول بن گیا۔ حضرت مولانا کا تذکرہ اور اتنی سی مختصر بات پر اکتفا کرنا پڑا، اس کا قلق محسوس کر رہا ہوں۔

دُعا کرتا ہوں کہ حق تعالےٰ حضرت مرحوم کو جنّت کے درجاتِ عالیہ سے سرفراز فرمائیں اور اُن کے علوم اور دارالعلوم کو اُن کا صدقہ جاریہ بنادیں۔

بندہ محمد شفیع خادم دارالعلوم کراچی

۱۸ رجمادی الثانیہ ۱۳۹۳ھ

سیّدی وابی

ابوبکر غزنوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

حدیثے دلکش و افسانہ از افسانہ می خیزد
دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ پریشاں را

جی تو چاہتا تھا کہ حضرت والد علیہ الرحمہ کی باتیں اوروں سے سُنوں اور خود خاموش رہوں، مگر جب والد علیہ الرحمہ پر لکھے ہوئے تمام مضامین پڑھے تو محسوس کیا کہ یہ تو چند یادیں ہیں، چند تاثرات ہیں، چند نقوش ہیں، ان کی مرتّب سوانح حیات تو نہیں ہے۔ مَیں نے محسوس کیا کہ کتاب ناقص اور ادھوری رہ جائے گی اگر والد علیہ الرحمہ کے حالات باضابطہ مرتّب نہ کیے گئے اور ان کے دینی، فقہی اور علمی رجحانات کی وضاحت نہ کی گئی۔

حضرت والد علیہ الرحمہ کے ہفتہ وار رسالہ 'توحید' کی مکمّل فائل اور 'الاعتصام' کی مکمل فائل اپنے کُتب خانہ میں موجود ہے۔ پھر حضرت کی سینکڑوں صفحات پر مشتمل یادداشتیں، ان کے غیر مطبوعہ مقالے، ان کی بیاض، ان کے روزنامچے سب میرے پاس موجود ہیں۔ یہ تمام مواد بھی اس تحریر کا محرک ہوا۔ اخبارات و رسائل میں ان کے بارے میں بعض ایسے مضامین شائع ہوئے جو ساقط الاعتبار تھے۔ ان مضامین میں بعض غلط باتیں ان کی طرف منسُوب کی گئی تھیں، ناگزیر معلوم ہوا کہ ان کے مُستند حالاتِ زندگی کو خود ضبطِ تحریر میں لاؤں۔

راقم مدّتوں تشکیک کی وادیوں میں سرگرداں رہا اور تحقیق کی سنگلاخ راہوں سے گزر کر جب منزل کا سُراغ ملا تو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی اور مسرّت بھی کہ یہ تو وہی منزل ہے جس کی نشان دہی حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے کی تھی۔ مَیں حضرت یُوسف علیہ السلام کی اقتداء میں پکار اُٹھا

"واتّبعتُ مِلّۃَ آبائی ابراھیم واسحٰق ویعقوب۔"

مجھے اپنے آباؤ اجداد کا مسلک عزیز ہے اور اس کے پرچار کو بہت بڑی سعادت سمجھتا ہوں۔ اس مسلک میں اعتدال کا ایک حُسن ہے۔ یہاں بے داغ اور بے لچک توحید بھی ہے، ائمۂ کرام اور اولیاءِ عظام کی غایت درجہ تعظیم وتکریم بھی ہے۔ یہاں صحابۂ کرام سے بے پناہ محبّت بھی ہے اور اہلِ بیت سے والہانہ عقیدت بھی، یہاں حدیث صحیح کو ائمۂ کرام کے اقوال پر ترجیح دینے کا ذوق بھی ہے اور فقہائے کرام کی مساعئ جمیلہ کا حُسنِ اعتراف بھی، یہاں شریعت کے ظاہری احکام کا التزام بھی ہے اور تزکیۂ نفس اور روحانیّت کا شغف بھی۔

مجھے اس بات کی رُوحانی مسرّت ہے کہ اس مقالے میں حضرت والد علیہ الرحمہ اور اپنے اسلاف کے عقائد ونظریات اجمالاً مرتّب ہو گئے ہیں۔

حضرت الامام عبد الجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے حِصّے میں یہ سعادت آئی تھی کہ انہوں نے اپنے والد حضرت عبد اللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات قلمبند کیے تھے۔ بارگاہِ ربّ العزّت میں سربسجود ہوں کہ اُس نے مجھے اپنے والد گرامی حضرت مولانا داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی قلمبند کرنے کا شرف بخشا۔

عزیزم چودھری عبد الحفیظ صاحب نے اس تحریر کا مسوّدہ تیار کرنے میں میری بڑی مدد کی۔ اللہ تعالیٰ دونوں جہانوں میں انہیں سرسبز کرے۔

ابوبکر غزنوی

۲۵ر شوال المکرّم ۱۳۹۴ھ
مطابق ۱۱ر نومبر ۱۹۷۴ء

آبا و اجداد

حضرت عبداللہ غزنویؒ

پیدائش اور نام ونسب

تعلیم

منازلِ سلوک

حضرت کا فیضان

دُنیا داروں سے گریز

اتّباع و احیائے سُنّت

قندھار کے قاضی القضاۃ کی رائے

علماءِ سُوء اور حکام کی ایذارسانی

جلاوطنی

نعرۂ حق

مصائب میں استقامت

ظالم حکام کا انجام

شہرِ امرتسر میں

آپ کی اولاد

حضرت الامام عبدالجبار غزنویؒ

حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کے جدِّ امجد للّٰہیت، تقویٰ اور علم دین میں یکتائے روزگار تھے۔ مولانا عبدالحیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے "نزہتہ الخواطر" میں حضرت عبداللہ غزنویؒ کے حالات قلمبند کرتے ہوئے افتتاحیہ جملہ یہ لکھا ہے:

"الشیخ الامام العالم المحدّث عبد اللہ بن محمد بن محمد شریف الغزنوی الشیخ محمد اعظم الزاھد المجاھد الساعی فی مرضاۃ اللہ المؤثر لرضوانہ علیٰ نفسہ واھلہ ومالہ واوطانہ صاحب المقامات الشھیرۃ والمعارک العظیمۃ الکبیرۃ[1]"

حضرت عبداللہ بن محمد بن محمد شریف الغزنوی شیخ تھے، امام تھے، عالم تھے، زاہد تھے، مجاہد تھے۔ رضائے الٰہی کے حصول میں کوشاں تھے۔ اللہ کی رضا کے لیے اپنی جان، اپنا گھر بار، اپنا مال، اپنا وطن سب کچھ لٹا دینے والے تھے۔ علماءِ سوء کے خلاف اُن کے معرکے مشہور ہیں۔

شیخ شمس الحق دیانوی رحمۃ اللہ علیہ "غایۃ المقصود" کے مقدمے میں حضرت عبداللہ غزنویؒ کی مدح و توصیف میں یوں لکھتے ہیں:

انہٗ کان فی جمیع احوالہ مستغرقاً فی ذکر اللہ عزّوجل حتیٰ

---

[1] "نزھۃ الخواطر و بھجۃ المسامع والنواظر" صفحہ ۳۰۲، ج ۷۔

ان لحمہ وعظامہ واعصابہٗ واشعارہٗ وجمیع بدنہ کان متوجہاً الی اللہِ تعالیٰ فانیاً فی ذکرہ عزّوجلّ"[1]

(وہ ہر وقت اور ہر حالت میں خُدائے بزرگ وبرتر کے ذکر میں ڈوبے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ اُن کا گوشت، اُن کی ہڈیاں، اُن کے پٹھے اور اُن کا ہر ہر بُنِ مُو اللہ کی طرف متوجّہ تھا۔ اللہ عزّوجل کے ذِکر میں فنا ہو گئے تھے۔)

نواب صدیق حسن خانؒ "تقصار من تذکار جیود والاحرار" میں حضرت عبداللہ غزنویؒ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"چرخ اگر ہزار چرخ زند مشکل کہ چنیں ذات جامع کمالات برروئے ظہور آرد ہم محدِّث بود وہم محدَّث"[2]

(آسمان اگر ہزار بار بھی گردش کرے، تو مُشکل ہے کہ اب ایسی جامع کمالات ہستی معرضِ وجود میں آئے۔ وہ محدّث بھی تھے اور اللہ سے ہمکلامی کا شرف بھی انہیں حاصل تھا۔)

حضرت عبداللہ غزنویؒ کے فرزند حضرت الامام عبدالجبّار غزنویؒ جو آپ کے ساتھ دن رات سفر اور حضر میں رہے اور جنہیں آپ کو بہت قریب سے دیکھنے کا شرف حاصل ہُوا اُن کے بارے میں یُوں رقمطراز ہیں:

عابد کثیر الذکر رجاع الی اللہ المتذلل لہ الخاشع الخاضع الورع المتضرع المتبرع المتواضع المبتہل الحنیف المتبتّل الی اللہِ الکامل البارع الملہَم المحدَّث المخاطَب المخلَص الصدیق الکریم الجوّاد الاوّاہ الحلیم المتوکل المنیب الصابر القانت لم تاخذہ فی اللہِ لومۃ لائم قط"[3]

---

[1] بحوالہ نزھۃ الخواطر صفحہ ۳۰۳، ج۔ ۷ ۔ [2] صفحہ ۱۹۲

[3] مخطوطہ حضرت الامام سیّد عبدالجبّار غزنویؒ صفحہ ۱

(وہ عبادت گزار، بہت ذکر کرنے والے، اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والے، اس کے سامنے بہت جھکنے والے اور خشوع وخضوع کرنے والے تھے۔ گناہوں سے بچنے والے، اللہ کے حضور میں گریہ وزاری کرنے والے، بہت صدقہ وخیرات کرنے والے، عاجزی کرنے والے، سب سے کٹ کر اللہ ہی کی طرف متوجہ ہونے والے اور اسی سے دُعا والتجا کرنے والے تھے۔ مردِ کامل اور یکتائے روزگار تھے، اللہ کی طرف سے الہام اور خطاب سے نوازے جاتے تھے اور اس کی ہم کلامی کا شرف انہیں حاصل ہوتا تھا۔ وہ اللہ کے لیے خالص کر لیے گئے تھے۔ بہت سچے، بزرگ اور سخی تھے۔ بڑے دردمند، بُردبار، اللہ پر بھروسا کرنے والے، اس کی طرف رجوع کرنے والے، مصیبتوں پر صبر کرنے والے اور اللہ کے اطاعت گزار تھے۔ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت انہیں اللہ کی راہ سے قطعاً نہ روک سکتی تھی۔)

پیدائش اور نام ونسب

آپ ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۱ء میں قلعہ بہادر خیل کے مقام پر جو شہر غزنی کے مضافات میں واقع ہے، پیدا ہوئے۔ یہ جگہ افغانستان میں خواجہ ہلال پہاڑ کے قریب ہے۔ آپ کا نام ونسب محمد اعظم بن محمد بن محمد شریف ہے۔ آپ کے والدین نے آپ کا نام محمد اعظم رکھا تھا۔ آپ نے اپنا نام عبداللہ رکھ لیا۔ آپ فرماتے تھے:

"محمد کہ اعظم از کائنات افضل از مخلوقات است ہماں رسول اللہ ہست تسمیۂ ما بعبداللہ خوب است۔"[1]

(محمد کا اسم گرامی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کو زیبا ہے جو ساری کائنات سے زیادہ عظمت رکھنے والے اور تمام مخلوقات سے افضل ہیں۔ میرا نام عبداللہ

---

[1] مخطوطہ۔ میاں صاحب

ہی بہتر ہے۔)

امام صاحب لکھتے ہیں کہ عبداللہ نام آپ نے اس لیے رکھ لیا تھا کہ اس نام میں خدا کی الوہیت اور بندے کی عبودیت کا اظہار اور فروتنی کا اقرار ہے۔

آپ کے جدِّ اعظم محمد شریف رحمۃ اللہ علیہ ولی کامل تھے۔ ان کا مزار مرجع خلائق تھا۔ حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے والدِ بزرگوار اور جدِّ امجد کا شمار بھی اولیاء و صُلحائے اُمّت میں ہوتا تھا۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ کریم ابن الکریم ابن الکریم تھے۔ آپ اور آپ کے آبا و اجداد سب اقلیمِ فقر کے فرمانروا تھے۔ سب نشۂ درویشی سے سرشار تھے اور مال و جاہِ دنیوی سے یکسر بے نیاز تھے۔ ایک خط میں آپ لکھتے ہیں:

"صاحبا! فقیر و فقیر زادہ ام و غریب زادہ ...... عاجزی و گمنامی و خاکساری کارِ ماست و گوشہ نشینی و زاویہ گزینی شعارِ ما است[1]"۔

حضرت الامامؒ لکھتے ہیں:

"غزنی میں آپ کا خاندان مشہور سادات میں سے تھا، مگر جب آپ سے کوئی پُوچھتا کہ کیا آپ سیّد ہیں؟ تو آپ فرماتے، لوگ کہتے ہیں کہ ہم سیّد ہیں، لیکن عجم میں انساب کچھ ایسے خلط ملط ہو گئے ہیں کہ سیادت کا حال کچھ معلوم نہیں ہوتا[2]۔"

آپ نے سیّد ہونے سے تو انکار نہیں کیا۔ ازراہِ تواضع محض یہ کہا کہ عرب سے جب عجم میں سیادت منتقل ہُوئی تو وہ کہاں تک خالص و بے آمیز رہی ہو گی۔

تعلیم

آپ بچپن میں غزنی کے علماء سے پڑھتے رہے۔ علومِ متداولہ کی تحصیل آپ نے وہیں کی۔ آپ کی تیزیٔ فہم اور سلامتیٔ فکر پر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ تفسیر و حدیث سے آپ کو والہانہ شغف تھا۔ غزنی میں کوئی ایسا مقتدر عالم نہ تھا جس سے آپ کا علمی ذوق

---

[1] مکاتیب غیر مطبوعہ [2] مخطوطہ

تسکین پاسکتا[1] کسی مشکل مقام کے سمجھنے میں دقت ہوتی یا کسی دینی مسئلے میں اشکال پیدا ہوتا، تو غزنی کے علماء سے انہیں تسلی بخش جواب نہ ملتا۔ آپ فرماتے تھے، مجھے اُن دنوں الہام ہُوا کہ حضرت شیخ حبیب اللہ قندھاری رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع کرو[2] غزنی سے قندھار تک کا راستہ کافی طویل ہے اور اس زمانے میں تو سخت دشوار گزار بھی تھا[3]

شیخ حبیب اللہ قندھاری رحمۃ اللہ علیہ کے چشمۂ علم سے پیاس بُجھانے کی خاطر آپ سفر کی سختیاں جھیلتے ہُوئے قندھار پہنچے۔ کچھ مدت اُن سے استفادہ کیا اور وطن لوٹ آئے۔ اس کے بعد جب کوئی مشکل مسئلہ پیش آتا آپ انہی کو لکھ بھیجتے۔ حضرت الشیخ کا جواب ہمیشہ محققانہ ہوتا۔ کچھ مُدت کے بعد آپ نے ایک بار پھر قندھار کا سفر کیا اور بعض اشکالات کے حل کے لیے اپنے شیخ کے پاس حاضر ہُوئے۔ حضرت الشیخ کو تعجب ہوتا کہ یہ شخص محض چند مسائل پُوچھنے کے لیے اتنی لمبی مسافت طے کرتا ہے۔ حضرت الشیخ علماء کی بھری محفل میں فرمایا کرتے:

"مسائل دینیہ را چنانکہ ایں شخص می فہمد من خود نمی فہم"[4]

(دینی مسائل کو جس طرح یہ شخص سمجھتا ہے مَیں بھی نہیں سمجھتا ہوں)

دوسری بار جب آپ حضرت الشیخ سے رُخصت ہونے لگے، تو حضرت الشیخ نے آپ سے فرمایا: قندھار آپ کے شہر سے بہت دُور ہے اور آپ کو یہاں تک آنے میں سخت تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔ آپ یہ زحمت نہ فرمایا کیجیے۔

حضرت نے فرمایا: میرا آنا دین کی خاطر ہے اور سفر کی یہ صعوبتیں جو میں جھیلتا ہُوں تو اپنی عاقبت سنوارنے کے لیے جھیلتا ہوں۔ حضرت الشیخ نے فرمایا: مَیں جانتا ہوں کہ خدا خود آپ کی تربیت کر رہا ہے۔ آپ کو میری ضرورت نہیں ہے۔ خُدا آپ کو کبھی ضائع نہ کرے گا۔

---

[1] حضرت الامامؒ [2] میاں صاحبؒ [3] سیّد سلیمان ندویؒ نے ۱۹۳۳ء میں افغانستان کا سفر کیا تھا۔ اُنہوں نے بھی اپنے سفرنامہ میں اس راستے کی خرابی کا ذکر کیا ہے۔ [4] مخطوطہ حضرت الامامؒ

اگر کبھی کوئی عقدہ پیش آیا، تو مجھے یقین ہے کہ خُدائے بزرگ و برتر کسی دیوار اور کسی درخت کو آپ کے لیے گویا کر دے گا۔ آپ فرمایا کرتے تھے:

"ربِّ ما جلّ شانہٗ موافق گفتۂ شیخ با من معاملہ کردہ است"[1]

(میرے پروردگار نے شیخ کے ارشاد کے مطابق در و دیوار کو میرے لیے گویا کر دیا)

منازلِ سلوک

فرماتے تھے کہ جب میں الہام کی حقیقت نہیں سمجھتا تھا اور توحید کی معرفت پوری طرح مجھے حاصل نہ تھی، ایک بار میں اپنے دادا محمد شریف رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر گیا جو اس علاقے میں مرجعِ خلائق ہے تو القا ہوا "لا الٰہ غیرک"۔ اس وقت مَیں نے گمان کیا کہ یہ ورد مجھے وظیفہ کے لیے سکھایا گیا ہے۔ اب مجھے سمجھ آیا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے الہام تھا کہ میرے سوا کسی دُوسرے کی طرح رجوع کرنا عبادت اور استعانت میں شرک ہے۔ ساری توجہ صِرف اللہ ہی کی طرف کرنی چاہیے۔

بزرگوں کے مزاروں پر اس نیّت سے جانا کہ میرا فلاں مطلب حاصل ہو جائے، توحید میں رخنہ ڈالتا ہے اور کلمۂ شہادت کے منافی ہے۔

فرماتے تھے اگر کوئی خیال کرے کہ میں کسی نیک آدمی کی قبر پر اس لیے نہیں جاؤں گا کہ اُن سے کُچھ مانگوں، بلکہ اس لیے جاؤں گا کہ قبر بابرکت جگہ ہے، وہاں میری دُعا جلد قبول ہو گی، تو یہ بھی شرعاً غلط ہے۔ عبادت کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے مسجد مقرّر کی ہے۔ مقبرہ عبادت کی جگہ نہیں ہے، جیسے حافظ ابنِ قیمؒ نے "اغاثۃ اللّھفان" میں اس کی وضاحت کی ہے۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں مجھے اس بات کا بہت شوق تھا کہ جنگل میں جا کر تنہائی میں دُعا کروں۔ اس زمانے میں بعض اہل اللہ آپ سے فرماتے، تمہاری پیشانی میں ہم ایک نُور دیکھتے ہیں، دیکھو علمائے سوء کی صحبت میں رہ کر اپنے دل کو خراب نہ کر لینا، اور

---

[1] مخطوطہ حضرت الامام

تمام لوگ، کیا خواص، کیا عوام بچپن ہی میں اُن کی للّٰہیت اور پرہیزگاری پر حیرت زدہ تھے جب آپ جوان ہُوئے تو آپ کو عنایتِ ربّانی اور جذبۂ غیبی نے پالیا اور اللہ کے سوا ہر چیز سے بیزار ہو گئے اور اپنے ربّ کی طرف ہمہ تن متوجّہ ہو گئے۔ آپ نے خلوت اختیار کر لی اور لوگوں سے کنارہ کش ہو گئے۔ حضورِ دائمی اور پاسِ انفاس جو مرتبۂ احسان سے عبارت ہے، یکایک آپ کو عطا کیا گیا اور آپ مرجعِ خلائق ہو گئے۔

فرماتے تھے کچھ مبادی ہیں اور کچھ مقاصد ہیں۔ مبادی سے مُراد مقاصد تک پہنچنے کے وسیلے اور واسطے ہیں۔ لوگ وسیلوں اور واسطوں کے ذریعے مقاصد کو حاصل کرتے ہیں، مثلاً صوفیائ کے اشغال جو اُن کے مقرر کردہ لطائف سے متعلّق ہیں، اخلاقِ حمیدہ یعنی تواضع، توکّل، دنیوی خواہشوں میں اختصار، قناعت، صبر، رضا، زہد، تقویٰ، رتبۂ یادداشت اور حضورِ دائمی کے حصُول کے لیے وسائل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے بے پایاں فضل سے اس حقیر کی تربیت کی ہے۔ اس فقیر کے دل میں اللہ تعالیٰ نے لطائف کے شغل کے بغیر ہی مقاصد کو دفعتاً ڈال دیا اور تمام اوصافِ ذمیمہ کو اپنی بے انتہا رحمت سے میرے وجود سے کھینچ لیا اور احسان کا مرتبہ مجھے عطا کیا اور ماسوی اللہ کو میرے دل سے اُچک لیا اور یہ حقیقت مُجھ پر منکشف ہو گئی کہ مربّی حقیقی اللہ کے سوا کوئی نہیں۔

ابتدائے سلوک میں آپ پر جذب اس قدر غالب تھا کہ مخلوق سے گُریزاں تھے۔ سب رشتہ داروں اور دوستوں سے الگ تھلگ خواجہ ہلال پہاڑ میں جہاں کسی شخص کی رہائش نہ تھی، اقامت اختیار کر لی۔ پس حسبِ ارشادِ نبویؐ کہ جب اللہ کسی بندے کو دوست بناتا ہے تو اس کے لیے اہلِ زمین کے جی میں قبولیت القاء کر دی جاتی ہے، لوگ اس جگہ بھی آپ کے پیچھے پہنچتے تھے۔ زمانے کے علماء اور فضلا آپ کے بارے میں حیرت زدہ تھے۔

حضرتؒ کا فیضان

بعض لوگ محض آپ کی صحبت میں بیٹھنے سے اور بعض صرف آپ کی زیارت سے صاحبِ حال ہو گئے اور اُن پر رُوحانی

کیفیات طاری ہوگئیں۔ حضرت کے لباس سے بھی استفادہ کرنے والوں کو فیض حاصل ہوا۔ ایک طالب علم محض پوستین اُٹھانے سے وجد میں آگیا۔ اسی وجہ سے وہ طالب علم "مرید پوستین" کے نام سے مشہور ہوا۔

دُور دراز علاقوں سے علماء اور مشائخ آپ سے فیض حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتے اور جب سُبحان اللہ اور لا الٰہ الا اللہ کا وِرد کرتے، تو جمادات بھی آپ کے ساتھ بآوازِ بلند تسبیح و تہلیل کرتے اور وجد و اضطراب میں آجاتے۔

دُنیا داروں سے گُریز

امیروں اور دُنیا داروں سے آخری دم تک گریزاں رہے۔ اُن کے انتہائی اصرار کے باوجود بھی اُن سے مُلاقات نہ کرتے تھے اور اپنے بچوّں اور دوستوں کو ہمیشہ یہ نصیحت کرتے رہے کہ دُنیا داروں کی صحبت سمِ قاتل ہے۔ اپنے ربّ کی طرف متوجّہ رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ضائع نہ کریں گے۔ فرماتے تھے، الحمدللہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اُمراء اور دُنیا داروں سے عمر بھر محفوظ رکھا۔ ابتدا میں تو حالت یہ تھی کہ امیر لوگ سینکڑوں روپے خرچ کرتے کہ ایک بار میرا چہرہ دیکھ لیں، لیکن میں انہیں ہرگز اجازت نہ دیتا تھا کہ وہ میرے گھر کے قریب بھی پھٹکیں۔

اتّباع و احیائے سُنّت

افغانستان میں اس وقت عوام اور خواص بدعات اور مشرکانہ رسوم میں مُبتلا تھے حتیٰ کہ علماء اور مشائخ بھی بدعات اور رسوم کو دین سمجھتے تھے۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے کبھی الہام کے ذریعے اور کبھی خواب میں ان بدعات سے سخت روکا جاتا اور کتاب و سنّت کی ترغیب دی جاتی۔ آپ حیران تھے کہ اس مُلک میں جہاں علومِ کتاب و سُنّت کا نام و نشان تک نہیں اور نہ کتاب و سنّت کا موادّ موجود ہے یہ کام مجھ سے کیونکر سرانجام پائے گا؟ جب آپ کو یہ خیال آتا تو آپ کو الہام ہوتا "سَنُیَسِّرُکَ لِلْیُسْرٰی" بس آپ نے اتّباعِ سُنّت پر کمر باندھی اور بدعتوں اور مُشرکانہ رسموں کے خلاف آوازِ بلند کی اور علومِ کتاب و سنّت کی طرف متوجّہ ہوئے۔ چونکہ

اللہ عزّ وجل آپ کی تربیت کرنے والے تھے، عرب وعجم سے حدیث وتفسیر کی کتابیں آپ تک پہنچنے لگیں۔ آپ نے تیزیٔ فہم، فکرِ سلیم اور تائیدِ الٰہی کی بنا پر محدّثین کا مسلک اختیار کیا۔

جب آپ مولانا حبیب اللہ قندھاریؒ سے علمی اور رُوحانی استفادہ کرنے کے لیے قندھار تشریف لے گئے تو قندھار کے قاضی اور علماء آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہُوئے مگر ملّا کٹّہ نے آپ سے دُشمنی کی اور آپ کی مخالفت کے درپے ہُوا۔

قندھار کے قاضی القضاۃ کی رائے

قندھار کے قاضی القضاۃ قاضی غلام نے ملّا سعد الدین مقری کو ایک خط لکھا جس میں ملّا کٹّہ کی شکایت کی اور حضرت عبداللہ غزنویؒ کے اوصافِ حمیدہ کا یوں ذکر کیا:

"حقائق و معارف آگاہ موفّق من عند اللہ قائد الخلق الیٰ صراط اللہ محی السنہ وقامع البدعت میاں محمد اعظم" کے حق میں یہ کہنا بجا اور دُرست ہے:

"مملوٌّ بالسُّنَّۃِ من الفرق الی القدم

(یہ انسان سر سے پاؤں تک سُنّت میں ڈوبا ہُوا ہے۔)

اُنہوں نے سیر و سلوکِ باطن میں نسبت اویسی حاصل کرنے کے بعد محض اللہ تعالیٰ کی عنایت سے طریقۂ نقشبندیہ میں قدم رکھا اور اس طریقہ کے سیر و سلوک کی تکمیل کی اور اس میں مُجاز ہُوئے۔ اس کے بعد سید آدم بنّوری قدّس اللہ سرّہٗ کے طریق کا بھی اکتساب کیا اور سلسلۂ بنّوریہ میں بھی مجاز ہوئے، مختصر یہ کہ میاں محمد اعظم کا ظاہر تقویٰ اور شریعتِ مصطفویؐ کے زیور سے آراستہ ہے اور اُن کا باطن اہلِ صفا کے احوال و مقامات سے مزیّن ہے۔ میاں محمد اعظم میں نقص صرف یہی ہے کہ اپنے آپ کو ملّا کٹّہ کے محبّین و مخلصین میں شمار نہیں کرتے۔ مُلّا کٹّہ بزرگوار صاحبزادہ صاحب کو کبھی وہابی کہتا ہے اور کبھی بدعتی کہہ کر پکارتا ہے بلکہ بعض قابلِ اعتماد لوگوں سے سُنا ہے کہ ملّا کٹّہ نے غلجائی کے آس پاس کے علاقوں میں ان کے خلاف نفرت اور عداوت پھیلانے کے لیے خطوط بھی ارسال کیے۔[1]

---

[1] مخطوطہ حضرت الامامؒ صہ ۱۱

علماءِ سُوء اور حُکّام کی ایذا رسانی

جب آپ نے خالص توحید اور اتباعِ سُنّت کی طرف لوگوں کو دعوت دی اور بدعات اور مُشرکانہ رسوم کے خلاف آواز اُٹھائی تو خواص و عوام میں سے بہت سے لوگ، عُلماء اور حکّام جو آپ کے ارادتمند تھے، آپ کے مخالف ہو گئے اور ایذا رسانی کے درپے ہُوئے۔ اِس علاقے کے علماء آپ کے ساتھ عمل بالحدیث خلافِ مذہب کے مسئلہ پر مُباحثہ کرنے کے لیے اکٹھے ہو گئے۔ آپ کی کرامتوں میں سے ایک کرامت تھی کہ اُن تمام عُلماء نے اعتراف کر لیا کہ وہ غلطی پر ہیں اور مان لیا کہ آپ حق پر ہیں حالانکہ مُقابلے کے وقت ایسا اقرار علماء کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ دُوسرے علاقوں کے عُلماء نے یہ ماجرا سُنا تو وہ بھی ایسے خائف ہُوئے کہ حضرت کے ساتھ گفتگو اور مباحثے کے لیے تیّار نہ ہُوئے۔ اُنہوں نے لشکر اکٹھا کیا اور جنگ کا ارادہ کیا، مگر چونکہ آپ کے پیرو، محبّین اور معتقدین بھی بہت تھے، مخالفین آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ ناچار حکّامِ وقت کے پاس اُنہوں نے شکایت کی اور رنگا رنگ کے جھوٹ اور بہتان اُن پر باندھے اور بعض سرداروں کی وساطت سے امیر دوست محمد خاں کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ اس شخص کو اگر ایک سال یُونہی مُہلت دی گئی تو تمہاری بادشاہت کو برباد کر دے گا اور نظامِ حکومت میں خلل ڈال دے گا۔ تمام اُمراء، وُزراء اور عُہدیدار اس شخص کے معتقد اور مرید ہیں۔

آپ کے بعض احباب نے آپ کو مشورہ دیا کہ مصلحت اسی میں ہے کہ امیر دوست محمد خاں کے طلب کرنے سے پہلے ہی ہم کابل چلے جائیں اور حقیقتِ حال سے امیر کو آگاہ کر دیں۔ حضرت کی مرضی تو نہ تھی مگر احباب کے پاسِ خاطر سے کابل روانہ ہُوئے اور امیر دوست محمد خاں سے مُلاقات کی۔ مخالف علماء بھی آ گئے۔ اُن علماء میں خان مُلّا دُرّانی، مُلّا مشکی اندری اور مُلّا نصر اللہ لوہانی بھی شامل تھے۔ اُن کے علاوہ سینکڑوں مُلّا اکٹھے ہو گئے۔ اُن کے درمیان خفیہ صلاح مشورے کے بعد یہ طے پایا کہ اگر علمی مناظرہ اور فقہی مباحثہ ہوا تو

ہم کبھی اس پر غالب نہ آسکیں گے۔ اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ اس کے خلاف جھوٹی گواہی دی جائے اگر بحث تک نوبت پہنچی، تو ہم سب کو شرمندگی اور خجالت اُٹھانی پڑے گی۔

حضرت کے مخالفین نے امیر سے کہا کہ اس شخص کے ساتھ ہم کوئی گفتگو اور مناظرہ نہیں کریں گے۔ ہم گواہوں کے ذریعے ثابت کریں گے کہ یہ شخص ایسے کلمات بولتا ہے جس سے اس کے کافر اور مُرتّد ہونے میں کوئی شک و شبہہ باقی نہیں رہتا۔ جھوٹے گواہوں نے گواہی دی کہ یہ شخص حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا منکر ہے، شفاعت کا مُنکر ہے اور خود نبوّت کا مدّعی ہے۔ امیر سمجھ تو گیا کہ یہ سب جھوٹ ہے مگر اس ڈر کے مارے کہ یہ علماء ملک میں فساد اور ہنگامہ برپا کریں گے، کہنے لگا مصلحت یہی معلوم ہوتی ہے کہ آپ اس مُلک سے چلے جائیں اور کابل سے آپ کو نکال دیا۔ آپ کے سب پیرو اور احباب آپ کی جُدائی پر گریہ و زاری کر رہے تھے، مگر آپ کو کچھ بھی اضطراب نہ تھا اور فرمایا کہ یہ جلاوطنی، اہل و عیال سے جُدائی حبِ آقا کی راہ میں ہے اور ربّ الارباب کی رضاجوئی کے لیے ہے تو پھر کیا پروا ہے۔

جلاوطنی

پس امیر دوست محمد خاں نے آپ کو جلاوطن کر دیا اور آپ ملک سوات، وہاں سے کوٹھا اور پھر ہزارہ تشریف لے گئے اور ایک دُنیا اس سفر میں آپ سے فیضیاب ہوئی اور ہزارہ سے آپ حضرت میاں نذیر حُسین صاحب محدثؒ سے فیضیاب ہونے کے لیے دہلی پہنچے اور کُتبِ احادیث کی سند اُن سے حاصل کی۔ جب آپ سَند لے کر لوٹے تو یہ وہی دَور تھا جب ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی برپا ہوئی تھی اور دہلی میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ آپ دہلی سے پنجاب تشریف لائے اور لوگوں کو اللہ کے راستے کی طرف بُلانا شروع کیا۔ کتاب وسُنّت پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دینے لگے۔ کچھ عرصہ پنجاب میں قیام فرمانے کے بعد براستہ ڈیرہ اسماعیل خاں اپنے وطن واپس تشریف لے گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ اتنی مدت گزر گئی ہے، امیر دوست محمد خاں کا خیال اب تک بدل چکا ہو گا۔ ابھی وطن میں ایک مہینہ ہی قیام ہوا ہو گا کہ یکایک امیر دوست محمد خاں کے سوار

آپ کے اخراج کا پروانہ لے کر پہنچے۔ آپ ملکِ ناوہ چلے گئے اور وہاں اقامت فرمائی۔ امیر دوست محمد خاں نے آپ کو وہاں سے بھی نکالنے کا حکم بھیج دیا اور آپ کو اہل و عیال سمیت یاغستان کے پہاڑوں میں سکونت پذیر ہونا پڑا۔ اس تمام عرصے میں آپ کے عزم و ہمت اور صبر و استقامت کا دامن یکسر بے داغ رہا۔

جب ناوہ کے علماءِ سوء کو معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ یاغستان کے پہاڑی علاقے میں بے یار و مددگار پڑے ہیں تو سینکڑوں آدمیوں کو ساتھ لے کر آپ پر حملہ آور ہوئے، آپ کے گھروں کو جلا دیا اور آپ کے بعض مریدوں کو زخمی کر دیا، مگر آپ اور آپ کے اہل و عیال کی اللہ تعالیٰ نے ایسی حفاظت کی کہ وہ سب اپنے دشمنوں سے سلامت نکل آئے۔ آپ کے فرزندِ ارجمند حضرت عبدالجبّار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"سبحان اللہ دریں امتحانات و جلاوطنی و دشمنیٔ تمام عالم چناں مرفہ الحال و خوش عیش می ماند کہ ہیچ امیری اطیب عیش ازو ندیدم گویا از غیب نعم گوناگوں بر سرش می بارید کدام نعمتے بود کہ دراں کوہہا پیشش نمیرسید۔"[1]

(سبحان اللہ! ان آزمائشوں کے دور میں اور جلاوطنی اور تمام جہان کی دشمنی کے زمانے میں وہ اس قدر خوشحال تھے کہ کسی امیر کو میں نے آپ سے بڑھ کر خوشحال نہیں دیکھا۔ گویا غیب سے رنگا رنگ کی نعمتیں آپ کے سر پر برستی تھیں۔ وہ کونسی نعمت تھی جو ان پہاڑوں میں آپ کے پاس نہیں پہنچی تھی)

وطن کو واپسی اور دوبارہ جلاوطنی

انہی دنوں امیر دوست محمد خان نے شہر ہرات میں وفات پائی۔ آپ پھر اپنے وطن واپس چلے گئے جہاں کے اکثر باشندے آپ کے عقیدتمند تھے۔ امیر شیر علی خاں ملک کا امیر ہوا۔ علماءِ سوء نے امیر شیر علی خاں کو بھی آپ کے خلاف بھڑکایا۔ آپ اُمراء کی ملاقات سے

---

[1] مخطوطہ حضرت الامامؒ صفحہ ۲۰

بہت متنفر تھے۔ اس قدر آزمائشوں میں بھی آپ کسی امیر کے پاس نہ گئے۔ آپ نے امیر شیر علی خاں کے نام ایک خط میں لکھا کہ مَیں مظلوم ہوں اور حاسدوں نے مجھ پر جھوٹی تہمتیں باندھی ہیں۔ تمہارے باپ نے مجھے ملک بدر کیا تھا۔ تم اس بارے میں اپنے باپ کی پیروی نہ کرنا۔ اُس نے جواب میں لکھا کہ مَیں تمام رعایا کے خلاف ایک شخص کی رعایت نہیں کر سکتا۔ تم فوری طور پر ہمارے مُلک سے باہر ہو جاؤ۔ اخراج کا حکم نامہ یکایک ملنے پر آپ حیران تھے کہ کس طرف جائیں۔ جنگل کی ایک غار میں جا کر چھپ گئے اور کُچھ مدّت وہیں پوشیدہ رہے۔ انہی دنوں آپ کو الہام ہُوا:

"فقطُع دابر القوم الذین ظلموا والحمدُ لِلّٰہِ ربّ العالمین"

(پس جن لوگوں نے ظلم ڈھایا تھا ان کی جڑ کاٹ دی گئی ہے اور حمد و ستائش اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے)

اُسی زمانے میں امیر شیر علی خاں کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔ وہ ذلیل و نامراد ہوا اور اُس نے ہرات میں جا کر پناہ لی۔ پھر محمد افضل خاں امارت کے عہدے پر فائز ہوا۔ علماء سوء نے پھر وہی جھوٹی تہمتیں آپ پر باندھیں۔ محمد افضل کو آپ کے خلاف اُکسایا۔ آپ کسی حاکم کے پاس جانا پسند نہ فرماتے تھے۔ امیر محمد افضل خاں نے مقرّ کے حاکم کے نام خط لکھا کہ فلاں شخص کو گرفتار کر لو۔ سردار محمد عمر خاں نے اُسی وقت ایک مسلّح سواروں کا دستہ راتوں رات بھیج دیا جنہوں نے آدھی رات کے قریب آپ کے مکان کا احاطہ کر لیا۔ اُنہوں نے آپ کو گرفتار کر لیا اور آپ کو آپ کے سامان سمیت امیر دوست محمد خاں کے بیٹے سردار محمد عمر خاں کے پاس لے گئے۔ آپ کے فرزندوں میں سے اس وقت آپ کے ہمراہ مولانا محمد صاحب، مولانا عبدُاللہ صاحب اور مولانا عبدالجبّار صاحب رحمۃ اللہ علیہم اجمعین تھے۔ سب کو یقین تھا کہ آپ کو سخت سزا دی جائے گی، مگر سردار محمد عمر خاں آپ کا نُورانی چہرہ دیکھتے ہی نرم پڑ گیا۔ بڑے اَدب کے ساتھ کہنے لگا۔ آپ کیوں اس راستے کو چھوڑ نہیں دیتے۔ جو کچھ

وقت کے مولوی کرتے ہیں، آپ بھی اُن کے ساتھ شریک ہو جائیں سردار عمر کے جرنیل نے کہا:

"بدستِ من بدہید تا بتوپ پرّانم۔"

(اسے میرے حوالے کرو کہ مَیں اسے توپ سے اُڑا دوں۔)

آپ نے جواب میں فرمایا کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ مَیں کتاب وسنّت کو جاری کروں۔ مجھے بارہا الہام ہُوا ہے:

"یا عبدی ھٰذا کتابی وھٰؤلاءِ عبادی فاقرأ کتابی علیٰ عبادی۔"

(اے میرے بندے! یہ میری کتاب ہے اور یہ میرے بندے ہیں پس تو میری کتاب میرے بندوں کو پڑھ کر سُنا۔)

اور یہ بھی الہام ہوتا ہے:

"ولئن اتّبعت اھواءھم بعد الذی جاءَکَ مِن العلم مالک من اللہِ من ولی ولا نصیر۔"

(اگر تُو نے اُن کی خواہشوں کی پیروی کی، اُس علم کے بعد جو تیرے پاس آچکا ہے، تو کوئی حامی اور مددگار تجھے اللہ کی سرزنش سے نہ بچا سکے گا۔)

نعرۂ حق

آپ پر عجب کیفیت طاری تھی۔ پھر آپ نے یہ ایمان افروز کلمات کہے:

"قصد محکم دارم و عزم مصمم کہ تا جان دربدن دارم و سر بر تن در خدمت کتاب و سُنّت بہ نہایت سرگرمی کوشم۔ ایں چہ مصائب است کہ بر من می آید من از رب خود ہمیں میخواہم کہ دریں راہ تکہ تکہ شوم و امعاء و رودہائے من در بیاباں بر سر بوتہ و خار افتادہ زاغہا بنولہ ہائے خود زنند۔"[1]

(مَیں قصدِ محکم اور عزمِ مصمّم رکھتا ہُوں کہ جب تک میرے بدن میں جان

[1] مخطوطہ حضرت الامامؒ صفحہ ۲۲

باقی ہے اور میرے جسم پر سر سلامت ہے۔ کتاب و سنّت کی خدمت نہایت گرم جوشی سے کروں۔ یہ کیا مصیبتیں ہیں جو مجھ پر آتی ہیں۔ مَیں تو اپنے آقا سے یہی آرزو کرتا ہُوں کہ اس راستے میں میرے پُرزے پُرزے اُڑا دیے جائیں اور میری انتڑیاں جنگلوں کی خاردار جھاڑیوں پر پھینک دی جائیں اور کوّے اُن پر اپنی چونچیں ماریں)

آپ نے جوشِ ایمانی سے اور بھی ایسی باتیں کیں۔ تمام اہلِ مجلس، کیا جرنیل اور کیا حاکمِ صُوبہ، سب رو رہے تھے۔ سردار محمد عمر نے امیر افضل خاں اور اعظم خاں کے نام خط لکھا کہ آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہُوئے مَیں نے اس شخص کو گرفتار کر لیا، مگر یہ شخص فقیر اور ولی اللہ ہے اور دنیوی اعتبار سے بالکل بے سر و ساماں ہے۔ بہرحال اپنے حکم سے مطلع فرمائیں۔ امیر افضل خان اور اعظم خاں نے جواب میں لکھا کہ پُوری احتیاط کے ساتھ کابل میں ہمارے پاس پہنچا دو۔ ملّا مشکی اور ملّا نصراللہ امیر افضل خاں اور اعظم خاں کے پاس گئے اور کہا کہ امیر دوست محمد خاں کے عہد میں ہم اس کا کُفر ثابت کر چکے ہیں، اب دوبارہ تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔

مصائب میں استقامت

سب نے متفق ہو کر قتل کا فتویٰ لکھا، مگر سرکاری مولویوں میں سے ملّا مشکی قدرے انصاف پسند تھا۔ اُس نے قتل کے فتوے پر دستخط نہ کیے۔ بڑی گفتگو کے بعد قتل کا فتویٰ واپس لیا گیا، لیکن علماءِ سوء کے فتوے کے مطابق آپ کو دُرّے مارے گئے۔ آپ کے سر اور ڈاڑھی کو مونڈ دیا گیا۔ آپ کا چہرۂ مُبارک سیاہ کیا گیا اور آپ کو گدھے پر سوار کر کے شہر بھر میں گشت کرایا گیا۔ پھر آپ کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

آپ کے ارادتمندوں میں سے ایک شخص آپ کے پاس قید خانے میں آ کر اس واقعہ پر رونے لگا۔ فرمایا: تو کیوں روتا ہے، عزّت اور ڈاڑھی کیا چیز ہے جو مولا کی راہ میں اور اس

کی رضا کے لیے چلی گئی۔ شکر کرو کہ دین ہاتھ سے نہیں گیا۔ رونا تو مخالفین کو چاہیے کہ وہ دین سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

ظالم حکّام کا انجام

دو سال اپنے بیٹوں کے ساتھ قید میں رہے۔ امیر افضل خاں، ۷ اکتوبر ۱۸۶۷ء کو بعارضۂ وبا مر گیا اور اس کے بعد امیر اعظم خاں تخت پر بیٹھا۔ اس نے اپنے عہدِ حکومت میں آپ کی جلاوطنی کے احکام صادر کیے اور آپ کو پیادہ پا پشاور کی طرف نکال دیا گیا۔

حضرت الامام عبدالجبّار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"آپ کی جلاوطنی کے احکام صادر کیے ہوئے ابھی ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ اس کی حکومت کا تختہ اُلٹ گیا اور شکست کھا کر پہاڑوں میں سراسیمگی کی حالت میں حیران و سرگرداں پھرنے لگا۔ اس کے اہل و عیال جو عمر بھر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے تھے، انہیں بھی جلاوطن کر دیا گیا۔"

"فلما آسفونا انتقمنا منھم"

(پھر جب اُنہوں نے ہمیں غصہ دلایا تو ہم نے اُن سے انتقام لیا)

امیر دوست محمد خاں کے خاندان کو اللہ عزّ و جل نے اپنی قُدرت کاملہ کے ساتھ ایسا پراگندہ اور منتشر کیا، گویا: فجعلنٰھُم احادیث و مزّقنٰاھم کُلّ مُمزّق۔" (پس ہم نے انہیں افسانے بنا دیا اور اُن کے پُرزے اُڑا دیے) کے مصداق یہی ہیں۔

پشاور اور پنجاب میں نصاریٰ کے ہاتھوں میں قید و بند کی سختیاں جھیل رہے ہیں اور اُن میں سے بعض جنگلوں اور پہاڑوں میں پریشاں اور سرگرداں ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو۔ ہمارے رب کا ارشاد ہے:

"من عادیٰ لی ولیاً فقد بارزنی بالحرب"۔

(جو میرے کسی دوست کے ساتھ دُشمنی کرتا ہے، وہ حقیقت میں میرے

خلاف جنگ کا اعلان کرتا ہے) بالکل سچا ہے۔ ومن اصدق من اللہ قیلاً۔ اور اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے۔"

شہر امرتسر میں

پشاور میں کچھ مدت قیام فرمایا، پھر بعض احباب کی درخواست پر پنجاب کے شہر امرتسر میں تشریف لے آئے اور کتاب و سنّت کی تبلیغ و اشاعت میں ڈوب گئے۔ توحید، اتباعِ سنّت اور عقائدِ صحیحہ پر بہت سی کتابوں اور رسالوں کا فارسی اور اُردو زبان میں ترجمہ کرواتے رہے اور عام لوگوں کے فائدے کے لیے چھپوا کر للہ تقسیم کرتے رہے۔

آخری عمر میں ضروری بات کے سوا کوئی بات نہ کرتے تھے۔ ہر وقت اللہ ہی کی طرف متوجہ رہتے تھے۔ تسبیح، تحمید اور دُعا کے سوا آپ کا کوئی دُوسرا شغل نہ رہا تھا یہاں تک کہ آپ ربیع الاوّل ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۷۹ء میں آدھی رات کے وقت اپنے اللہ سے جا ملے اور زوال کے بعد ظہر کی نماز سے پہلے دفن کیے گئے۔ آپ کا مزار شہر امرتسر میں دروازہ سُلطان ونڈ کے باہر عبدالصمد کاشمیری کے تالاب کے کنارے پر ہے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہُ وجعل جنۃ الفردوس مأواہ۔[1]

آپ کی اولاد

آپ کے بارہ صاحبزادے اور پندرہ صاحبزادیاں تھیں۔ صاحبزادوں کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔ حضرت مولانا محمدؒ، حضرت مولانا عبداللہؒ، حضرت مولانا احمدؒ، حضرت مولانا عبدالجبارؒ، حضرت مولانا عبدالواحدؒ، حضرت مولانا عبدالرحمٰنؒ، حضرت مولانا عبدالستارؒ، حضرت مولانا عبدالقیومؒ۔ حضرت مولانا عبدالعزیزؒ، حضرت مولانا عبدالحیؒ، حضرت مولانا عبدالقدوسؒ، حضرت مولانا عبدالرحیمؒ۔

---

[1] حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں جہاں کہیں حوالہ نہیں دیا گیا۔ وہ حضرت الامام عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ہی کی روایت ہے اور مخطوطہ ہی سے اخذ کی گئی ہے۔

اللہ کا ان سب پر کرم تھا۔ سب محدّث تھے اور علمِ دین اور فقر کی دولت سے مالا مال تھے[1]

مولانا محمد بن عبداللہ غزنوی نے تفسیر جامع البیان پر عربی میں حاشیہ لکھا جو میاں فیروزالدین مرحوم (ساکن جموں) نے چھپوایا اور کتاب مفت تقسیم ہوئی[2]

مولانا محمد بن عبداللہ غزنوی کے صاحبزادے مولانا عبدالاوّل اور مولانا عبدالغفور تھے۔

مولانا عبدالاوّل نے "مشکوٰۃ المصابیح" اور "ریاض الصالحین" کا اردو ترجمہ کیا اور حواشی لکھے[3]

حضرت الامام عبدالجبّار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت عبداللہ غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے واصلِ حق ہونے کے بعد اُن کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا عبداللہ بن عبداللہ اُن کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ آپ تھوڑا عرصہ زندہ رہے۔ ان کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادہ اور بندۂ عاجز کے جدِّ امجد حضرت الامام عبدالجبّار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے۔

صاحبِ "نزھۃ الخواطر" ان کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

"وہ ۱۲۶۸ھ میں غزنی میں پیدا ہوئے اور حضرت عبداللہ غزنوی سے مدتوں روحانی اور علمی فیض حاصل کیا۔ ابتدائی تعلیم اپنے بھائی مولانا محمد اور مولانا احمد سے حاصل کی۔ پھر آپ دہلی تشریف لے گئے اور میاں نذیر حسین صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کی کتابوں کی سند حاصل کی۔ اُن کی عمر بیس برس بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ علومِ متداولہ سے فارغ ہو چکے تھے۔ بہت ذہین تھے۔ مطالعہ بہت کرتے تھے۔ فہم و فراست سے انہیں حصّۂ وافر ملا تھا۔ امرتسر میں قرآن وحدیث کی تدریس کے شغل ہی میں منہمک رہتے تھے۔ دُنیا واہلِ دُنیا سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ اللہ کی عبادت میں مصروف رہتے اور مخلوق کو اللہ کی طرف

---

[1] تاریخ اہلحدیث صفحہ ۲۷۰ مولانا ابراہیم سیالکوٹی۔ [2] ہندوستان میں اہلحدیث کی دینی خدمات صفحہ ۲۹ تالیف امام خان نوشہروی [3] ایضاً صفحہ ۴۶

بُلانے میں مشغول رہتے ۔ اللہ کا ذکر بڑی باقاعدگی اور یکسوئی سے کرتے اور ذکر کے دوران اُن پر بڑی کیفیت طاری ہوتی تھی ۔ مَیں نے امرتسر میں اُن کی کئی بار زیارت کی ہے ۔ مَیں نے انہیں سلف صالحین کے مسلک پر پایا ۔ وہ علمائے ربّانی میں سے تھے ۔ فتوٰے دیتے وقت وہ کسی معیّن فقہی مسلک کا التزام تو نہ کرتے تھے لیکن ائمۂ مجتہدین سے سُوئے ظن نہ فرماتے تھے اور اُن کا ذکر ہمیشہ اچھے الفاظ میں کرتے ۔ جمعۃ الوداع ، رمضان کے مہینہ ۱۳۳۱ھ میں وفات پائی [1]"

---

[1] "نزھۃ الخواطر" ج ۸ صفحہ ۱۹-۲۱۸

حالاتِ زندگی

پیدائش

نعلیم اور اساتذہ

حضرت عبداللہ غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ

تصنیفات

عملی زندگی کا آغاز

سیاسی زندگی

کانگرس سے استعفا

میدانِ صحافت میں

علمی مضامین

صحافیانہ نوک جھونک

توحید میں لکھنے والے

جماعت اہلحدیث کی تنظیم

چند اہم واقعات

تحریکِ ختم نبوّت کی تحقیقاتی عدالت میں

مارشل لاء کے زمانہ میں آوازۂ حق

آئین کمشن کے سوالنامے کا جواب

یہ آئین نہ اسلامی ہے نہ جمہوری

مدینہ یونیورسٹی مشاورتی کونسل کی رکنیت

پیدائش

حضرت والد علیہ الرحمہ ۱۸۹۵ء میں بمقام امرتسر پیدا ہوئے۔ اُن کی ایک بیاض جسے وہ "بیاضِ احمر" کہتے تھے، کے پہلے صفحہ پر ان کے ہاتھ سے لکھی ہوئی یہ عبارت ملی ہے:

"اس عاجز کی پیدائش کی تاریخ قطعی طور پر تو معلوم نہیں ہو سکی، لیکن حکیم عبدالشافی صاحب غزنوی کی تاریخ پیدائش جو میونسپل کمیٹی امرت سر کے دفتر سے معلوم ہو سکی وہ ۲۳ رجون ۱۸۹۶ء ہے۔ ان کی والدہ مرحومہ فرماتی تھیں کہ تم گیارہ ماہ حکیم عبدالشافی سے بڑے ہو۔ اس حساب سے میری پیدائش اگست ۱۸۹۵ء کے پہلے ہفتہ یا جولائی ۱۸۹۵ء کے آخری ہفتہ میں ہوئی ہے۔ والعلم عند اللہ۔

عبدٌ ربّہٖ اسیر ذنبہٖ المفتقر الیٰ رحمۃ مولاہُ

محمد داؤد الغزنوی"

تعلیم اور اساتذہ

مجھے سنایا کرتے تھے:

"ابتدائی تعلیم میں نے حضرت والد صاحب (حضرت الامام عبدالجبار غزنویؒ) اور مولانا عبدالاوّل صاحب غزنویؒ سے حاصل کی۔ مولانا گل محمدؒ سے اُردو اور حساب کی تعلیم حاصل کی۔

جنہیں حضرت الامام عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسۂ غزنویہ میں مدرس رکھا ہوا تھا۔ دہلی ان دنوں علومِ دینیہ کا مرکز تھا۔ دل وہاں جانے کے لیے بیتاب تھا۔ حضرت والدؒ کا اتنا رُعب اور ہیبت تھی کہ اُن سے اجازت لینے کی جرأت نہ ہوئی۔ دہلی پہنچ کر حضرت والدؒ کو خط لکھا اور دہلی میں قیام کی اجازت چاہی۔ حضرت والدؒ کا اجازت نامہ آنے سے پہلے کچھ وقت مجھ پر ایسا بھی گزرا کہ میرے پاس روٹی کے لیے بھی پیسے نہ تھے۔ مَیں دن بھر پڑھتا اور دونوں وقت چنے چبا کر بسر اوقات کرتا۔"

آپ اس درسگاہ سے فیضیاب ہونے کے لیے مضطرب تھے جس سے حضرت عبدُاللہ غزنویؒ اور حضرت الامام عبدالجبّار غزنویؒ فیضیاب ہو چکے تھے اور یہ درسگاہ تھی حضرت میاں نذیر حسین صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی۔ آپ کو استاذالاساتذہ حضرت عبداللہ غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ سے علمِ حدیث پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ علومِ عقلی میں مولانا سیف الرحمٰن کابلیؒ سے استفادہ کیا۔ وہ مدرسہ فتح پوری کے مشہور مدرّس تھے اور حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک کے خاص رُکن تھے اور مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور مولانا آزادؒ سے مراسم رکھتے تھے۔

حضرت عبدُاللہ غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت عبدُاللہ غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی مختصر طور پر یہاں قلمبند کیے جاتے ہیں تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ حضرت والد علیہ الرحمہ کن عظیم المرتبت اساتذہ سے فیضیاب ہوئے تھے۔ حضرت میاں نذیر حُسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"میرے درس میں دو عبدُاللہ آئے ہیں، ایک عبدُاللہ غزنویؒ اور دوسرے عبدُاللہ غازی پوریؒ۔"[1]

---

[1] "تراجم علمائے حدیث ہند" تالیف امام ابویحییٰ خاں صاحب نوشہرویؒ صفحہ ۳۵۹

حضرت عبدالحی صاحبؒ والدِ ماجد حضرت میاں ابوالحسن علی صاحب ندوی نے اپنی کتاب "نزھۃ الخواطر" کی آٹھویں جلد میں جنابِ موصوف کے مختصر اور جامع حالاتِ زندگی لکھے ہیں۔ حضرت مولانا عبدالحیؒ حضرت مولانا عبداللہ غازی پوریؒ کے معاصر ہیں۔ کتاب عربی میں ہے۔ اس کے علاوہ امام ابو یحییٰ خاں صاحب نوشہرویؒ نے "تراجم علمائے حدیث ہند" میں اُن کے حالات خوش اسلوبی سے بیان کیے ہیں۔

آپ علومِ دینیہ کے بہتے ہوئے دریا تھے۔ ایک دُنیا آپ سے فیضیاب ہوئی۔ آپ کے حلقۂ درس سے بڑے بڑے اہل علم و فضل پیدا ہوئے۔ مولانا محمد سعید بنارسی جیسے فاضل آپ سے مستفید ہوئے۔ مولانا عبدالغفور حاجی پوری مظفر پوری اور حضرت شاہ عین الحق جیسے بزرگوں نے آپ سے استفادہ کیا۔ مولانا عبدالسلام مبارک پوری اور مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری صاحب "تحفۃ الاحوذی" نے آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیے۔[1]

الشیخ الصالح علامہ عبداللہ، عبدالرحیم بن دانیال کے فرزند تھے۔ ۱۲۶۱ھ میں ضلع اعظم گڑھ میں مئو کے مقام پر پیدا ہوئے۔[2] آپ نے بارہ سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا۔ فارسی اور عربی کی بعض درسی کتابیں مولوی قائم صاحب موی سے ہی پڑھیں۔ یہ وہی زمانہ ہے جب ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی برپا ہوئی تھی اور بہت سے لوگ بے خانماں ہوئے۔ آپ کے والدین نے اسی زمانے میں مئو چھوڑ کر غازی پور میں سکونت اختیار کی۔ غازی پور کے مدرسہ "چشمۂ رحمت" میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی نعمت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے درسی کتابوں کی تکمیل کی۔ پھر جونپور تشریف لائے اور "مدرسہ امامیہ حنفیہ" سے مفتی یُوسف بن محمد اصغر لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا۔[3]

مولانا عبداللہ غازی پُوری رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں:

---

[1] "تراجم علمائے حدیث" صفحہ ۳۶۰ [2] "نزھۃ الخواطر" جلد ۸ صفحہ ۲۸۷

[3] "نزھۃ الخواطر" ج ۸ صفحہ ۲۸۷

"میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک مقام پر ہجوم بہت ہے۔ لوگ جوق در جوق چلے آرہے ہیں۔ کسی نے کہا سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم تشریف فرما ہیں۔ لوگ آپ سے شرفِ مصافحہ حاصل کر رہے ہیں۔ ایک صاحب اس بھیڑ سے باہر نکلے۔ میں نے پوچھا:

"کیا آپ نے مصافحہ کر لیا ہے؟"

انہوں نے کہا: "جی ہاں۔"

میں نے کہا: "ازراہِ کرم اپنا وہ ہاتھ مجھے دے دیجیے۔ میں بھی مشرف ہو جاؤں اور برکت حاصل کر لوں۔"

وہ صاحب کہنے لگے: "تم خود ہمّت کر کے آگے بڑھو، اس ہجوم سے نہ گھبراؤ اور مصافحہ کا شرف حاصل کرو۔" اُن کے ہمّت دلانے پر میں آگے بڑھا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بلاواسطہ مصافحہ کا شرف حاصل کیا۔ جن صاحب نے مجھے ہمّت دلائی تھی، میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور میں بہت مسرور تھا۔ بیدار ہُوا تو وہی مسرت اور کیفیت دل میں باقی تھی۔

اس خواب کی تعبیر مجھے یہ سُوجھی کہ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے چشمۂ صافی سے براہِ راست فیضیاب ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔[1]"

اس خواب کے بعد علمِ حدیث کی پیاس بجھانے کے لیے کشاں کشاں دہلی پہنچے اور حضرت میاں نذیر حُسین صاحب محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے فیضیاب ہُوئے۔[2] پھر ۱۲۹۷ھ میں حج کی سعادت حاصل کی اور حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ اور امام شوکانیؒ صاحبِ "نیل الاوطار" کے شاگردِ رشید شیخ معمّر عباس بن عبدالرحمٰن بن محمد بن الحسین، ابن القاسم الیمنی رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کی سند حاصل کی۔ اس کے بعد ہندوستان لوٹے اور غازی پور میں سکونت اختیار کی۔[3] پھر غازی پور ہی میں مدرسہ "چشمۂ رحمت" میں تدریس کا کام سرانجام دینے لگے اور اس درسگاہ کے مدرّس اعلیٰ کے رُتبے پر فائز ہوئے۔ آپ کی برکت سے "چشمۂ رحمت"

---

[1] اخبار اہلحدیث امرتسر ج ۱۷، صفحہ ۱۶۷ [2] "تراجم علمائے حدیث ہند" صفحہ ۳۶۲ [3] نزہۃ الخواطر" ج، سنہ ۱۸

حقیقی معنوں میں فیضان اور رحمت کا سرچشمہ بن گیا جس سے طلباء اپنی تشنگی بجھانے کے لیے دُور دُور سے چل کر آتے رہے۔ آپ نے بدعات اور محدثات کے خلاف بڑی قوت سے آوازہ بلند کیا اور تمام وہ سنتیں جو مدفون اور مستور ہو چکی تھیں، انہیں از سرِ نو زندہ کیا۔ اتباعِ سنت کے جُرم کی پاداش میں انہیں ایذائیں دی گئیں حتیٰ کہ انہیں اللہ کی خاطر غازی پُور کو خیرباد کہنا پڑا اور مولانا عبدالعزیز صاحب اور مولانا محمد ابراہیم صاحب آروی کے اصرار پر "مدرسۂ احمدیہ" آرہ کی قیادت منظور فرمائی۔ یہاں بیس سال تک یہ دولتِ علم لٹاتے رہے۔ جس وقت مدرسۂ احمدیہ، آرہ کے بانی مولانا ابراہیم آروی رحلت فرما گئے تو مولانا عبداللہ غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ کا قیام بھی آرہ میں نہ رہ سکا۔ دہلی والوں کی درخواست پر آپ دہلی چلے آئے اور ایک مدت تک لوگوں کو فیضیاب کیا۔ دہلی میں آٹھ سال قیام رہا۔ آپ کا معمول دہلی میں یہ تھا کہ صبح حوض والی مسجد (نئی سڑک) میں درسِ قرآن دیتے۔ ظہر تک "مدرسہ ریاض العلوم" (نزد جامع مسجد) میں اور بعد ظہر مدرسہ علیجان (متصل گھنٹہ گھر) میں پڑھاتے۔ جب لکھنؤ میں آپ کے عزیز خان بہادر فوت ہوئے تو ان کی تعزیت کے لیے آپ لکھنؤ تشریف لے گئے، مگر وہاں گھریلو معاملات میں ایسے اُلجھے کہ پھر دہلی نہ جا سکے۔ لکھنؤ میں بھی اُن کا فیضان جاری رہا۔ ندوۃ العلماء کے بعض مُمتاز طالب علم آپ سے پڑھنے آتے۔ اُن میں کچھ شامی طالب علم بھی تھے۔ یہ اُن کی زندگی کے آخری ایام تھے۔ لکھنؤ ہی میں وفات پائی۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے۔[۱]

مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ وہ سربرآوردہ فقیہہ تھے اور اس قدر تبحرِ علمی کے باوجود اور درس و تدریس میں اس قدر مشغول ہونے کے باوصف، وہ نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔[۲]

مولانا عبدالحیؒ لکھتے ہیں: "وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ ہفتے میں ایک یا دو بار

---

[۱] "تراجم علمائے حدیث ہند" صفحہ ۳۶۵ و ۳۶۴۔ [۲] نزہۃ الخواطر ج ۸ صفحہ ۲۸۷

میرے پاس تشریف لاتے اور جمعہ کی نماز میری اقتداء میں پڑھتے تھے۔"[1]

تصنیفات

ابراء اہلحدیث والقرآن، فصولِ احمدی۔ یہ رسالہ علمِ صرف پر ہے۔ النحو، ایک رسالہ منطق پر اُردو زبان میں لکھا۔ مقدمہ صحیح مُسلم (عربی زبان میں)، "تسہیل الفرائض" (یہ علم میراث پر ہے)[2] ایک رسالہ مسئلہ تراویح کی تحقیق پر لکھا۔[3]

مولانا موصوف کی وفات لکھنؤ میں چہار شنبہ کی شام، صفر کے مہینے میں ۱۳۳۷ھ میں ہوئی اور عیش باغ کے قبرستان میں عشاء کے بعد اس علم وفضل اور زُہد وتقویٰ کے پیکر کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔[4]

حضرت والد علیہ الرحمہ نے حضرت مولانا عبدُاللہ غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ سے اکتسابِ فیض کیا اور حضرت مولانا عبداللہ غازی پوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے فیضیاب ہوئے اور حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ محمد اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا اور حضرت شاہ محمد اسحٰق صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے خلف الرشید بھی تھے اور نواسے بھی اور شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اپنے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین تھے۔

حضرت والد علیہ الرحمہ کی عملی زندگی کا آغاز

حضرت والد علیہ الرحمہ فارغ التحصیل ہونے کے بعد امرتسر واپس آ گئے اور بڑی مستعدی اور ذوق وشوق کے ساتھ اپنی آبائی درسگاہ یعنی مدرسۂ غزنویہ میں تفسیر اور حدیث کی تدریس کا کام سرانجام دینے لگے اور ایک عرصہ تک کتاب وسنّت کے چشمۂ صافی سے تشنہ کامانِ علمِ دیں کی پیاس بجھاتے رہے۔

اس زمانے میں تدریس کے ساتھ ساتھ تبلیغ واشاعتِ اسلام، تحریکِ آزادیٔ وطن سے اپنی دلچسپی اور کمالِ خطابت کی وجہ سے "امرتسر" میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا تھا۔

---

[1] "نزھۃ الخواطر" ج ۸ صفحہ ۲۸۷، ۲۸۸ [2] تراجم علمائے حدیث ہند۔ صفحہ ۳۶۵۔
[3] نزھۃ الخواطر ج ۸ صفحہ ۲۸۸ [4] ایضاً۔

سیاسی زندگی

۱۹۱۹ء کی بات ہے جب تُرک انگریز کے خلاف صف آرا تھے اور مسلمانانِ ہند کی ہمدردیاں تُرکوں کے ساتھ تھیں۔ اُسی زمانے میں تحریکِ خلافت کا آغاز ہوا۔ حضرت والد علیہ الرحمہ اس تحریک کے سرگرم رکن تھے۔

جب اُنہوں نے سیاست میں قدم رکھا، وہ دَور انگریز کے جبر اور استبداد کا دَور تھا۔ ملک میں مارشل لاء نافذ تھا۔ انہوں نے انگریز کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی۔ وہ حق گوئی اور بیباکی کا پیکر بن گئے۔ جن لوگوں کو اس دَور میں ان کی تقریریں سُننے کا موقع ملا، اُن کا کہنا ہے کہ جب وہ انگریز کے خلاف تقریر کرتے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ آگ برسا رہے ہیں اور اُن کے لفظوں پر شعلوں کا گمان ہوتا تھا۔ اُن کی اور اُن کے رفقاء کی بیباکانہ تقریروں کا یہ اثر ہوا کہ عوام کے دلوں سے مارشل لاء کی ہیبت اُٹھ گئی۔ اُن کی شعلہ فشانی نے جمود کی برف توڑ ڈالی اور عوام کے دلوں میں انگریز کے خلاف نفرت کی چنگاریاں سُلگنے لگیں اور حصولِ آزادی کا جذبہ اُبھرنے لگا۔ انگریز کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اُٹھی اور وہ پُوری گرم جوشی کے ساتھ اُسے اپنے دامن سے ہوا دیتے رہے۔

جلیانوالہ باغ کے حادثے میں حضرت والد علیہ الرحمہ اور میرے چچا حضرت مولانا اسماعیل علیہ الرحمہ بال بال بچ گئے۔ جس روز جلیانوالہ باغ کا حادثہ ہوا، یہ دونوں بھائی نمازِ عصر سے فارغ ہو کر جلیانوالہ باغ کی طرف روانہ ہُوئے۔ ان دونوں بھائیوں نے اس روز جلیانوالہ باغ میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرنا تھا۔ مسجدِ غزنویہ سے نکل کر ملکہ وکٹوریہ کے بُت کے قریب پہنچے تو وہاں ایک تنبولی کی دوکان پر پان کھانے کے لیے رُک گئے۔ اسی اثناء میں جنرل ڈائر اپنی گورا فوج کے ہمراہ جلیانوالہ باغ کی طرف جاتے ہُوئے اُن کے قریب سے گزرا۔ وہ پان کھا کر

کر شنا مارکیٹ تک ہی پہنچے تھے کہ جنرل ڈائر گولی چلا کر سینکڑوں افراد ہلاک کرنے کے بعد واپس آ رہا تھا۔
۱۹۲۱ء میں جمعیتِ علمائے ہند کی تشکیل ہوئی تو اس کی تاسیس و تشکیل میں مؤثر کردار ادا کیا۔
ابتدا میں مجلسِ عاملہ کے رُکن تھے پھر مدتوں نائب صدر رہے۔ یہ ۱۹۲۱ء ہی کی بات ہے کہ برطانوی سامراج کے خلاف اس قدر گرجدار آوازہ بلند کیا کہ تین سالوں کے لیے میانوالی جیل میں نظر بند کر دیے گئے۔ رہا ہوئے تو پہلے سے بھی زیادہ گرمجوشی کے ساتھ آوازۂ حق بلند کیا۔ ۱۹۲۵ء میں دوسری بار گرفتار ہوئے۔ اس دفعہ اُنہوں نے جیل میں قیدیوں کے ساتھ حکّام کے غیر انسانی سلوک کیخلاف زبردست احتجاج کیا اور حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ سیاسی نظربندوں کو مناسب مراعات دے۔ ۱۹۲۷ء میں اُنہوں نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تحریک میں بھرپور حصّہ لیا اور تیسری بار قید و بند کی آزمائش سے دوچار ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں چند خلافتی ساتھیوں کو ساتھ لے کر اُنہوں نے مجلسِ احرارِ اسلام کی بُنیاد ڈالی۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے اشتراک اور تعاون سے اُنہوں نے مجلسِ احرار کے پہلے سیکرٹری کی حیثیت سے دو اڑھائی برس کے مختصر عرصے میں اسے ایک منظّم اور جاندار تحریک بنا دیا۔ ۱۹۳۲ء میں جب احرار نے تحریکِ کشمیر" شروع کی تو برِّصغیر کے ہزاروں احرار رضا کاروں سے ریاست کی جیلیں بھر گئیں اور خود حضرت والد علیہ الرحمہ بھی گرفتار کر لیے گئے۔ ۱۹۴۲ء میں جب کانگریس نے "ہندوستان چھوڑ دو" کی مہم شروع کی تو وہ کانگریس میں شامل ہو گئے اور اس مہم میں بھرپور حصّہ لیا اور گرفتار کر لیے گئے۔ فرماتے تھے کہ انگریز مجلسِ احرار کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور کانگریس ہی ایک ایسی فعّال جماعت تھی جسے برطانوی حکومت درخورِ اعتنا سمجھتی تھی اور وہی ایک واضح اور مرتّب لائحہ عمل پیشِ نظر رکھ کر برطانوی سامراج سے برسرِ پیکار تھی، اسی بنا پر میں کانگریس میں شامل ہوا تھا۔
کبھی کبھی یُوں بھی فرماتے:

"اُن دنوں انگریز دشمنی کا عجب عالم تھا، ہر وہ چولہا جس میں انگریز کے خلاف آگ جل رہی ہوتی تھی ہم اس میں اور ایندھن جھونکتے تھے اور اُسے اپنے دامن

سے ہَوا دیتے تھے۔"

پھر انہیں پنجاب کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا اور وہ اس جماعت کے ٹکٹ پر پنجاب اسمبلی کے رُکن منتخب ہوئے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس وقت پُورے پنجاب میں وہ تنہا تھے جو لیگی اُمیدوار کے مقابلے میں کانگریس کے ٹکٹ پر جیتے تھے اور یہ بات اُن کے عوام میں اثر و رسوخ اور ہردلعزیزی کا واضح ثبوت ہے۔

کانگریس سے استعفا

جب حضرت والد علیہ الرحمہ نے دیکھا کہ کانگریس کی ذہنیت تو مہاسبھائیوں کی سی ہے اور ہندو مسلم اتحاد کا محض ڈھونگ رچا رکھا ہے تو وہ کانگریس سے اسی وقت مستعفی ہو گئے۔ ۲ راگست ۱۹۴۶ء کے اخبارات میں ان کا جو بصیرت افروز بیان چھپا وہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

"لاہور ۲ راگست۔ "ہر قسم کی مساوات" کی مخالفت کر کے کانگریس نے نیشنلسٹ مسلمانوں کے لیے فکر و تدبر کا سامان بہم پہنچا دیا ہے۔ اگر آج کانگریس کا مفہوم اور مقصد صرف اسی قدر رہ گیا ہے کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے ہندوؤں کی سیاسی اور اقتصادی بہبود اور ترقی کے لیے کوشاں ہے تو ان مسلمانوں کے لیے اس میں ٹھہرنے کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے جو اس میں اس لیے شامل ہُوئے تھے کہ یہ آزادی کے لیے انگریز سے لڑ رہی ہے۔"

مولانا داؤد غزنویؒ سابق صدر پنجاب کانگریس کمیٹی نے اخبارات کے نام ایک طویل بیان دیتے ہُوئے نیشنلسٹ مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ کانگریس کے باب میں اپنے روّیہ پر نظرِ ثانی کریں۔ آپ اپنے بیان کے دوران میں فرماتے ہیں کہ ۱۰، ۱۱، ۱۲ جون ۱۹۴۶ء کو دہلی میں تمام نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعتوں مثلاً جمعیت العلمائے ہند، مجلسِ احرار اور مومن کانفرنس کی مجالس ہائے منتظمہ کا ایک مُشترکہ جلسہ ہوا تھا جس میں اُنہوں نے مندرجہ ذیل مطالبات وضع کیے تھے:

۱۔ عارضی اور مستقل گورنمنٹ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مساوات کا اصُول تسلیم کیا جائے۔

۲۔ اختلاف کی صورت میں مجلسِ قانون ساز کے صدر کی نہیں بلکہ فیڈرل کورٹ کے جج کی رائے حتمی تسلیم کی جائے۔

ان مطالبات کو کانگریس کی مجلسِ منتظمہ کے پاس مناسب کارروائی کے لیے بھیجا گیا لیکن نہ صرف یہ کہ کانگریس نے ان مطالبات کا کوئی نوٹس نہ لیا اور نیشنلسٹ مسلمانوں کو ان کی رسید سے بھی اطلاع نہ دی بلکہ اُنہوں نے اپنے مطالبات میں جو اُنہوں نے وزارتی مشن کے سامنے رکھے، نیشنلسٹ مسلمانوں کے مطالبات کی صریح مخالفت کی؛ چنانچہ یہ بات واضح ہے کہ کانگریس اب "ہر قسم کی مساوات" کی مخالف ہے۔

اس صورت میں سوال یہ ہے کہ آیا نیشنلسٹ مسلمان کانگریس کے صرف خیمہ بردار بن کر رہ جائیں گے؟ آگے چل کر آپ اپنے بیان میں فرماتے ہیں: قانون ساز اسمبلی کے لیے کانگریس نے بعض مشہور مہاسبھائیوں مثلاً راجہ مہیشور دیال، ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی اور سر ٹیک چند وغیرہ کو منتخب کر کے اپنے شدید طور پر فرقہ دار جماعت ہونے کا ثبوت دیا ہے۔

مولانا صاحب نے غیر لیگی مسلمانوں سے درخواست کی ہے کہ وہ واقعات کی روشنی میں اپنے موقف کا تجزیہ کریں اور مسلم لیگ میں شامل ہو کر ملت اور ملک کی بہتری کے لیے سرگرم عمل ہوں۔[1]"

میں نے ایک دفعہ اُن سے پوچھا کہ آپ نے لیگ میں شامل ہوتے وقت کیا مولانا ابوالکلام سے مشورہ کیا تھا؟ تو فرمانے لگے کہ اگر اُن کے پاس مشورے کے لیے چلا جاتا تو مجھے کبھی مسلم لیگ میں شامل نہ ہونے دیتے۔ قرینِ مصلحت یہی تھا کہ لیگ میں شمولیت کے اعلان کے بعد اُن سے ملاقات کرتا۔

لیگ میں شامل ہونے کے بعد اُنہوں نے ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا اور مسلمانوں کے سامنے ہندو اور انگریز دونوں کے عزائم بے نقاب کیے اور اُن کے

---

[1] تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء، چودھری حبیب احمد ص ۳۵، ۴۳۳

خلاف آگ لگادی مسلم لیگ کو اس سے بڑی قوّت حاصل ہوئی۔ مُسلم لیگ کی سول نافرمانی کے پہلے روز ہی نواب ممدوٹ اور حضرت والد علیہ الرحمہ کے علاوہ ورکنگ کمیٹی کے تمام ارکان گرفتار کر لیے گئے۔ نواب ممدوٹ بھی گرفتار ہو گئے اور اُن کے بعد تحریک چلانے کی ذمہ داری حضرت والد علیہ الرحمہ کے کندھوں پر آپڑی۔ اسی تحریک کے سلسلے میں قائد اعظمؒ سے اُن کی مفصّل ملاقات ہُوئی اور قائد اعظمؒ نے انہیں ہدایات دیں۔ قائدِ اعظمؒ سے ملاقات کے بعد جب وہ واپس آئے تو وہ قائدِ اعظمؒ کی ذہانت، سیاسی تدبّر اور فراست سے بہت متأثّر نظر آتے تھے۔

میدانِ صحافت میں

یکم اپریل ۱۹۲۷ء کو امرتسر سے ہفتہ وار "توحید" کا پہلا شمارہ حضرت والد علیہ الرحمہ کی ادارت میں شائع ہُوا۔ "توحید" کی مکمل فائل اس وقت راقم الحروف کے سامنے ہے۔ پہلے شمارے کے سرورق پر جلی حروف میں یہ دُعا اور اس کا ترجمہ لکھا:

"ربِّ ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لّدُنکَ سُلطاناً نصیراً۔"

(اے پروردگار! جس راستہ پر میں نے قدم رکھا ہے اور جو سفر میں نے اختیار کیا ہے، اس میں مجھے بہتر مقام تک پہنچائیو اور تمام مشکلات اور مخالف طاقتوں کے ہجوم سے بہتر طریق سے نکالیو ——— میں عاجز و کمزور اور ضعیف و ناتواں ہوں مگر تُو اپنی نُصرت و اعانت سے اس کارزارِ حق و باطل میں فتح و غلبہ دیجیو۔" آمین۔)

"توحید" کی پیشانی پر ہمیشہ یہ آیت مرقوم ہوتی تھی:

"لا تَھِنُوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کُنتُم مُؤمنین"[۱]

"توحید" کے پہلے شمارے میں علامہ اقبالؒ کی نظم "موحد" چھپی جس کا مطلع یہ ہے:

ہم نشیں! مُسلم ہوں مَیں، توحید کا حامل ہوں مَیں
اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں مَیں

"توحید" میں اگرچہ علمی اور ادبی مضامین بھی ہوتے تھے لیکن اس کا اوّلین مقصد دعوت الی اللہ" تھا۔ "توحید" کے مضامین پڑھتے ہُوئے یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی صورِ اسرافیلؑ ہاتھ میں لے کر سوئے ہُوئے انسانوں کو خوابِ غفلت سے چونکا رہا ہے اور مُردہ انسانوں کے

---

[۱] ترجمہ: ہمت مت ہارو اور غمزدہ مت ہو جاؤ۔ اگر حقیقی معنوں میں تم مومن ہو تو سب پر تم ہی غالب رہو گے۔

اندر زندگی کی رُوح پھونک رہا ہے۔ "توحید" کے پہلے شمارے کا افتتاحیہ حضرت والد علیہ الرحمہ نے عربی زبان میں لکھا جو کئی صفحات پر مشتمل ہے۔ اس افتتاحیے میں بھٹکے ہوئے فلسفیوں، جاہل صوفیوں، ضمیر فروش مولویوں اور ملّت فروش سیاسی لیڈروں کی خوب خبر لی ہے۔ اس افتتاحیے میں، معاشرے کے ہر ہر طبقے کو الگ الگ جھنجھوڑا ہے۔ اس افتتاحیے کے آخر میں بڑے درد اور کرب کے ساتھ لکھتے ہیں:

"فیاللاسلام والمسلمین! قد اختلف دعوة الدعاة، وتشعبت بهم السُبُل، وظهر اعجاب کل ذی رأی برأیه، وتهاون العلماء فی الامر بالمعروف والنهی عن المنکر، وظهر الفساد فی البرّ والبحر بما کسبت ایدی النّاس، وانعکست القضیة الیٰ ان صارت السنة بدعة والبدعة سنة والمعروف منکراً والمنکر معروفاً وعاد الاسلام غریباً کما بدأ غریباً فطوبیٰ للغرباء۔"

(ہائے اسلام اور ملّتِ اسلامیہ کی بیچارگی! ہر داعی کی پکار مختلف ہے اور سب کی راہیں جُدا جُدا ہیں اور ہر ایک کو اپنی ہی رائے بھا گئی ہے۔ علماء نیکی کا حکم دینے اور بُرائی سے روکنے میں سُست ہو گئے اور لوگوں کی بد اعمالیوں کے ہاتھوں برّ و بحر میں فساد پھیل گیا ہے۔ معاملہ بالکل اُلٹ گیا۔ سُنّت بدعت ہو گئی اور بدعت کو سُنّت سمجھا جانے لگا۔ نیکی کو بدی اور بدی کو نیکی خیال کیا جانے لگا اور اسلام پردیسی ہو گیا جیسا کہ وہ ابتداء میں پردیسی تھا۔ پس خوشخبری ہے پردیسیوں کے لیے)

اردو میں پہلا مضمون اس عنوان سے لکھا:

"توحید کا مقصد
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر
یا
جہاد فی سبیل اللہ"

اس مضمون کی تین قسطیں ہیں جو بالترتیب پہلے تین شماروں میں چھپتا رہا۔ اس مضمون میں

"توحید" کے اجزاء کا مقصد شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور تمام طاغوتی طاقتوں کے خلاف آوازۂ حق پوری قوت کے ساتھ بلند کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہر اطاعت کے ساتھ ایک سرکشی اور ہر وفاداری کے ساتھ ایک بغاوت اور ہر عاجزی کے ساتھ ایک غرور و تمرّد لازمی ہے۔ آپ ایک آقا کے نوکر نہیں ہو سکتے جب تک اور آقاؤں کی غلامی سے انکار نہ کر دیں۔ ایک چوکھٹ پر سرِ عجز و نیاز جب ہی جھک سکتا ہے جب اور تمام سر جھکانے والی چوکھٹوں پر سے مغرورانہ گزر جائیں۔ آپ ایک ہی جانب اپنا منہ نہیں کر سکتے جب تک ہر طرف سے منہ نہ پھیر لیں اور ایک ہی سے اپنا رشتہ جوڑ نہیں سکتے، جب تک ہر طرف سے رشتہ نہ کاٹ لیں۔ پس خدا اور اس کے رسول ص کی اطاعت کے لیے سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اس کے سوا اور جتنی قوتیں اپنی اطاعت اور غلامی کی طرف بلاتی ہیں، ایک موحدِ صادق اُن سے باغی ہو جائے۔ اس کی محبت میں سرشار ہو کر اس کے تمام دشمنوں کا دشمن اور اس کے دوستوں کا دوست اور محبّ بن جائے۔ پس جو لوگ اس کی اطاعت کے مدّعی ہیں، اُن کو اطاعت سے پہلے سرکشی کا، وفاداری سے پہلے بغاوت کا اور دوستی سے پہلے دشمنی کا ثبوت دینا چاہیے کیونکہ کوئی ہستی خدا کی مطیع ہو نہیں سکتی جب تک قوّتِ ابلیسی کے تمام مظاہر سے باغی و متمرّد نہ ہو جائے جس میں کا سب سے بڑا مظہر خود نفسِ انسانی ہے اور انسان سے باہر بھی طرح طرح کی گمراہیوں اور باطل پرستیوں کے مختلف مظاہر ہیں۔ انسانوں کے بے شمار غول ہیں جنہوں نے شیطان کے ہاتھ پر بیعت کر کے اِس طرح اُس کی اطاعت میں اپنے تئیں فنا کر دیا ہے کہ ان کا وجود از سر تا پا پیکرِ شیطانی اور مجسمۂ ابلیس بن گیا ہے اور ان میں سے ہر قوّتِ شیطانی انسان کو اپنے آگے مرعوب دیکھنا چاہتی ہے، کہیں دولت و مال اور

دنیوی جاہ و جلال شیطان کا نشیمن بنا ہوا ہے، کہیں غرورِ علم و فضل کے اندر سے شیطان جھانک رہا ہے، کہیں مذہبی پیشواؤں کی جماعتیں اس کا آلۂ کار بنی ہوئی ہیں، کہیں اہل و عیال کی محبت میں، قومی رسم و رواج کی بندشوں اور آبائی تقلید کی زنجیروں کے اندر بھی اسی کے تعبّد اور انقیاد کی کشش مخفی ہے۔

پس مقام "من یطع اللہ والرسول" کے حاصل کرنے کے لیے اوّلین شرط یہ ہے کہ انسان ان تمام طاقتوں کی اطاعت و فرمانبرداری سے یکسر باغی و سرکش ہو جائے اور اُن کی عظمت و جبروت کے اثر سے اپنے دل کو آزاد کر دے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جہاں تک طلبِ صادق کی قوت اور توفیقِ الٰہی کی ہمت اس کا ساتھ دے، ان تمام ابلیسی مظاہر کے مقابلے میں ایک اولوالعزمانہ جہاد کا اعلان کر دے اور اطاعت و تعبدِ الٰہی کی بے نیام تلوار لے کر فاتحانہ کھڑا ہو جائے تاکہ بدعت و ضلالت کا ہر بت جو سامنے آئے، حق و صداقت، توحید و سنت کی بے پناہ ضرب سے پاش پاش کر دے اور خُدا کے دین کی عزت و عظمت کو بُلند کرنے کے لیے اپنی زبان کو، اپنے دماغ کو اور اپنی تمام قوتوں کو وقف کر دے۔ لتکون کلمۃ اللہِ ھی العلیا۔[1]

"توحید" کے پانچویں شمارے میں ایک معرکہ آرا مضمون:

"صراطِ مستقیم

یعنی

مسلمانوں کے لیے موجودہ تفرّق و انتشار میں شاہراہِ عمل"

لکھا۔ یہ مضمون بھی تین قسطوں میں چلا۔ اِس مضمون میں بھی مُسلمانوں کو آفتابِ رسالت ﷺ سے مستنیر ہونے کی دعوت دی۔ لکھتے ہیں:

---

[1] شمارہ ۲ جلد ۱ صفحہ ۳

"پس مسلمان اگر چاہتے ہیں کہ اس چشمۂ حیات پر پہنچیں، جہاں اُن کی پیاس اور تشنہ کامی کے لیے کافی سامانِ راحت موجود ہے تو اُن کو معلوم ہونا چاہیے کہ آج تمام عالم میں صرف ایک ہی ہاتھ ہے جو ان کی راہنمائی کر سکتا ہے اور ایک ہی چشمِ نگراں ہے جو لغزشوں سے اُن کو بچا سکتی ہے اور وہ وہی ہے جو کبھی (کوہِ سینا) پر تجلّیِ حق بن کر چمکی، کبھی (فاران) کی چوٹیوں پر ابرِ رحمت بن کر نمودار ہوئی، کبھی (غارِ ثور) میں "لا تحزن ان اللہ معنا" کی صدا میں تھی، کبھی بدر کے کنارے "ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم" کے پیغام میں تھی اور کبھی اُحد کے دامن میں "وکان حقاً علینا نصر المؤمنین" کی بشارت تھی اور آج بھی بدعات و محدثات اور فسق و فجور کی تاریکیوں میں مسلمانوں کا راہ بھولا ہوا قافلہ اگر صراطِ مستقیم پر گامزن ہونا چاہتا ہے تو اس کے لیے اس عالمِ یاس و ناامیدی میں اُمید کا آخری سہارا اور بحرِ ظلمات کی تاریکیوں میں روشنی کا ایک ہی مینار ہے جس سے وہ اپنا کھویا ہوا راستہ تلاش کر سکتے ہیں[1]۔"

اُن کی اس دَور کی تحریریں بڑی ولولہ انگیز ہیں اور اُن کی تحریر میں خطابت کا زور اور روانی ہے اور تبلیغی مقاصد کے لیے ایسی تحریریں نہایت اثر آفریں ہوتی ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

"اگر ہم نے اپنے تئیں اس سے محروم رکھا اور دنیا کے ہر حسن و جمال سے اپنی زیبائش کو رونق دے لی تو پھر میں آپ سے کہتا ہوں اور یقین کی اس لازوال طاقت کے ساتھ جس کے لیے کبھی موت اور شکست نہیں اور اس بصیرت کے ساتھ جس میں نہ تو تذبذب ہے اور نہ تزلزل، از سر تا پا صدائے ربّانی بن کر کہتا ہوں کہ یہ آپ کی سیاسی، اقتصادی اور تنظیمی جدّ و جہد تمام بے کار اور ضائع

---

[1] شمارہ نمبر ۵۔ صفحہ ۴

ہو گی بلکہ جس قدر سعی و کوشش اپنی رہائی اور مخلصی کی کریں گے، اپنی ذلّت و نامردی کی چاروں طرف لپٹی ہوئی زنجیروں کی بندش اور سخت تر ہو جائے گی اور دُنیا میں ایک لمحہ کے لیے بھی ہمیں کامیابی و کامرانی کا چہرہ دیکھنا نصیب نہ ہو گا

آپ کہتے ہیں کہ آگ جلاتی ہے اور پانی ڈبوتا ہے، مچھلی خشکی میں اور پرند دریا میں زندہ نہیں رہ سکتے، لیکن میں کہتا ہوں یہ ممکن ہے کہ آگ نہ جلائے اور پانی نہ ڈبائے مچھلیاں خشکی میں اور پرند دریاؤں میں زندہ رہیں، لیکن یہ ناممکن ہے کہ خدا کا وہ قانونِ ہدایت و شقاوت بدل جائے جس کے لیے ایک بھی مستثنیٰ نہیں۔ جو کچھ میں آپ سے کہہ رہا ہوں اس کے لیے میرے دل میں یقین و اذعان کی ایک ایسی حیّ و قائم آواز ہے جس کی ترجمانی کے لیے افسوس کہ میرا خزینۂ الفاظ ناکافی ہے اور میں حیران ہوں کہ کس طرح اس دلی یقین کو آپ کے دلوں میں پیدا کروں۔ تاہم میں یہ کہوں گا اور جب تک میرے قلم میں روانی اور زبان میں طاقتِ گویائی ہے یہ کہوں گا اور کہتا چلا جاؤں گا اور یہ کہنے سے کبھی نہ تھکوں گا کہ کتاب اللہ کے جن احکام کو اور رسُول اللہؐ کی جن سنّتوں کو تم مذہبی بندش کہہ کر گزر جاتے ہو، وہ بندش تو ضرور ہے لیکن یاد رکھو! کہ نظمِ کائنات کے تمام اجزاء اسی بندش سے بندھ کر مرتّب اور منظّم ہوتے ہیں اور یہی وہ بندش ہے جس کو لسانِ الٰہی نے کہیں "حدود اللہ" اور کہیں "سُنّۃ اللہ" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے اور کبھی صراطِ مستقیم" اور دینِ قیّم" کا خطاب دیا ہے۔[1]

"صراطِ مستقیم" میں مذہبی فرقہ بندیوں کے خلاف انہوں نے بھرپور آواز اُٹھائی اور مسلمانوں کو اتحاد و یگانگت کی دعوت دی۔ اس مضمون کی تیسری قسط میں یوں رقمطراز ہیں:

---

[1] شمارہ نمبر ۵ صفحہ ۹

"قرآنِ کریم نے سختی کے ساتھ اس اختلاف اور فرقہ بندی سے منع کیا اور گمراہ قوموں کے نقشِ قدم پر چلنے سے روکا اور مسلمانوں کی شان کے اس کو یکسر خلاف بیان کیا اور فرمایا:

ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءھم البیّنات۔

(مسلمانو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے اپنے مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور اللہ تعالیٰ کے صریح احکام کے ہوتے ہوئے پھر بھی اختلاف کیا۔)

آج ہم نے بھی خدا کے صریح احکام کے ہوتے ہوئے تفرق و تحزب کی شدید ترین مذمّت قرآن مجید میں پڑھتے ہوئے اور اسی اختلاف و فرقہ بندی سے اگلی اُمتوں کی تباہ حالیاں معلوم کر لینے کے بعد اسلام کو بھی کئی فِرقوں میں تقسیم کر دیا۔ بس نہ تو گزشتہ قوموں سے ہم عبرت حاصل کر سکے اور نہ ہم نے اللہ کی کتاب کی اس بارہ میں ترغیب و ترہیب کو قبول کیا۔ اُس نے تو یہ فرمایا کہ

انّ الذین فرّقوا دینھم وکانوا شیعًا لست منھم فی شیٔ (۶۔ ع ۲۰)

(جن لوگوں نے مذہب میں تفرقہ اندازی کی اور اسے مختلف فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے، نہ تمہارا اُن سے کوئی واسطہ نہیں ہے)

لیکن ہم نے کہا کہ اسلام چار فرقوں میں منقسم ہے اور جو ان چار فرقوں سے علیحدہ ہوا وہ ناری اور جہنمی ہے اور اسکا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں اور اگر اسی پر کفایت کرتے تو ایک بات بھی تھی، لیکن اس کے بعد ہر فریق نے دوسرے فریق کے ساتھ نفرت و حقارت کا سلوک کیا۔ نماز جو سب مسلمانوں کو خدا کے حضور جمع کرنے والی چیز تھی، اس میں ہم نے کہا کہ شافعی امام کے پیچھے حنفی کی نماز جائز نہیں اور حنفی کے پیچھے شافعی کی نماز جائز نہیں۔ اس تفریق و تجزّی کو ہم نے معراجِ کمال تک پہنچانے کے لیے بیت اللہ، مسجد الحرام کے بھی چار ٹکڑے کر دیے۔ وہ جگہ جو وحدتِ اسلام اور اتحاد کلمۃ المسلمین کے بہترین مناظر پیش کرتی تھی، اس میں ہم

نے یہ منظر پیش کیا کہ اگر حنفی نماز پڑھ رہے ہیں تو شافعی بیٹھے اُن کا مُنہ تک رہے ہیں اور اِس انتظار میں ہیں کہ کب اُن کا امام آئے تو نماز پڑھیں اور اگر شافعی نماز پڑھ رہے ہیں تو حنفی نہایت اطمینان سے بیٹھے ہوئے منتظر ہیں کہ حنفی امام آئے تو نماز پڑھیں۔

لیکن اس جہل و بے بصیرتی کو ملاحظہ کیجیے کہ یہ اختلاف و فرقہ بندی جو مسلمانوں کی تباہی کا باعث ہوئی، اس کو "اختلاف اُمّتی رحمۃ" (میری اُمت کا اختلاف رحمت ہے) سُنا کر مُسلمانوں کے لیے مرغوب و محبوبِ طبائع بنانے کی کوشش کی۔ پس اس قوم کی بدبختی و نامرادی پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ جو پیاس اور تشنگی کی ہلاکت سے بچنے کے لیے ریگ زار کی طرف دوڑی چلی جارہی اور ریت کے چمکتے ہُوئے ذرّوں کو سمجھ رہی ہو کہ یہ میٹھے پانی کا تالاب ہے۔ لیکن یاد رکھو! کہ جس طرح ریت کا چٹیل میدان اس کے لیے سیر کامی اور سیرابی کا کوئی پیغام اپنے اندر نہیں رکھتا، ٹھیک اسی طرح یہ اختلاف اور فرقہ بندی بھی تمہارے لیے کوئی پیغامِ رحمت نہیں رکھتی اور اگر آج بھی اس اختلاف اور فرقہ بندی کو تم اپنے لیے رحمت سمجھتے ہو جب کہ اس کی بدولت تمہاری قومی زندگی کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے تو پھر تمہاری مثال اُس نادان مریض کی سی ہے جو بدن کو سمّی مادہ سے پھُولتے ہُوئے دیکھ کر خوش ہو رہا ہو کہ مَیں تنو مند اور طاقتور ہو رہا ہوں، حالانکہ وہ زندگی کے آخری لمحات ختم کر رہا ہے اور قریب ہے کہ وہ زہر اس کے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ لیکن تُم نے مصری کے دھوکے میں جو زہر کی ڈلی کھائی ہے اُس نے توحیدِ اسلام کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں۔ اب کس چیز کا انتظار ہے؟"[1]

---

[1] شمارہ نمبر ۷، صفحہ ۴۳، ۴۴

"توحید" میں ایک مضمون "عیدِ مولد النبیّ صلی اللہ علیہ وسلّم" کے عنوان سے لکھا جس میں
کتاب و سنّت کی روشنی میں مجالسِ میلاد کا تجزیہ کیا گیا ہے، لیکن ملاحظہ فرمایئے کہ کس حکمت
اور حُسنِ سلیقہ سے بدعات و محدثات سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ مضمون کے ابتدائی حصے
میں امر بالمعروف کے لیے زمین یوں ہموار کرتے ہیں :

"اس میں کوئی شک نہیں کہ عشقِ محمدیؐ اور محبّتِ نبویؐ کے پاکیزہ جذبات
اور ذوق و شوق کے مخلصانہ ولولے ایک مومنِ قانت اور مُسلمِ صادق کی زندگی
کی سب سے قیمتی متاع اور محبُوب جنس ہے اور یہ صحیح ہے کہ یہ محبّت اور
شیفتگی انسانی سعادت اور صداقت کا سر چشمہ ہے کیونکہ یہ محبّت و عقیدت
اُس مقدّس و مطہّر وجود کے ساتھ ہے جس کو خدا نے تمام کائناتِ انسانی میں
ہر طرح کی محبوبیت اور ہر قسم کی محمودیت کے لیے چُن لیا ہے اور اس سے زیادہ
کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کائناتِ ارضی میں بڑی سے بڑی بات جو کسی انسان کے
لیے کہی جا سکتی ہے، زیادہ سے زیادہ عشق اور اعلیٰ سے اعلیٰ مدح و ثنا جو کسی
انسان کے لیے کی جا سکتی ہے غرضکہ انسان کی زبان انسان کے لیے جو کُچھ
کہہ سکتی ہے اور کر سکتی ہے وہ سب کا سب اس کامل انسان اور اکمل "عبد"
کیلئے ہے جس کو خُدا نے اپنی غلامی کے لیے مخصوص کر لیا، جس کو خُدا نے عبدیت
کے عزّ و شرف سے سب سے زیادہ بہرہ ور کیا :

"سُبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الی
المسجد الاقصیٰ"

(کیسا پاک ہے وہ خداوندِ قدوس جس نے ایک رات اپنے بندے کو مسجدِ
حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کرائی۔)

اور جس کو کبھی تو "یا ایھا الرّسُول" کے خطابِ عزّت سے نوازا، اور کبھی

"یا ایها المزمّل" کے طرقِ محبت سے پکارا، اور کبھی "یا ایھا المدثّر" کی صدائے شفقت سے سرفراز اور جس آبادی میں وہ بسا اور جس شہر کی گلیوں میں وہ چلا پھرا، کبھی اس کی عزت و عظمت کو دنیا میں نمایاں کرنے کے لیے فرمایا: "لا اقسم بھٰذا البلد وَ انت حل بھٰذا البلد"

(ہم مکّہ کی قسم کھاتے ہیں یعنی جس سرزمین پر تو رہا اور بسا ہے)

پس جس کی محبوبیت اور محمودیت کا یہ مرتبہ ہو اس کی یاد میں جتنی گھڑیاں کٹ جائیں اور جتنی بھی راتیں آنکھوں میں بسر ہو جائیں اور اس کی محبت و عشق اور مدح و ثنا میں جس قدر بھی زبانیں زمزمہ پیرا ہوں یقیناً روح کی سعادت اور دل کی طہارت اور انسانیت کا حاصل ہے لیکن آپ کی ولادت، آپ کی حیاتِ طیبہ کا ذکر اور اس کے لیے مجالس کا انعقاد اسی وقت ذریعۂ ارشاد و ہدایت ہو سکتا ہے جب کہ یہ مجالس و محافل "اسوۂ حسنہ" کے جمال کی تجلّی گاہ ہوں۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحیح حالاتِ زندگی سُنائے جائیں۔ آپ کے اخلاقِ عظیمہ، خصائلِ کریمہ اور سُننِ مطہرہ کی طرف لوگوں کو دعوت دی جائے۔"[۱]

مضمون کے آخری حصّے میں امر بالمعروف کا فریضہ یوں انجام دیتے ہیں:

"ربیع الاوّل کے مہینہ میں ہر جگہ عید میلاد کی مجلسیں منعقد ہوتی ہیں اور ماہ ربیع الاوّل میں تشریف لانے والے مقدس انسان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے مدح و ثنا کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور غنا و سرود کے نغموں میں قصائدِ مدحیہ پڑھے جاتے ہیں۔ کافوری شمعوں کی قندیلیں روشن کی جاتی ہیں، پھولوں کے گلدستے سجائے جاتے ہیں۔ مجلس میں گلاب کے چھینٹوں سے مشامِ رُوح کو معطّر کیا جاتا ہے۔

---

[۱] شمارہ نمبر ۱۹ صفحہ ۲

لیکن اے کاش کہ جس کی یاد اور محبّت میں ہم اپنے گھروں کو مجلسوں سے آباد کرتے ہیں، اس کی جگہ دل کی اُجڑی ہُوئی بستیوں کو آباد کرتے، پھُولوں کے گلدستوں کی جگہ ہم اپنے اعمالِ حسنہ کے مُرجھائے ہُوئے پھُول کو تازہ کرتے اور روشن قندیلیوں کی جگہ ہم اپنے دل کی اندھیاری کو دُور کرنے کے لیے چراغِ مصطفویؐ کو تلاش کرتے۔ نہیں بلکہ میں تو یہ کہتا ہُوں کہ اگر ہماری مجلسیں تاریک ہوتیں، ہمارے اینٹ اور چُونے کے مکانوں کو زیب و زینت کا ایک ذرّہ بھی نصیب نہ ہوتا، ہماری آنکھیں رات رات بھر مجلس آرائیوں میں نہ جاگتیں، ہماری زبانوں سے ماہِ ربیع الاوّل کی ولادت کے لیے دُنیا ایک حرف بھی نہ سُنتی، لیکن ہماری رُوح معمور ہوتی، ہماری دل کی بستی نہ اُجڑتی اور ہماری زبانوں سے نہیں بلکہ ہمارے خصائلِ حمیدہ، اخلاقِ کریمہ اور اعمالِ حسنہ کے اندر سے "اسوۂ حسنۂ نبویؐ" کی مدح وثنا کے ترانے اُٹھتے۔ دُنیا ہم کو، ہمارے اعمال کو، ہمارے حُسنِ معاملات، شریفانہ عادات، مخلصانہ عبادات و اطاعات اور صدقِ مقالات کو دیکھ کر اعزاز و تکریم کی صداؤں میں پکار اُٹھتی کہ یہ خیرالامم "اُمّتِ مسلمہ" ہے[1]

علمی مضامین

تبلیغی مضامین کے علاوہ "توحید" میں حضرت والد علیہ الرحمہ نے بلند پایہ علمی اور تحقیقی مضامین بھی لکھے۔ ایک مضمون "امامِ ہدایت اور امامِ سیاست"[2] کے عنوان سے تین قسطوں میں لکھا جس میں منصبِ امامت پر نہایت شرح و بسط سے روشنی ڈالی۔ ایک تحقیقی مضمون "تدوینِ حدیث" پر لکھا جس کا عنوان: "تاریخ جمع و تدوین احادیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم"[3] ہے۔ اس مضمون میں یہ تحقیق کی گئی ہے کہ عہدِ نبویؐ اور عہدِ صحابہؓ و تابعینؒ میں حدیث کا کتنا سرمایہ ضبطِ تحریر میں آچکا تھا اور آیت "یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" اور "ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ" کی تشریح بھی فرمائی ہے۔

---

[1] شمارہ نمبر ۲، ج ا صفحہ ۲ [2] شمارہ نمبر ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ج ا [3] شمارہ نمبر ا ج ۳

صحافیانہ نوک جھونک

اپنے ہم عصر صحافیوں سے کبھی کبھار نوک جھونک بھی کرتے تھے۔ حضرت والد علیہ الرحمہ نے ایک مضمون "توحید" میں لکھا جس میں مولانا غلام رسول مہرؒ کی سیاسی زندگی کی نیرنگیوں اور سائمن کمیشن کے آنے سے پہلے اور بعد کے موقف کا ذکر کرنے کے بعد دریافت کیا تھا کہ یہ مولانا مہرؒ کا سیاسی اصطباغ ہے؟ مولانا مہرؒ نے "انقلاب" میں "سچائی کی شدھی" کے عنوان سے اس کا جواب دیا۔ بڑی دلچسپ نوک جھونک رہی۔ مولانا مہرؒ کے جواب میں حضرت والد علیہ الرحمہ نے بھرپور وار کیا۔ مولانا مہرؒ سے خطاب کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

"آپ فرماتے ہیں: "یہ نہ سمجھا جائے کہ میں اپنے عزیز دوست کے خلاف نہایت تلخ حقائق پیش کرنے سے عاجز ہوں۔ ہرگز نہیں۔ میرے دامنِ معلومات میں خدا کے فضل سے بہت کچھ جمع ہے اور لغت پر بھی مجھے کم از کم اتنا عبور ضرور حاصل ہے کہ اس سے کام لے کر اپنے دوست کو برسوں انگاروں پر لوٹا سکتا ہوں۔" اس کے جواب میں اپنے "دوست" سے عرض کروں گا کہ آپ بے شک میرے خلاف حقائق پیش کرنے میں کوتاہی نہ کریں اور اپنی لغت دانی سے کم از کم نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے ہوئے جو کچھ لکھ سکتے ہیں، لکھ لیجیے اور آپ کے ترکش میں جس قدر تیر ہیں ایک ایک کا مجھ کو نشانہ بنا کر دیکھ لیجیے۔ میں آپ کو اور آپ کے تمام رفقاء کو دعوت دیتا ہوں کہ جو کچھ آپ سے بن پڑتا ہے کر گزریئے اور پھر دیکھ لیجیے کہ آپ مجھے کتنے سال انگاروں پر لوٹا سکتے ہیں! فاجمعوا امرکم وشرکاءکم ثم لا یکن امرکم علیکم غمۃ ثم اقضوا الی ولا تنظرون۔

تُم اور تمہارے سب رفقاء مل کر ایک تدبیر کر لو، پھر تمہاری تدبیر تم میں سے کسی سے پوشیدہ نہ رہے اور سب کے سب اس کی تکمیل میں شریک ہو جاؤ

پھر جو کچھ تم کو میرے خلاف کرنا ہے کر گزرو اور مجھے کوئی مہلت نہ دو۔

عزیزِ من! سونے کو کسوٹی پر کسنے کی کیا دھمکی دیتے ہو، یہ دھمکی تو پیتل کے چمکیلے زیوروں کے لیے ہو سکتی ہے جن کی چمک اور دلفریبی کو کسوٹی کی ایک رگڑ مات کر سکتی ہے۔ بھلا جو شخص اپنی مستقل سیاسی زندگی کے پہلے ہی سال میدانِ سیاست کی خاردار جھاڑیوں سے اُلجھ کر رہ گیا ہو اور اس راستہ کی ابھی ایک منزل بھی طے نہ کرنے پایا ہو کہ دلدل میں پھنس کر قافلہ والوں سے بچھڑ گیا ہو، اور جوں جوں اس دلدل سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہو اور دھنسا چلا جا رہا ہو وہ اُس شخص کو دھمکی دے سکتا ہے جو ایسی کئی دلدلوں سے پاؤں نکال کر گزر گیا ہو اور ایسی کئی جھاڑیوں سے دامن سنبھال کر نکل گیا ہو، جس کو ایک سائمن کمیشن نہیں ایسے کئی راہزنوں نے کمند پھینکی ہو، جس کو ایک سر شفیع نہیں، ایسے کئی فسوں سازوں نے اپنا افسونِ محبت پھونکا ہو، جس کو ایک سر اقبال نہیں، ایسے کئی ہوشربا ساقیوں نے جام بھر بھر کر پیش کیے ہوں لیکن نہ تو کسی کی کمند اس کے پاؤں کو پھنسا سکی، نہ کسی کا افسوں اس کو مسحور کر سکا۔ نہ کسی کی مخمور آنکھ اس کو اپنی طرف مائل کر سکی، اس کو بھلا وہ شخص دھمکی دے سکتا ہے جس نے بازارِ طمع کی پہلی ہی دوکان پر اپنی عقل و خرد کی متاع کو فروخت کر دیا ہو۔ جو شخص ۱۹۱۹ء سے لے کر اس وقت تک برابر ایک ہی راستہ پر قائم ہو اور باوجود ہر قسم کی مالی پریشانیوں اور دشمنوں کی ایذا رسانیوں کے اس کا نعرہ ایک ہی رہا ہو:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما
اے تو افلاطون و جالینوسِ ما

جس کی اس نو سال کے عرصہ میں یہ حالت ہو گئی ہو کہ جس درد کو داغ اور پھر زخم بنا کر اپنے پہلو میں پالا ہو اور ہر چند کہ صحرائے نجد کے دیوانے کی طرح وہ تمنا کرتا ہو کہ اس عشق سے توبہ کرے اور اس درد کو جو آب ناسور کی شکل میں نہاں خانۂ دل میں محفوظ ہے نکال پھینکے، لیکن اس کی حالت یہ ہو:

اَلَیسَ وعدتنی یا قلب انی   اذا ما تبتَ عن لیلیٰ تتوبُ

فھا انا تائبٌ عن حبّ لیلیٰ   فمالکَ کلّما ذکرت تذوبُ [1]

بھلا اس شخص کو وہ دھمکی دے سکتا ہے جو اپنی مستقل سیاسی زندگی کے پہلے ہی سال گھٹنوں کے بل گر کر اپنی ٹانگوں کو شل کر چکا ہے؟ جس کے لیے ہماری شہادت کی ضرورت نہیں بلکہ مولانا مہر کا اپنا نامۂ اعمال "انقلاب" خود اس کا بہترین شاہد ہے۔

اِقرأ کتابکَ کفیٰ بنفسکَ الیومَ عَلیکَ حسیباً [2]

توحید کا آخری شمارہ یکم مئی ۱۹۲۹ء کو شائع ہوا۔ اس کے بعد حالات کی نامساعدت کی وجہ سے جاری نہ رہ سکا۔

توحید میں لکھنے والے

حضرت والد علیہ الرحمہ کے علاوہ بہت سے مُمتاز عُلماء اور مقتدر ہستیوں کے مضامین "توحید" میں چھپتے رہے جن میں سے چند ایک کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا ابو الکلام آزادؒ، مولانا عبدالواحد غزنویؒ۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ، مولانا اسماعیل غزنویؒ، مولانا محمد علی قصوریؒ ایم اے، مولانا محی الدین قصوریؒ۔

---

[1] ترجمہ: اے دل! تو نے وعدہ نہ کیا تھا کہ جب میں لیلیٰ کی محبت سے توبہ کر لوں گا، تو تو بھی باز آجائے گا۔ لو میں اس کی محبت سے تائب ہوتا ہوں، لیکن اے دل تجھے کیا ہو گیا ہے کہ جب بھی اس کا ذکر چھڑتا ہے تو پگھلنے لگتا ہے۔ (مرتب) [2] شمارہ نمبر ۲۴۔ ج ۳

جماعتِ اہلحدیث کی تنظیم

۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ملک کے بعد جماعتِ اہلحدیث کی از سرِ نو تنظیم پر اُنہوں نے اپنی توجہ مرکوز کردی اور بڑی محنت اور جانفشانی سے مغربی پاکستان کے تمام علاقوں کا دَورہ کیا۔ قریہ قریہ بستی بستی خود تشریف لے گئے اور جماعت کو منظّم کیا۔ جماعت میں رُکن سازی کا شعور پیدا کیا۔ ابتدائی شہری اور ضلعی جمعیّتوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ مجلسِ شوریٰ قائم کی گئی۔ جماعتِ اہلحدیث کی تاریخ میں یہ شرف انہی کو حاصِل ہوا کہ جماعت کے لیے باضابطہ دستور مرتب کیا اور اسے جماعت میں نافذ کیا۔ مختلف علاقوں کے اہلحدیث عوام میں باہم تعلّق اور ربط پیدا کرنے کے لیے اور تبلیغ و اشاعتِ دین کی غرض سے متعدّد سالانہ کانفرنسوں کا اہتمام کیا۔

اس دستور کا انداز اور ڈھانچہ تقریباً وہی تھا جو کانگریس کے دستور کا تھا۔ میں نے ایک دن نہایت ادب کے ساتھ ان کی خدمت میں عرض کیا:

"کانگریس ایک سیاسی جماعت ہے اور اس کے لیے یہ دستور بالکل درست ہے اور انتخابات کی مہم سے اس کے سیاسی مزاج میں پختگی پیدا ہوتی ہے لیکن جماعتِ اہلحدیث جس کا اوّلین مقصد تبلیغ و احیائے دین ہے کا الیکشن کی اُکھاڑ پچھاڑ میں لگے رہنا اس کے لیے سمِّ قاتل ہے۔ جماعت کے سربرآوردہ افراد کی صلاحیّتیں انتخابات لڑنے اور جیتنے ہی میں غارت ہو جائیں گی اور وہ تمام بیماریاں جو سیاسی جماعتوں میں ہیں، جماعت اہلحدیث میں بھی سرایت کر جائیں گی —— جھوٹا پروپیگنڈا، اکھاڑ پچھاڑ، سازباز، حُبِّ مال، حُبِّ جاہ۔ للّٰہیّت اور رُوحانیت برباد ہو جائے گی۔ تزکیۂ نفس، رُوحانی تربیت اور اعلائے کلمۃ الحق کا وہ عظیم مقصد جو ہمارے اسلاف کے پیشِ نظر تھا،

نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔"

حضرت والد علیہ الرحمہ سے میری یہ گفتگو ان کی آخری عمر میں ہوئی تھی، جب وہ خود بھی اس دستور کو آزما چکے تھے۔ وہ میری بات پوری توجہ اور دلچسپی سے سنتے رہے۔ اگرچہ وہ خاموش رہے لیکن ان کا چہرہ اور ان کی آنکھیں میری گفتگو پر تصدیق اور توثیق کی مہریں ثبت کر رہی تھیں۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے عرض کیا:

"ایک دینی جماعت کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں مال اور عہدوں کی ہوس کے سب مواقع بند کر دیے جائیں اور صرف وہی لوگ اس میں ٹھہر سکیں جو مشنری سپرٹ کے ساتھ محض رضائے الٰہی کے لیے کام کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں، جو اپنا وقت، اپنا مال، اپنی توانائی اور اپنی تمام صلاحیتیں اللہ کی راہ میں کھپا سکیں"۔ میں نے عرض کیا: دینی جماعت کا نظام ایسا ہونا چاہیے کہ حصولِ رضائے الٰہی کے سوا کسی اور مقصد کے لیے داخل ہونے والوں کا سانس اس مقدس فضا میں گھٹنے لگے اور جماعت کے ہر فرد کے دل و دماغ پر ایک ہی بات چھائی ہوئی ہو ——— الٰہی انتَ مقصودی و رضاکَ مطلوبی۔"

حضرت والد علیہ الرحمہ نے فرمایا تم جن خدشات کا اظہار کر رہے ہو، وہ سب معرضِ وجود میں آ چکے ہیں۔ پھر زیرِ لب مسکراتے ہوئے یہ شعر پڑھا:

ایتہا النّفسُ اجملی جزَعاً ——— اِنَّ ما تحذرینَ قد وقعا

(اے دل! گھبراہٹ کا اظہار ذرا حسنِ سلیقہ سے کر، جس بات سے تم ڈرتے تھے وہ معرضِ وجود میں آ چکی)

چند اہم واقعات

تحریکِ ختمِ نبوّت کی تحقیقاتی عدالت میں

۱۹۵۳ء میں تحریکِ ختمِ نبوت اور اس کی تحقیقات کے لیے حکومت کی طرف سے سابق چیف جسٹس مسٹر محمد منیر اور جسٹس ایم آر کیانی پر مشتمل ایک عدالت مقرّر کی گئی۔ سب جماعتوں کے الگ الگ وکیل تھے جو تحقیقاتی عدالت کے سامنے اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے تھے۔ تحفّظِ ختمِ نبوّت کے راہنما جیل میں بند تھے۔ مذہبی جماعتوں کے متحدہ محاذ کی مجلسِ عمل کے ناظمِ اعلیٰ حضرت والد علیہ الرحمہ تھے۔ مجلسِ عمل کے وکیل مسٹر حسین شہید سہروردی مرحوم تھے اور والد علیہ الرحمہ انہیں تیاری کراتے تھے، لیکن مسئلہ میں کچھ ایسی علمی پیچیدگیاں تھیں اور اس کی نوعیت میں کچھ ایسے الجھاؤ تھے کہ سہروردی صاحب نے وکالت سے معذرت چاہی اور وکالت و نمائندگی کا تمام بوجھ حضرت والد علیہ الرحمہ پر آن پڑا۔ ان کی بحث اور دلائل سے متأثر ہو کر ایک دن جسٹس کیانی نے کہا:

"اگر میرے بس میں ہوتا، تو میں آپ کو وکالت کا لائسنس دے دیتا۔ میں آپ کے دلائل سے بہت متأثر اور مستفید ہوتا ہوں۔"

جسٹس منیر نے اُن سے سوال کیا: "کیا آپ کے دادا مرحوم کو غزنی سے اس لیے نکال دیا گیا تھا کہ وہ اہلحدیث تھے اور احناف انہیں برداشت نہیں کرتے تھے؟"

حضرت نے فرمایا: "نہیں! اُن کو تو اس لیے نکالا گیا تھا کہ وہ بہت بڑے دلی تھے اور اُن کا حلقۂ ارادت اس قدر وسیع ہو گیا تھا کہ حکومت کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ کہیں حکومت پر قابض نہ ہو جائیں۔"

منیر صاحب نے درحقیقت یہ سوال اس مقصد سے کیا تھا کہ وہ لوگوں پر ظاہر کریں

کہ خود احناف اور اہلحدیث کے درمیان اختلافات کی ایک وسیع خلیج حائل ہے، لیکن حضرت اُن کے دام میں نہیں آتے تھے۔ مُنیر صاحب نے پینترا بدلا اور ایک اور سوال میں پھنسانا چاہا:

"کیا آپ "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ" کہنے والے کو مُشرک قرار دیتے ہیں؟"

فرمایا: "یہ کہنے والے کی نیّت پر منحصر ہے۔ ہر وہ شخص جو یہ الفاظ زبان سے نکالتا ہے، مُشرک نہیں قرار دیا جاسکتا۔ ابھی آپ نے بھی یہ الفاظ زبان سے نکالے ہیں مگر ہم آپ کو مُشرک نہیں کہیں گے۔" وہ پھر دام سے صاف بچ کر نکل گئے۔

جسٹس مُنیر صاحب نے اُن سے ایک سوال یہ بھی کیا:

"مولانا! آپ عبدالوہاب کو اپنا مذہبی راہنما مانتے ہیں؟"

اُنہوں نے جواب دیا: "عبدالوہاب نام کا کوئی شخص ہمارا مذہبی راہنما نہیں ہے۔"

مُنیر صاحب نے اپنی بات پر اصرار کرتے ہوئے کہا:

"عبدالوہاب آپ کا راہنما ہے۔"

حضرت نے سختی سے انکار کیا کہ نہیں ہے۔ جب دو تین دفعہ دونوں کے درمیان "ہے" اور "نہیں ہے" کی تکرار ہوئی تو مُنیر صاحب بوکھلا گئے۔ مُنیر صاحب کی گھبراہٹ دیکھ کر حضرت نے کہا: "غالباً آپ کی مُراد محمد بن عبدالوّہاب سے ہے۔"

کہنے لگے: "جی ہاں! میری مُراد یہی ہے۔"

حضرت نے فرمایا: "وہ عبدالوہاب نہیں، محمد بن عبدالوہاب ہیں۔"

مُنیر صاحب نے کہا: "اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

فرمایا: "واہ! باپ اور بیٹے کا فرق آپ کے نزدیک کوئی فرق نہیں؟"

اس کے بعد مُنیر صاحب کو اس سلسلے میں سوال وجواب کی ہمّت نہ ہوئی۔

مارشل لاء کے زمانہ میں آوازۂ حق

۱۹۵۸ء میں جب مارشل لاء ملک میں نافذ ہُوا، تو ہر طرف ہراس چھایا ہُوا

تھا۔سب کی زبانیں گنگ ہوگئی تھیں۔بڑے بڑے جغادری لیڈروں کی تحریر و تقریر مداہنت زدہ ہوگئی تھی۔راقم الحروف حالات کی سنگینی پر یہ شعر پڑھتا تھا:

نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن! کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے

اس جمود کی برف توڑنے کی سعادت حضرت والد علیہ الرحمہ کو حاصل ہوئی اور منٹو پارک کے میدان میں عید کے خطبے میں مارشل لا کی خوب دھجیاں بکھیریں اور فوجی حکومت کی روش پر واشگاف لفظوں میں تنقید کی۔

آئین کمیشن کے سوالنامے کا جواب

فروری ۱۹۶۰ء میں سابق صدر ایوب نے ملک میں آئندہ دستور کے لیے ایک آئین کمیشن مقرر کیا تھا۔اس کمیشن کی طرف سے چالیس سوالات پر مشتمل ایک سوالنامہ مرتب کیا گیا تھا،جو اخبارات میں شائع ہوا اور ملک کی مشہور شخصیتوں کو بھی سرکاری طور پر بھیجا گیا تھا۔مقصد یہ تھا کہ حکومت کو اس کا مناسب جواب دیا جائے اور آئندہ دستور اس جواب کی روشنی میں ترتیب دیا جائے۔

اس ضمن میں حضرت والد علیہ الرحمہ نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اور دوسرے علماء سے رابطہ قائم کیا اور ۵،۶ مئی ۱۹۶۰ء کو ملک کے تمام مکاتب فکر کے علماء کا اجلاس جامعہ اشرفیہ (نیلا گنبد) میں منعقد کیا۔اس مجلس میں انیس علمائے کرام شریک تھے۔جواب کا مسودہ حضرت والد علیہ الرحمہ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے مرتب کیا۔اس میں مکمل جمہوریت کے نفاذ اور پارلیمانی نظام حکومت کے قیام کی واضح اور غیر مبہم لفظوں میں تائید کی گئی تھی۔اس مقصد کے لیے علماء کو اکٹھا کرنے اور ایک جواب پر سب علماء کو متفق کرنے میں انہوں نے ایک مؤثر کردار ادا کیا۔

یہ آئین نہ اسلامی ہے نہ جمہوری

۱۹ مارچ ۱۹۶۲ء کو سابق صدر ایوب نے

آئے۔ اُنھوں نے حضرت سے مُلاقات کی خواہش ظاہر کی۔ حضرتؒ اپنے رفقاء کے ہمراہ صدر سے ملنے گورنمنٹ ہاؤس تشریف لے گئے۔ راقم الحروف بھی اُن کے ساتھ تھا۔ صدر ایوّب نے دستور کے متعلق اُن کی رائے طلب کی۔ حضرت نے تفصیل کے ساتھ دستور کے اچھے اور بُرے پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور واضح لفظوں میں صدر ایوّب سے کہا :

"میری رائے یہی ہے کہ یہ آئین نہ تو اسلامی ہے اور نہ جمہوری۔"

صدر ایوّب کے لیے یہ جواب خلافِ توقع تھا۔ صدر ایوّب تعجب سے اُن کی طرف دیکھنے لگے اور گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

مدینہ یُونیورسٹی مشاورتی کونسل کی رُکنیّت

مئی ۱۹۶۲ء میں شاہ سعُود بن عبدالعزیز نے اپنے سفیر متعیّنہ پاکستان کی وساطت سے حضرت والد علیہ الرحمہ کو مطلع فرمایا کہ اُنھوں نے مدینہ یُونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے اُنھیں "مدینہ یونیورسٹی مشاورتی کونسل" کا رُکن نامزد کیا ہے۔ شاہ سعود نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ حضرت ایسے وقت سعودی عرب تشریف لائیں کہ حجِ بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کر سکیں اور ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ بمطابق ۲۵ مئی ۱۹۶۲ء، کو مدینہ یونیورسٹی کا جو افتتاح ہو رہا ہے اُس میں بھی شرکت فرمائیں۔ حضرت نے دعوت قبول فرما لی اور ۷ مئی کو لاہور سے کراچی روانہ ہُوئے اور ۹ مئی کو کراچی سے عازمِ حجاز ہُوئے اور ۱۵ جون ۱۹۶۲ء کو لاہور واپس تشریف لے آئے۔

آخری ایّام

آخری ایّام

آخری دن

حضرت والد علیہ الرحمہ زندگی کے آخری دو برس مسلسل بیمار رہے۔ دل کے عارضے میں مُبتلا تھے۔ دل کی شریانوں میں خون گاڑھا ہو جانے کی وجہ سے دورانِ خُون میں رکاوٹ پیدا ہوتی، اس رکاوٹ سے دل میں شدید درد ہوتا۔ کتنی راتیں انہیں دردِ دل کے ہاتھوں بستر پر بیٹھے بیٹھے کاٹنی پڑیں۔ رات بھر ہونٹ سی کر چُپ چاپ بیٹھے رہتے۔ جہاں تک بن پڑتا، گھر والوں کو نہیں جگاتے تھے۔ آہیں کھینچنے اور کراہنے سے بھی اجتناب کرتے۔ ۱۹۶۲ء میں جب شاہ سعود کی دعوت پر وہ حجاز تشریف لے گئے، تو مدینہ منورہ میں دل کے دمے کا شدید دورہ ہوا۔ واپسی پر مجھے بتاتے تھے: "مدینہ منوّرہ میں جس ہوٹل میں میرا قیام تھا مولانا مودودی صاحب بھی وہیں ٹھہرے ہُوئے تھے، جس رات مجھے دورہ پڑا، مولانا مودودی کئی گھنٹے میرے پاس بیٹھے رہے۔ جب تک مجھے افاقہ نہیں ہوا، وہ اپنے کمرے میں نہیں گئے۔"

پھر مولانا مودودی صاحب کو دُعا دی۔ "اللہ انہیں جزائے خیر دے۔"

حجاز سے واپس آنے کے بعد گریہ اُن پر اکثر طاری رہتا تھا۔ ایک دن عشا کے وقت جب گھر کے تمام افراد اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے اور میں اتفاقاً بیٹھا رہا۔ فرمانے لگے:

"لوگ سمجھتے ہیں، میں بیماری کی وجہ سے روتا ہوں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کا آج کل مجھ پر شدید غلبہ ہے۔ اُن کی ذاتِ گرامی میرے دل و دماغ پر چھا گئی ہے۔"

یہ فقرے بڑی مشکل سے اُنھوں نے پُورے کیے اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ درود شریف ان دنوں کثرت سے پڑھتے تھے۔ مولانا عبدالرحمان جامیؒ کے نعتیہ کلام پر ایک دن بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے، میں نے مولانا جامیؒ کی نعت کا ایک مطلع پڑھا ؎

نسیم الصبح زر منی رُبیٰ نجد و قبلّھا
کہ بُوئے دوست مے آید ازاں پاکیزہ منزلہا

(اے بادِ نسیم! میری طرف سے نجد کے ٹیلوں کے پاس جا اور اُنہیں بوسے دے
کہ اُن مقدس جگہوں سے دوست کی مہک آتی ہے)

چہرے کا رنگ بدل گیا اور آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔ باقی شعر پڑھنے کی ہمّت مجھے نہ ہوئی۔ زندگی کے آخری سال میں دل کا دمہ مسلسل رہا۔ بیماری اُن کے جسم کو برابر چاٹتی رہی۔ مگر اُن کے عزم، اُن کی ہمّت اور اُن کی رجائیت کو چاٹنے سے یکسر قاصر رہی۔ ۵ مارچ ۱۹۶۳ء کو گلاب دیوی ہسپتال میں داخل ہُوئے۔ ہسپتال ایمبولینس کار میں سٹیچر (STECHER) پر گئے۔ چلنے سے پہلے شیروانی پہنی، سر پر ٹوپی رکھی، ہاتھ میں چھڑی لی، چھڑی سمیت سٹیچر پر لیٹ گئے۔ یہ وضع داری وہ آخری دن تک نبھاتے رہے۔ تعجب ہوتا تھا کہ اتنی لمبی بیماری کاٹنے کے باوجود اُن کے مزاج میں چڑچڑا پن پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ حلم اور مزاج کا دھیما پن روز بروز بڑھتا گیا۔ ذرا طبیعت سنبھلتی تو طبیعت کی ظرافت اور چہرے کی بشاشت لوٹ آتی۔ کار ہسپتال پہنچی اور ڈاکٹر بلیغ الرحمٰن خیر مقدم کے لیے تشریف لائے۔ کہنے لگے: "آپ کی طبیعت پہلے سے بہتر معلوم ہوتی ہے۔" والد صاحب نے مسکرا کر غالب کا یہ شعر پڑھا:

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

۲۶ مئی کو وہ ہسپتال سے گھر آئے جیسا کہ وہ اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں: "آج ڈاکٹر بلیغ الرحمٰن ہسپتال سے رخصت لے کر مکان پر آ گیا۔ علاج انہی کا جاری

ہے صحت بحمداللہ پہلے سے بہتر ہے۔ معدے اور جگر کی اصلاح ہو رہی ہے مگر آہستہ رفتار سے۔ سانس کی تکلیف بھی پہلے سے کم ہے۔ سات آٹھ ماہ بستر پر پڑے رہنے سے کمزوری بہت زیادہ ہے۔"

یہ طبیعت کا سنبھلنا محض عارضی تھا۔ گھر آنے کے بعد ان کی طبیعت بگڑتی چلی گئی۔ نقاہت بڑھتی گئی۔

جب تک ان میں سکت رہی، انتہائی نقاہت کے باوجود نماز باقاعدگی سے وقت پر پڑھتے رہے۔ روزے برابر رکھتے رہے، نمازِ تراویح التزام سے پڑھتے رہے۔ رمضان میں ۲۹ویں کی شب ہمارے ہاں قیام ہوتا تھا۔ ۱۹۶۲ء تک وہ قیام اللیل میں شریک ہوتے رہے اور رات تک نوافل پڑھتے رہے۔ ۱۹۶۲ء کے روزنامچے میں ۲۹ویں رمضان کو لکھتے ہیں:

"آج رات ۲۹ویں رمضان مبارک تھی۔ عزیز ابوبکر سلمہ اللہ تعالیٰ نے قیام کا انتظام کیا تھا۔ شہر کے تمام اچھے اچھے قاری صاحبان میرے دستخطوں سے خطوط لکھ کر بلانے کا انتظام کیا تھا۔ سب مدعو قاری صاحبان آگئے، رات بھر قیام رہا۔ عاجز شروع میں کھڑے ہو کر، پھر بیٹھ کر نوافل پڑھتا رہا۔ تین بجے کے بعد وتر پڑھائے مگر اس قدر تھک گیا کہ بیٹھ میں اعصابی درد رہا۔"

آخری ایام

آخری دنوں میں بات کم کرتے تھے۔ رب اغفر وارحم وانت خیر الراحمین اکثر پڑھتے تھے۔ کبھی کبھی تبقاضائے بشریت خیال آتا کہ میرے بعد فلاں بات کا کیا ہوگا؟ تو ساتھ ہی کہہ اٹھتے اللہ ربی لا اشرک بہ شیئًا۔

آخری دنوں میں بیماری کی شدت، نقاہت اور بے خوابی کی وجہ سے صبح کی نماز میں بعض اوقات تاخیر ہوتی تو انہیں سخت صدمہ ہوتا۔

مضطرب ہو ہو کر دُعائیں مانگتے اللھم اغفر وارحم وانت الاعز الاکرم۔
اللّٰھم انک عفوٌ تحبُّ العفو فاعف عنی۔ اللّٰھم مغفرتک اوسع من ذنوبی ورحمتک ارجی عندی من عملی۔

ایک دن رات بھر شدت کا درد رہا۔ صبح کے قریب کچھ افاقہ ہوا اور نیند آگئی۔ صبح کی نماز فوت ہوگئی۔ آپ روتے تھے اور بار بار کہتے تھے:

ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطانا۔ ربنا ولا تحمل علینا اصراً کما حملتہ علی الذین من قبلنا۔ ربنا ولا تحملنا مالا طاقۃ لنا بہ واعف عنا واغفرلنا وارحمنا، انت مولانا فانصرنا علی القوم الکفرین۔

مَیں نے کبھی کوئی شکوہ شکایت کی بات اُن کی زبان سے نہیں سنی۔ ہاں جس دن نماز فوت ہوئی، اُس دن کہنے لگے: آہ! یہ زندگی بھی کیا زندگی ہے ——

مَیں شام کے بعد بدن دبانے کے لیے جاتا۔ بدن دبا کر چارپائی سے نیچے اُترتا تو بستر کی شکنیں التزام سے ٹھیک کرتا، مگر وہ احتیاطاً بستر پر ایک نظر ضرور ڈالتے۔ کبھی بستر ٹھیک کرنا بھول جاتا تو مجھے بُلا کر کہتے بستر ٹھیک کرو، ان شکنوں سے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ ان کا کوئی کام کرتا تو جزاک اللہ اکثر کہا کرتے تھے، مگر آخری دو تین دن میں بدن دباتا، بازار سے دوا لاتا، حتیٰ کہ پانی کا ایک گلاس بھی لاتا تو فرماتے: جزاکم اللہ احسن الجزاء —— والحمد للہِ علی ذالک حمداً کثیراً۔

بہ بدمستی سزد گر متہم سازد مرا ساقی
ہنوز از بادۂ دوشینہ ام پیمانہ بو دارد

آخری دن

آخری دن طبیعت میں بڑی تازگی اور بشاشت تھی۔ صبح کی نماز باجماعت پڑھی۔ کچھ دنوں

سے صبح کا وظیفہ چھوٹا ہوا تھا۔ وظیفہ پڑھا۔ خلافِ معمول ناشتہ سیر ہو کر کیا۔ اتنے میں میری ہمشیرہ نے ملین روڈ سے ٹیلیفون پر حال پوچھا۔ فون پر کہنے لگے۔ اللہ کا شکر ہے طبیعت اچھّی ہے۔ رات نیند ٹھیک آئی۔ صبح ناشتہ کرنے کو جی چاہا۔ طبیعت بحمد اللہ پہلے سے بہتر رہی ہے۔ تم کراچی جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔

اُنہوں نے رسیور رکھّا ہی تھا کہ دل کا شدید دورہ پڑا۔ اس دَورے کی مدّت دو چار لمحوں سے زیادہ نہ تھی۔ مَیں کالج جانے کی تیّاری کر رہا تھا۔ غُسل خانے سے نِکلا تو کسی نے بتایا: مولانا صاحب کی طبیعت بہت خراب ہے، جلد جاؤ۔ مَیں بھاگ کر پہنچا اور کئی منٹ اُن کی نبض ڈھونڈتا رہا...... مگر وہ رُخصت ہو چکے تھے۔

اُس رفیقِ اعلیٰ کے پیامی ۱۶ر دسمبر کو پیر کے دن ٹھیک ۹½ بجے صُبح آئے۔ رُوح نے قفسِ عنصری سے اس تیزی کے ساتھ پرواز کی گویا اللہ کے بلاوے کے انتظار میں پابہ رکاب تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی وفات پیر کے دن چاشت کے وقت ہی ہوئی تھی اِس مُبارک وقت میں اس جہان سے رُخصت ہونے کی سعادت جو حضرت والد علیہ الرحمہ کے حِصّے میں آئی یہ اتباعِ سُنّت اور تاسّی باسُوۂ رسولؐ کی بدولت تھی۔ ان کے چہرے پر ایک طمانیت اور سکُون تھا۔ یُوں محسوس ہوتا تھا جیسے دنیا کے جھنجٹوں اور جنجالوں سے چھُوٹ کر وہ بہت خوش ہیں۔

جنازہ اگلے روز ½ ۹ بجے اُٹھایا گیا..... ہزاروں انسانوں کا ہجوم..... ایک کہرام بپا تھا۔ چارپائی کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھے گئے۔ شیدائی کندھا دینے کے لیے چارپائی کی طرف یوں لپکتے تھے، جیسے پتنگے شمع دان پر گرتے ہیں۔ جنازہ یونیورسٹی گراؤنڈ پہنچا، تو وہاں بھی آدمیوں کا ایک ہجوم منتظر تھا۔

برادرِ محترم سیّد عمر فاروق غزنوی اور میری خواہش کے مطابق نمازِ جنازہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ نے پڑھائی۔ مَیں نے سلام پھیر کر مقتدیوں پر نظر ڈالی۔ آدمیوں کا بے پناہ ہجوم

دیکھ کر امام احمدؒ بن حنبل کا مقولہ یاد آگیا۔

الفرق بیننا وبین اھل البدع یوم الجنائز

سیّدنا حضرت عبداللہ غزنوی علیہ الرحمہ کے جنازے کا حال حضرت امام عبدالجبّار غزنویؒ نے لکھا ہے:

"برجنازہ اوشاں آں چناں اژدھام بُود کہ از کثرتِ مردماں اسواق مسدُود شُد موافق ومخالف زیر جنازہ اش میدوید نوبت برداشت آں بریسانِ شہر نمی آمد۔ زخمہ کہ دردست رسانیدن بہ نعش مبارکش دیدہ شُد کم از زخمہ برحجرِ اسود نبود در بسیارہ از بلادِ ہند وپنجاب وپشاور نماز غائبانہ بروے خواندہ شُد۔" مخطوطہ صہ ۲۹

حضرت امام عبدالجبارؒ کے جنازہ پر بھی اژدھام کا یہی عالم تھا۔ حضرت امام عبُداللہ غزنویؒ اور حضرت امام عبدالجبار غزنویؒ کے جنازہ کا جو حال ہم نے پڑھا اور سُنا تھا، حضرت والد علیہ الرحمہ کا جنازہ دیکھ کر اسکا ایک ایک نقش ذہن میں تازہ ہوگیا۔ ے

وجلا السیول من الطلول کانّھا
زبر تجد متونھا اقلامھا

فنعم السلف ونعم الخلف ولہ نسب الفت الشمس علیہ رداءھا ولہ حسب ارخت النجوم لدیہ اضواءھا۔

(خلف سے مراد خود حضرت والد علیہ الرحمہ ہیں)

جنازہ میانی صاحب کے قبرستان لے جایا گیا۔ میں شروع سے آخر تک چارپائی کے ایک پائے سے چمٹا رہا اور جی بار بار کہتا تھا۔

یا ابت ماخدمناک حق خدمتک وما ادینا واجبانا کما کان ینبغی لنا ان نؤدیھا۔

جب ان کا جسدِ مبارک لحد میں اُتار رہے تھے، یقین نہیں آتا تھا یہ وہی زندہ اور سرگرمِ عمل انسان ہے جو یوں بے حس و حرکت ہو گیا ہے۔

ماکنت احسب قبل دفنک فی الثریٰ
ان الکواکب فی التراب تغور
ماکنت آمل قبل نعشک ان اریٰ
رضویٰ علی ایدی الرجال تسیر

(تیرے دفن سے پہلے مجھے گمان نہ تھا کہ چمکتے ہوئے تارے بھی مٹی میں مل جاتے ہیں۔ تیرا جنازہ اُٹھنے سے پہلے مجھے خیال نہ تھا کہ رضویٰ پہاڑ آدمیوں کے ہاتھوں پر چلے گا)

مَیں قبرستان سے لوٹا تو اُن کی وہ پچھلی رات رو رو کر دعائیں مانگنے کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔

یا باسط الیدین بالرحمہ!
یا واسع المغفرۃ! مغفرتک اوسع من ذنوبنا

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا فقیر بہت بڑی بارگاہ میں گڑگڑا رہا ہے۔ ان کی وہ آواز میرے سامعہ سے آج بھی پیہم ٹکرا رہی ہے "رب توفنی مسلماً والحقنی بالصالحین۔ ربِّ ھب لی من لدنک ولیاً یرثنی ویرث من آلِ عبداللہ"۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا تیرے بعد

اخلاق و عادات

عِلمی شغف

ذوقِ عبادت

عملیات

حقوق العباد

مروّت اور رواداری

حق گوئی و بے باکی

نفاست اور شائستگی

علمی شغف

سیاسی ہنگاموں کے ساتھ علمی مشاغل کو جاری رکھنا بہت مُشکل ہے لیکن مَیں نے دیکھا کہ سیاسی ہنگاموں اور جماعتی کاموں سے جب بھی اُنہیں فراغت میسّر آتی، وہ مطالعے میں محو ہو جاتے ـــ گھنٹوں مطالعے میں ڈوبے رہتے۔ ہاتھ میں سُرخ پنسل ہوتی تھی۔ اہم باتوں پر التزام سے نشان لگاتے۔ حاشیے پر نوٹ لکھتے اور حوالے ضبط کرتے۔

علمی مَسائل پر کبھی کبھی گھنٹوں ان سے گفتگو رہتی۔ بات مرتّب اور مربوط کرتے تھے۔ حشو و زوائد سے ان کی گفتگو پاک ہوتی تھی۔ الفاظ کے چناؤ میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔ کوئی اُلجھی ہوئی بات کرتا یا غیر موزوں لفظ بولتا تو انہیں سخت گراں گزرتا۔

فقہ اور تصوّف کے بارے میں اُن کا موقف بہت منجھا ہوا تھا۔ فقہائے کرام کی خدمات کا اعتراف کرتے تھے اور اُن کا نام ادب سے لیتے تھے۔ تمام سلاسل کے مشائخ کا ذکر عقیدت اور محبت سے کرتے تھے اور اُن کی شان میں گستاخی موجبِ حرماں سمجھتے تھے اور کبھی فرماتے۔

"اہل اللہ کی شان میں گُستاخی سدّہٗ مجاریٔ فیض ہے۔"

تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ تصوّف کی کتابوں پر بھی خوب نظر تھی۔ رسالۂ قشیریہ، التعرّف لمذہب اہل التصوف، کیمیائے سعادت، احیائے علوم، مثنوی مولانا روم، کشف المحجوب، مکتوباتِ حضرتِ مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، ان سب کتابوں کا مطالعہ

بالاستیعاب کیا تھا۔ حضرت مجدّد صاحب علیہ الرحمہ سے انہیں خاص عقیدت تھی۔ آخری بار قید کا زمانہ مکتوبات ہی کے مطالعہ میں بسر ہُوا۔ فرماتے تھے:

"تصوّف میں میرے امام شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔"

ایک دن یہ بھی فرمایا:

"شریعت کا وہ حِصّہ جو تزکیۂ باطن سے متعلق ہے۔ اصطلاحاً تصوّف کہلاتا ہے۔ شریعت سے ہٹ کر کسی تصوّف کا مَیں قائل نہیں ہوں۔"

حلول، اتحاد، وحدت الوجود اور وحدت الشہود میں فرق خوب مزے لے لے کر بیان کرتے تھے۔ وحدت الوجود کے خلاف تھے اور شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ سے انہیں طبعی مناسبت نہ تھی۔

ذوقِ عبادت

اُن کی شخصیت کے بعض پہلو جو مجھے عزیز تھے، ذکر کرتا ہوں: ذکرِ الٰہی بڑی کثرت سے کرتے تھے۔ رات دو تین بجے اُٹھ کھڑے ہوتے اور مسلسل چار پانچ گھنٹے عبادت میں مشغول رہتے۔ تہجد زندگی بھر باقاعدگی سے ادا کرتے رہے۔ تہجّد کی نماز میں بہت روتے تھے۔ اُن کے رونے کی آواز گھر والوں کو جگا دیتی تھی۔ روتے روتے اُن کی ہچکی بندھ جاتی۔ یوں معلوم ہوتا کہ کہیں چکّی چل رہی ہے یا ہنڈیا اُبل رہی ہے بعض اوقات مصروفیتوں کا ہجوم ہوتا اور رات دیر تک جاگتے رہتے مگر ذوقِ عبادت اس قدر پُختہ ہو چکا تھا اور شب خیزی کی عادت ایسی راسخ ہو چکی تھی کہ رات کے پچھلے پہر اُٹھ بیٹھتے۔ شام کی نماز کے بعد بھی بہت دیر تک ذکر میں مشغول رہتے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے:

"رات میں لا الٰہ الا اللہ کا ذکر کرتا تھا، تو میرے مُنہ سے نُور نکلتا تھا۔ عجیب کیفیت تھی۔"

ایک دن اپنی بعض پریشانیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ یکایک اُن کے چہرے پر

بشاشت آگئی اور مسکراتے ہوئے کہنے لگے:

"ابوبکر! ذکر کرتے وقت تو میں بادشاہ ہوتا ہوں۔ مجھے کوئی غم نہیں ہوتا"

صبح کے معمولات میں یہ ورد التزام سے پڑھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ یہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ورد تھا:

(۱) "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ خَیْرِ الْاَسْمَاءِ، بِسْمِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اِسْمِہٖ اَذًی۔ بِسْمِ اللّٰہِ الْکَافِیْ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الْمُعَافِیْ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اِسْمِہٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ، بِسْمِ اللّٰہِ عَلٰی نَفْسِیْ وَدِیْنِیْ، بِسْمِ اللّٰہِ عَلٰی اَھْلِیْ وَمَالِیْ، بِسْمِ اللّٰہِ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ اَعْطَانِیْہِ رَبِّیْ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِمَّا اَخَافُ وَاَحْذَرُ، اَللّٰہُ اَللّٰہُ رَبِّیْ لَا اُشْرِکُ بِہٖ شَیْئًا۔ عَزَّ جَارُکَ وَجَلَّ ثَنَاءُکَ وَتَقَدَّسَتْ اَسْمَاءُکَ وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ، اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ کُلِّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ وَشَیْطَانٍ مَّرِیْدٍ وَمِنْ شَرِّ قَضَاءِ السُّوْءِ، وَمِنْ شَرِّ کُلِّ دَابَّۃٍ اَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِیَتِہَا اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (تین بار)

(۲) شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ، اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ وَاَنَا اَشْھَدُ بِمَا شَھِدَ اللّٰہُ بِہٖ وَاَسْتَوْدِعُ اللّٰہَ ھٰذِہِ الشَّھَادَۃَ وَھِیَ وَدِیْعَۃٌ لِّیْ عِنْدَہٗ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ، اَللّٰھُمَّ اَعُوْذُ بِنُوْرِ قُدْسِکَ وَعَظِیْمِ رُکْنِکَ وَعَظَمَۃِ طَھَارَتِکَ مِنْ کُلِّ آفَۃٍ وَعَاھَۃٍ وَمِنْ کُلِّ طَوَارِقِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ اِلَّا طَارِقًا یَطْرُقُ بِخَیْرٍ یَا اللّٰہِ، اَللّٰھُمَّ اَنْتَ غِیَاثِیْ بِکَ اَسْتَغِیْثُ وَاَنْتَ مَلَاذِیْ بِکَ اَلُوْذُ وَاَنْتَ عِیَاذِیْ بِکَ اَعُوْذُ، یَا مَنْ ذَلَّتْ لَہٗ رِقَابُ الْجَبَابِرَۃِ وَخَضَعَتْ لَہٗ اَعْنَاقُ الْفَرَاعِنَۃِ، اَعُوْذُبِکَ

من كشفِ سترِكَ وَ نسيانِ ذكرِكَ والانصرافِ عن شكرِكَ، انا في حرزِكَ ليلي و نهاري و نومي و قراري و ظعني و اسفاري و حياتي و مماتي، ذكرُكَ شعاري وثناءُكَ دثاري، لا الٰه الّا انتَ سبحانكَ و بحمدكَ تشريفاً لعظمتكَ و تكريماً لنفحات وجهكَ اجرني من خزيكَ و من شرّ عبادكَ واضرب سرادقاتِ حفظكَ عليّ وادخلني في حفظِ عنايتكَ وجُد عليّ بخيرٍ يا ارحمَ الرّاحمين وصلى اللّٰه على النّبيّ وآله۔"

اس ورد کے بعض حصے آہستہ آہستہ پڑھتے ہوئے بے ساختہ اُن کی آواز بلند ہو جاتی تھی۔ یہ جملے اونچی آواز سے کہتے تھے:

"اللّٰھمّ انت غیاثی بکَ استغیثُ وَ انتَ ملاذی بِکَ الوذُ وانتَ عیاذی بکَ اعوذُ، یامنْ ذلّتْ له رقابُ الجبابرة وخضعتْ له اعناقُ الفراعِنة۔"

(اے اللہ! میرا مددگار تُو ہے۔ مَیں تجھ ہی سے مدد چاہتا ہوں، میرا ملجا و ماوٰی تُو ہی ہے، مَیں تیری پناہ میں آتا ہوں ——— اے وہ کہ جابر بادشاہوں کی گردنیں اُس کے سامنے خم ہیں اور فرعونوں کے سر اُس کے سامنے جُھکے ہوئے ہیں۔)

عملیات

ایک زمانے میں اُنہیں تعویذات، عملیات اور طبّی نسخے اکٹھے کرنے کا بھی شوق رہا۔ اُن کی ایک بیاض میرے پاس ہے جس کے پہلے صفحے پر "مجرّبات و معمولاتِ فقیرِ بارگاہِ صمدی محمد داؤد غزنوی" لکھا ہے اس میں ایک طرف اپنے قلم سے مختلف بزرگوں سے حاصل کیے ہُوئے تعویذات اور مجرّب عمل لکھے ہیں اور دُوسری طرف طبّی نسخے درج ہیں۔ حافظ محمد لکھویؒ کے بہت سے مجرّبات اس بیاض میں موجود ہیں۔ اُن کے علاوہ مندرجہ ذیل بزرگوں کے مجرّبات نقل

کیے گئے ہیں :

مولانا غلام رسول صاحبؒ قلعہ والے، مولوی محمد سلیمان صاحبؒ مرید حضرت الامام عبدالجبّار غزنویؒ، مولانا احمد غزالیؒ مہاجر مکیؒ، مولانا عبداللہ شاہ غزنوی ثم افریقی مرحوم، مولانا حسین علی صاحب۔ دوسری طرف مختلف مستند اطبّا سے حاصل کیے ہوئے طبّی نسخے درج کیے گئے ہیں کئی قسم کے سفوف اور معجونیں بنانے کی ترکیبیں لکھی ہیں۔ منجن اور سُرمہ بنانے کے کئی طریقے لکھے ہیں۔ بیاض کے اس حصّے میں زنگارنگ نسخے درج ہیں۔ چند نسخہ جات کے عنوانات ملاحظہ فرمایئے۔

سرمۂ مروارید ناسفتہ از مجرّباتِ حکیم نُورالدین بھیروی۔ سفوف مقوّی معدہ و مصلحِ جگر، مجرّب بدرجہ غایت مفید از ڈاکٹر حکیم غلام احمد صاحب حیدرآبادی نزیل مدینۂ منوّرہ۔ ضیق النّفس (دمہ) کا سنیاسی نسخہ (منشی عباداللہ امرتسری کا عطیّہ) روغن دافع دردِ سر و مقوّی دماغ از مولانا عبدالتوّاب صاحب غزنوی نزیل علی گڑھ۔ تقویتِ قلب کے لیے ماخوذ از عطاء الرحمٰن دہلوی سابق اسیر فرنگ، میانوالی جیل۔

حقوق العباد

اللہ کے حقوق تو وہ التزام سے ادا کرتے تھے، بندوں کے حقوق بھی وہ مستعدی سے ادا کرتے تھے۔ آخری بیماری میں بھی جب تک اُن میں سکت تھی، عیادت کے لیے جاتے رہے، تعزیت کرتے رہے۔ نمازِ جنازہ پڑھتے اور پڑھاتے رہے۔ اُن کی ۱۹۶۲ء کی ڈائری کے چند اقتباس نقل کرتا ہوں جن کی روشنی میں اُن کی شخصیّت کے اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۲ر جنوری حافظ اسماعیل روپڑی کی وفات۔

"حافظ اسماعیل صاحب روپڑی بروز جمعہ صبح پونے نو بجے وفات پا گئے۔ اِنّا لِلّٰہ واِنّا الیہِ راجعون۔"

۱۳ر جنوری: "حافظ عبداللہ صاحب روپڑی کے ہاں ماڈل ٹاؤن میں تعزیت

کے لیے گیا۔ میرے ہمراہ حافظ عبدالرشید صاحب گوہڑوی اور محمد عمر خادم تھے۔"

۱۵؍جنوری۔ "شوکت عظیم یعنی شیخ عظیم اللہ کے لڑکے اپنی موٹر کے حادثے میں وفات پا گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ شوکت صاحب شیخ محمد یوسف کے داماد تھے اور شادی ۲۹ دسمبر ۱۹۶۱ء کو ہوئی تھی۔ جنازہ میں شرکت کی غرض سے گیا۔ میت کے وارثوں نے نماز جنازہ پڑھانے کو کہا۔ نماز جنازہ بالجہر پڑھائی۔"

۱۶۔جنوری۔ علامہ حسین میر علیہ الرحمہ کی وفات۔

"علامہ حسین میر صاحب آج صبح وفات پا گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ جنازہ میں شریک ہوا۔ جنازہ مولوی حکیم ہدایت اللہ نے پڑھایا۔ حسبِ وصیت علامہ صاحب، جنازے کو کندھا دیا۔ دردِ دل کا دورہ شروع ہو گیا۔ تھوڑی دیر ٹھہر گیا ... رات بھر بالخصوص آخری حصۂ شب میں دردِ دل کی تکلیف بہت زیادہ رہی۔"

۲۴۔ فروری کو مولانا احمد علی صاحب علیہ الرحمہ کی نماز جنازہ میں شرکت کی۔"

"افسوس کہ آج رات ½ ۹ بجے مولانا احمد علی صاحب کئی سال فالج کی علالت کے بعد حرکت قلب بند ہونے سے انتقال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ نمازِ جنازہ کا تین بجے یونیورسٹی گراؤنڈ میں اعلان تھا۔ پہلے ان کی مسجد شیرانوالہ دروازہ میں گیا۔ پھر یونیورسٹی گراؤنڈ میں نماز جنازہ کے لیے گیا۔ جنازہ سے پہلے وہاں بہت زیادہ خلقت جمع تھی۔ جنازہ کے ساتھ اور بے شمار لوگ آ گئے ... نماز جنازہ سے فارغ ہو کر واپس مکان آیا۔ بہت تھک گیا تھا۔ الحمدللہ دردِ دل کی تکلیف نہیں ہوئی۔"

۲۵۔ فروری۔ حمید نظامی مرحوم کی وفات پر اظہارِ غم

"افسوس، آج گیارہ بج کر پچاس منٹ پر حمید نظامی صاحب مدیر "نوائے وقت" دل کے شدید عارضے کی وجہ سے فوت ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ۲۳۔فروری کو شدید حملہ ہوا۔ مقامی ڈاکٹروں کا بورڈ علاج کے لیے حاضر تھا۔ کراچی کے مشہور ڈاکٹر ماہر امراضِ قلب

ڈاکٹر اے۔ آر۔ کھمباٹا کو ہوائی جہاز سے بلایا گیا، مگر سب کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ اللہ کا حکم آپہنچا تھا۔ حیات و موت کی شدید کشمکش کے بعد ۲۵ فروری کو جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی ــــ اَللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وادخلہ فی عبادک الصالحین۔"

۲۶۔ فروری۔ "آج ۲۶۔ فروری کو ۱۰ بجے نماز جنازہ میں شرکت کے لیے یونیورسٹی گراؤنڈ میں گیا۔ مولانا احمد علی صاحب کی وفات اور کل حمید نظامی صاحب کی وفات سے جو صدمہ ہوا ہے، اس کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا۔"

مروّت اور رواداری

دوست دشمن سب کے ساتھ مروّت سے پیش آتے۔ وہ لوگ جنہوں نے زندگی بھر انہیں ایذا دی اور اُن سے بغض و عناد رکھا، اُن کے ساتھ بھی تپاک سے ملتے۔ انہیں علم ہوتا تھا کہ یہ شخص میری غیر حاضری میں مجھے گالیاں دیتا ہے لیکن شائستگی کے اس معیار سے جو انہوں نے اپنے لیے ٹھہرالیا تھا، وہ نیچے اُترنے کے لیے تیّار نہ ہوتے تھے۔ ان لوگوں کی عدم موجودگی میں بھی کوئی ناشائستہ لفظ اُن کے بارے میں مُنہ سے نہ نکالتے تھے۔

ترا کے میسّر شود ایں مقام که با دوستانت خلاف ست و جنگ

(تمہیں یہ مقام کیونکر میسّر ہو سکتا ہے کہ تم تو اپنے دوستوں کے ساتھ ہی ہاتھا پائی کر رہے ہو)

وہ ایک متعیّن اور واضح مسلک رکھتے تھے اور زندگی بھر پُورے یقین اور اذعان کے ساتھ اس مسلک کا پرچار کرتے رہے، مگر دُوسروں کے عقائد و افکار کی تضحیک نہیں کرتے تھے۔ تمام جماعتوں کے زُعماء کے ساتھ عزّت و احترام کے ساتھ پیش آتے۔

حق گوئی و بیباکی

اگر کسی بات کو حق سمجھتے اور پُورا ملک بھی اگر اس کے خلاف ہوتا تو ڈنکے کی چوٹ برملا اس بات کو بیان کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک عید کے موقع پر منٹو پارک کے میدان میں تقریر کے دوران حریفوں نے ہلّڑ مچایا اور اُن پر پتّھر پھینکے۔ سنگ باری نے اُن کی قوّتِ بیانیہ پر مہمیز کا کام دیا۔ اُن

کی خطابت کا زور اور روانی تیز تر ہو گئی۔ پتھر اُن کے سر کے پاس سے گزر رہے تھے مگر اُن کے اعصاب اس قدر مضبوط تھے کہ خوف و ہراس کی کوئی ہلکی سی چھینٹ بھی اُس وقت اُن کے دامنِ صبر و وقار پر نظر نہ آتی تھی۔

نفاست اور شائستگی

طبیعت میں نفاست بہت تھی۔ بد تہذیبی اور شائستگی سے اُن کی طبیعت مکدّر بہت ہوتی تھی۔ کپڑا ہمیشہ نفیس پہنتے۔ کتاب کی جلد نفیس بندھواتے، قلم نفیس خریدتے۔ ان کی کتابوں پر کبھی کوئی داغ دھبّا مَیں نے نہیں دیکھا۔ لباس ہمیشہ اُجلا پہنتے تھے مَیں نے اُن کے کپڑوں پر کبھی مَیل نہیں دیکھی۔ سلیقہ اُن کے خمیر میں گندھا ہُوا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی ہر چیز بڑے قرینے سے متعیّن جگہ پر رکھتے تھے۔ کسی چیز کو اس کی اصل جگہ سے کوئی ہٹا دیتا تو کمرے میں داخل ہوتے ہی پُوچھتے:

"میرے کمرے میں کون آیا تھا؟ یہ چیز کس نے چھیڑی ہے؟"

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "ارواحِ ثلاثہ" جو بزرگوں کے حالات پر مشتمل ہے، کے حاشیے پر جگہ جگہ اُنھوں نے اپنے قلم سے نوٹ لکھے ہیں۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں مندرجہ ذیل حکایت لکھی ہے:

"بے قاعدہ رکھّی ہُوئی چیز دیکھ کر مرزا صاحب کے سَر میں درد ہونے لگتا تھا۔ ایک دن بہادر شاہ بہت الحاح و التجا کے بعد اجازت حضوری ملنے پر زیارت کے لیے حاضر ہُوا۔ موسم تھا گرمی کا، بادشاہ کو پیاس لگی اور پانی طلب کیا۔ حضرت نے فرمایا 'وہ گھڑا رکھا ہُوا ہے' پیالہ میں لے کر پانی پیو۔ بادشاہ نے پانی پیا اور پیالہ گھڑے پر رکھ دیا۔ مرزا صاحب کی نظر جو گھڑے پر پڑی، تو پیالہ ذرا ترچھا دھرا ہوا تھا۔ دیر تک ترچھی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ آخر ضبط نہ ہو سکا۔ فرمایا:

جناب آپ بادشاہت کیا کرتے ہوں گے، ابھی تک خدمت گاری تو آئی ہی نہیں

دیکھو تو گھڑے پر پیالہ رکھنے کا یہی طور ہے"۔[1]

حضرت نے اس حکایت کے حاشیے پر اپنے قلم سے لکھا ہے :

" اس عاجز کی بھی یہی حالت ہے۔

داؤد غزنوی"

مرزا جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کی لطافتِ طبع کے بہت سے قصے "ارواحِ ثلاثہ" میں درج کیے گئے ہیں۔ ایک اور حکایت کے حاشیے پر حضرتؒ لکھتے ہیں :

" اس عاجز کو حضرت مرزا صاحب سے بعض احوال واذواق میں مناسبت ہے"[2]

حضرت مرزا صاحبؒ کے حالات میں یہ بھی مندرج ہے :

" حضرت مرزا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا امتحان اور مجاہدہ سب اسی نفاست ونزاکت طبع میں تھا۔ ایک عورت تھی نہایت بدمزاج، کج خلق، منہ پھٹ۔ حضرت مرزا صاحبؒ کو الہام ہوا کہ اگر اس عورت سے نکاح کرو اور اس کی بدزبانی وایذا دہی پر صبر کرو گے تو تم کو نواز لیا جائیگا۔ حضرت نے فوراً پیام بھیجدیا اور اُس سے نکاح کر لیا۔ وہ عورت اس درجہ تند خو، بدخصلت، سخت دل اور فحش گو تھی کہ الاماں۔ حضرت مرزا صاحبؒ خوشی خوشی دولت خانہ پر تشریف لے جاتے اور وہ بڑی بڑی سنانی شروع کرتی۔ چپکے بیٹھے سُنتے رہتے، زبان سے اُف نہ نکالتے۔ اندر گھولتے آخر واپس تشریف لے آتے تھے۔ آپ کا معمول تھا کہ روزانہ صبح ہوتے ہی خادم کو حکم فرماتے کہ جاؤ دروازہ پر حاضر ہو کر میرا سلام عرض کرو اور پوچھو کوئی کارِ خدمت ہو تو انجام دیا جائے"۔

اس پر حضرت نے لکھا ہے : "یہ مقام اس عاجز کو کہاں نصیب ہے۔ داؤد غزنوی"[3]

آدابِ مجلس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ کوئی چائے پیتے وقت زور زور سے چسکیاں لیتا یا روٹی کھاتے وقت آواز نکالتا تو انہیں ناگوار ہوتا تھا۔

---

[1] ارواحِ ثلاثہ صہ ۱۸ [2] ایضاً صہ ۱۷ [3] ایضاً حاشیہ صہ ۲۵

اندازِ خطابت

خطبۂ صدارت کل مغربی پاکستان اہلحدیث کانفرنس، سرگودھا
یاد رفتگان
مقصد
سب سے بڑا فتنہ فرنگی مُلّا
فرنگی مُلّا کی خطرناک چال
اسلامی معاشرے کی تشکیل
کاشانۂ نبوّت کے فیض یافتگان
مافوق العادۃ نظام
حفظِ حدیث کے عوامل
حدیث کے زندہ نسخے
جابرؓ بن عبداللہ
ابوایوب انصاریؓ
ایک عاشقِ حدیث صحابی
عمرؓ بن الخطاب

جوانی میں شعلہ نوا خطیب تھے۔ انگریز کے خلاف تقریروں میں آگ برساتے رہے۔ آواز میں گھن گرج تھی۔ سراپا یقین اور اذعان بن کر سامعین کے دلوں میں اُتر جاتے تھے۔ تقریر مرتّب اور مربُوط کرتے تھے۔ الفاظ کے چناؤ میں احتیاط برتتے تھے اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے موزوں ترین الفاظ چنتے تھے۔ تقریر متانت اور سنجیدگی سے کرتے تھے۔ تقریر کے دوران ہنسی مذاق کو وقار کے منافی سمجھتے تھے۔ جوانی میں جذباتیت علمیّت پر غالب ہوتی تھی، لیکن جوں جوں عُمر گزرتی گئی، علمیّت جذباتیت پر غالب آتی گئی ہم یہاں اُنکے آخری دَور کی ایک تقریر کا معتدبہ حصّہ نقل کرتے ہیں تاکہ قارئین اُن کے اندازِ خطابت سے لُطف اندوز ہوسکیں۔

خُطبۂ صدارت [۱]

کُل مغربی پاکستان اہل حدیث کانفرنس سرگودھا

منعقدہ ۱۴، ۱۵، ۱۶ مارچ ۱۹۵۸ء

معزز حاضرین! مرکزی جمعیتِ اہلحدیث مغربی پاکستان کی یہ پانچویں سالانہ کانفرنس ہے جو سرگودھا میں منعقد ہو رہی ہے۔ اس سے پہلے چار سالانہ کانفرنسیں ہو چکی ہیں ان کانفرنسوں کی صدارت کے فرائض جماعت کے مقتدر حضرات سرانجام دیتے رہے۔ میری ہمیشہ خواہش رہی ہے کہ سالانہ کانفرنس کی صدارت جماعت کے برگزیدہ افراد میں سے کوئی صاحب فرمائیں۔ اس طرزِ عمل کے مطابق اس دفعہ مجلسِ عاملہ نے یہ فیصلہ کیا کہ مولانا عبدالعزیز صاحب

---

[۱] "الاعتصام" جلد ۹ شمارے ۳۴ تا ۳۷

میمن پروفیسر کراچی یونیورسٹی سے درخواست کی جائے کہ صدارت کے فرائض سرانجام دیں لیکن انہوں نے اپنی مصروفیتوں کی بنا پر معذرت کا اظہار کیا اور مجلسِ عاملہ کے فیصلہ کے مطابق اس عاجز کو کانفرنس کی صدارت کے بھی فرائض سرانجام دینے پڑے۔ یہ عاجز ۱۹۵۲ء سے عارضۂ قلب میں مُبتلا ہے۔ بے شمار مصروفیتوں اور ذمّہ داریوں کی وجہ سے مجھے ڈاکٹروں کے مشورے کے خلاف اپنی طاقت سے بہت زیادہ کام کرنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے روز بروز میری صحت کمزور ہو رہی ہے۔ میرا نظامِ عصبی کسی وقت اتنا بوجھ محسوس کرتا ہے کہ مَیں کام سے بالکل عاجز ہو جاتا ہوں۔ مَیں نے ہر چند کوشش کی، منّت سماجت کی کہ کانفرنس کی صدارت سے مجھے معاف فرمایا جائے لیکن میری ایک نہ سُنی گئی۔ مجبُوراً اس دلِ ناتواں نے جماعت کی وفاداری کے بندھنوں کی بنا پر اس خدمت کو قبول کر لیا۔

دِل کو مَیں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتارئ ہم ہے ہم کو

یادِ رفتگان

اگرچہ تقسیم کے تیز و تُند آلہ نے برِصغیر کے دو ٹکڑے کر دیئے لیکن رُوحوں کا ملاپ اور قلوب کا اتّصال ناقابلِ انفکاک ہوتا ہے۔ گزشتہ چند ماہ میں مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا حسین احمدؒ جیسی عظیم المرتبت شخصیتوں کا انتقال ملّتِ اسلامیہ کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ اس برِصغیر میں علّامہ جمال الدّین افغانیؒ کے ایک طرح نائب تھے۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللّٰہ علیہ کے شاگرد اور جانشینِ صادق تھے۔ ان حضرات کا نظریہ یہ تھا کہ اسلام اور ملّتِ اسلامیہ کا طاقتور حریف انگریز ہے۔ اس لیے اُنہوں نے اور اُن کے رفقاء نے اپنی ساری قوتیں اس امر کے لیے وقف کر دیں کہ انگریز کو اس مُلک سے نکال دیا جائے۔ یہی وقت کا سب سے بڑا جہاد اور اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے —— اس نظریہ کے تحت اُنہوں نے ہر اُس پتّھر کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی جو انگریز کے اقتدار کے لیے اس مُلک میں

ممدّ و معاون ہو سکتا تھا، ہر اُس بُت کو توڑنے کی کوشش کی جس کی پرستش سے انگریز کا تقرب حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی اور اپنی قوم کی مادّی بے بضاعتی کا خیال نہ کرتے ہوئے عظیم روحانی طاقت سے انگریز کے مقابلہ میں میدانِ جہاد میں اُتر آئے۔ انگریز دنیا کی عظیم ترین طاقت کا مالک تھا اور یہ بزرگ اور اُن کے رُفقا، مادّی طاقت کے لحاظ سے کمزور اور اجتماعی قوّت کے لحاظ سے صفر تھے اور قوم مختلف فرقوں اور گروہوں میں تقسیم تھی، مگر ان حضرات نے اپنی ساری خُداداد صلاحیتّوں کو کام میں لاتے ہوئے اپنی صفوں کو اس طرح منظّم کیا اور ولولۂ جہاد سے اس طرح قوم کے دلوں کو گرمایا کہ وہ قوم جو دُنیا میں سب سے زیادہ ضعیف اور ناتواں سمجھی جاتی تھی۔ اُس نے دُنیا کی سب سے بڑی سلطنت کو شکست دے دی اور اس کو مجبور کر دیا کہ وہ بوریا بستر باندھ کر اس ملک سے چلا جائے اور اس کے بعد وہ دُنیا کی تیسرے درجہ کی طاقت بن کر رہ جائے۔

ان بزرگوں کا وجود اگرچہ پورے برِّصغیر کے لیے ایک نعمتِ عظمیٰ تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تقسیمِ مُلک کے بعد جو حالات ہندوستان میں پیدا ہوئے، ان کو دیکھتے ہوئے ہر ہوشمند انسان یہ رائے رکھتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے اُن کا وجود ایک بیش بہا نعمت اور بہت بڑا سہارا تھا، اس لیے ہم سب ان بزرگوں کے سانحۂ ارتحال کو ملّتِ اسلامیہ کے لیے بہت بڑا صدمہ سمجھتے ہیں۔ ایسی ہستیاں صدیوں میں بھی مشکل سے پیدا ہوتی ہیں:

عُمرہا در کعبہ و بُت خانہ مے نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

ہم سب ان بزرگوں کے لیے دُعاءِ مغفرت کرتے ہیں اور بارگاہِ ربّ العزّت سے التجا کرتے ہیں کہ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ یہ بزرگ اپنی زندگیاں اعلیٰ مقاصد کی راہ میں قربان کر کے ہم سے رُخصت ہو کر اپنے ربِّ عزّ و جل کے پاس جا پہنچے

ہیں۔ ہم بھی رختِ سفر باندھے ہوئے منتظر ہیں کہ اللہ کا قاصد کب آتا ہے:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیّار بیٹھے ہیں

مقصد

حضرات! ہماری کانفرنسوں کے انعقاد کا مقصد کوئی سالانہ میلہ یا کوئی رسمی اجتماع منعقد کرنا نہیں اور نہ صرف چند مواعظ کا سُننا ہے بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ ہم اپنی جماعتی زندگی کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ ہمارا جماعتی قافلہ جن جن منازل سے گزرا ہے، اُسے کن کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا، ہم نے گزشتہ سال کے سفر میں کیا کچھ کھویا اور کیا کچھ پایا؟ غرض پوری تفصیلات سے مطلع ہونا اور سابقہ تجربہ کی بنا پر آئندہ کے لیے واضح پروگرام مرتّب کرنا ہے۔

دوستو! آج ہم بڑے نازک دَور سے گزر رہے ہیں۔ بیسیوں نازک مسائل ہمارے سامنے ہیں۔ اُن میں جماعتی مسائل کے علاوہ سیاسی، معاشی، اقتصادی اور تعلیمی مسائل ہیں، جنہوں نے ملک میں بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کر رکھی ہے۔ معاشرے کی خرابی نے ہماری اخلاقی قدروں کو تباہ کر رکھا ہے۔ غرض بے حد اہم مسائل ملک و ملّت کے سامنے ہیں اور ہم جب تک اپنی منتشر قوتوں کو ایک مرکز پر جمع نہیں کرتے اور اپنے قوائے عمل میں مرکزیت اور تنظیم پیدا نہیں کرتے، ہم نہ جماعتی مشکلات کو حل کر سکیں گے اور نہ مستقبل کے لیے کوئی واضح موقف متعیّن کر سکیں گے۔

تمام علماء کرام، معزز اراکین مرکزی جمعیت اور محترم نمائندگان سے انتہائی دلسوزی کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ زمانہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ مسافت طے کر رہا ہے۔ جو جماعت اپنی سُستی اور کاہلی کے طوق اپنی گردن سے اتار نہیں پھینکے گی اور اپنے ذہن و فکر کے خفتہ گوشوں کو بیدار نہیں کرے گی اور کسی واضح اور متعیّن نصب العین کی طرف قدم زن نہیں ہو گی، زمانہ اُس کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے اپنی رفتار کو نہیں روکے گا اور اس

انتظار میں نہیں رہے گا کہ وہ سست رو جماعت اپنا رختِ سفر باندھے تو اس کو اپنا رفیقِ راہ بنا کر چلے۔

دوستو! میں کس طرح یہ حقیقت آپ کے دلوں میں اُتار دوں کہ یہ دَور سُست روی کا دَور نہیں اور نہ انفرادیت کا دَور ہے، بلکہ یہ دَور ایک متحرک زندگی کا طالب ہے اور اس کے ساتھ یہ اجتماعیت کا دَور ہے۔ یہ اجتماعی کوشش، اجتماعی جدوجہد اور اجتماعی عمل و کردار کا متقاضی ہے۔ یاد رکھو! جن لوگوں کا دامن اجتماعی زندگی کی دولت سے محروم ہوگا، وہ اس دَور کے تیز رو قافلوں کے ساتھ ہرگز نہیں چل سکیں گے اور اس کا نتیجہ اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا کہ وہ زندگی کی آخری رمق سے بھی آہستہ آہستہ محروم ہو جائیں گے۔ جب جماعتی روح سے جماعت کے افراد محروم ہو جاتے ہیں، تو وہ انسانوں کی ایک بھیڑ ہوتی ہے بلکہ انسانوں کے خالی ڈھانچے ہوتے ہیں۔ ان کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے کوئی ان کی طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اور کچھ عرصہ کے بعد وہ دِلوں سے بھی محو ہو جاتے ہیں اور مؤرخ اُن کے لیے صفحاتِ تاریخ میں ایک سطر کے برابر بھی جگہ دینے کو تیّار نہیں ہوتا۔

معزّز حاضرین! مَیں آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ اپنے ملک سے متعلّق کچھ عرض کروں کہ ہم آزاد ہو جانے کے بعد اسلام کے حفظ و بقاء کے لیے کیا کچھ کر چکے ہیں اور تعلیماتِ اسلام کو الحاد پسند طبائع سے بچانے کے لیے کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں؟ مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان جس کی بُنیادی اینٹ اسلام پر رکھی گئی تھی، اس پاکستان میں اسلام کے چہرے کو مسخ کرنے میں بلکہ الحاد و زندقت کو اسلام کا نام دے کر پھیلانے میں فسق و فجور کی وہ راہیں جو تقسیمِ ملک سے پہلے محدود تھیں، اس کو پھیلانے میں ہم نہ صرف یہ کہ کتاب اللہ اور سُنتِ رسول اللہ کو پسِ پشت ڈال کر یہود کی طرح وَنَبَذُوا كِتَابَ اللهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ — کے مصداق بن گئے ہیں بلکہ عام اخلاق و عاداتِ حسنہ، شرم و حیا، عفت و عصمت، صداقت و دیانت، ادب و احترام

غرض شرافت و نجابت کے تمام طور طریقے چھوڑ کر جانوروں کی سی زندگی بسر کرنے لگے ہیں اور اس راہ پر اس طرح بگٹٹ دوڑ رہے ہیں کہ کسی ناصح کی آواز، کسی مشیر کا مشورہ اور کسی دردمند کی پکار سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

سب سے بڑا فتنہ فرنگی مُلّا

اس سلسلہ میں آپ کے سامنے مَیں سب سے بڑا فتنہ پہلے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اُمید ہے آپ غور سے سُنیں گے اور اس فتنہ کے انسداد کے لیے مؤثر تدابیر آپ اپنے اس عظیم الشان اجتماع میں سوچیں گے۔

دوستو! آج ہمارے مُلک میں ایسے مسلمانوں کی کمی نہیں اور حکومت کی سرپرستی کی وجہ سے ایسے مُسلمانوں کی کثرت روز بروز بڑھ رہی ہے جن کی زبانیں مذہب کے خلاف بے لگام ہیں۔ یہ لوگ اسلام کے زیرِ سایہ پروان نہیں چڑھے بلکہ اُنہوں نے غیر اسلامی ماحول میں تربیت پائی ہے اور مستشرقین کے لٹریچر سے اسلام کا مطالعہ کیا اور جو کچھ غیر مُلکی لٹریچر میں پڑھا ہے، اسے اب اسلام کے نام سے پھیلا رہے ہیں۔ یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ان کے انکار کا منبع قرآن و سنّت نہیں بلکہ ان کی ہزلیات و کفریات کا سرچشمہ مستشرقین کی کتابیں ہیں

آپ جانتے ہیں کہ جو شخص اپنی پاک دامنی کھو بیٹھتا ہے وہ لوگوں کے طعن سے بچنے کے لیے دُوسروں کو بھی اس گناہ میں ملوّث دکھا کر اپنے عیب کو ہلکا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی حال یورپ کے مستشرقین کا ہے۔ عیسائی اپنے دین کی بے بضاعتی سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کی کتابیں تورات و انجیل حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے صدیوں بعد مرتّب کی گئیں اور ان میں بھی بارہا تحریف اور تبدّل ہُوا۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ تمام ادیان و مذاہب میں سے صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی تعلیمات محفوظ ہیں۔ قرآن مجید آغازِ نزولِ وحی سے لے کر آج تک اپنی اصلی شکل

میں محفوظ ہے۔ صحیح احادیث کے مجموعے مؤطا امام مالکؒ، صحیح بخاریؒ، صحیح مسلمؒ اور دوسری کُتبِ صحاح محفوظ ہیں۔ محدّثین کرام کی مساعیٔ جمیلہ کی بدولت ضعیف اور موضوع روایات چھانٹ چھانٹ کر الگ کر دی گئیں۔ راویانِ حدیث کے حالات و کوائف مرتّب کرنے کے لیے اسماء الرّجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا گیا جس کی نظیر دُنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی اور جس کی بدولت کئی لاکھ راویوں کے حالات اس تفصیل کے ساتھ درج ہیں ــــــ ان کا نام، ولدیت، سکونت، دیانت، ذہنی قابلیّت، قوّتِ حافظہ، تقویٰ و عام کردار اور کس کس سے علم حاصل کیا اور کس کس کو پڑھایا ــــــ اور یہ صرف اس لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو نبیٔ اکرمؐ کے اقوال و افعال اور تعلقات زندگی کے بیان کرنے والے ہیں۔ جن میں صحابۂ کرام، تابعین، تبع تابعین اور بعد کے چوتھی ہجری تک کے اشخاص داخل ہیں۔ یورپ کے سامراجیوں نے اپنے دُنیوی اقتدار کو سامنے رکھتے ہوئے جب اپنی مذہبی کتابوں کو اسلام کی مذہبی کتابوں کے مقابلے میں دیکھا تو انہیں بڑی مایوسی ہوئی۔ بجائے اس کے کہ وہ اسلام کی اس برتری سے متاثر ہوتے، انہوں نے قرآن مجید اور کُتبِ حدیث کو حاسدانہ نگاہوں سے دیکھا اور محض بغض و حسد سے اس کے درپے ہو گئے کہ قرآن مجید اور پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کے مکمل نقوش کس طرح متغیّر کیے جائیں تا کہ اس حمامِ عالم میں سبھی ننگے نظر آئیں اور اس طرح دُنیوی سربلندی کے ساتھ دینی اُمور میں بھی علم برداری کا مقام انہیں حاصل ہو۔

وہ قوم جو تاریخ کے پُرانے کتبے کھنڈروں سے تلاش کر کے فخر کرتی ہے کہ ہم نے نوعِ انسانی کی مدفون تاریخ کو زندہ کیا ہے۔ افسوس کہ وہ اس پر فخر نہ کر سکی کہ انسان کی نوعی میراث میں ایک اور صرف ایک الہامی کتاب ایسی موجود ہے جو تغیّراتِ زمانہ سے اب تک محفوظ ہے ــــــ پیغمبرِ خداؐ کی زندگی کا مکمّل ریکارڈ ڈیڑھ ہزار سال گزر جانے کے باوجود کتابی شکل میں موجود ہے ــــــ علم ہاں علمِ انسانیت کی سب سے بڑی میراث ہے۔ یورپ کے مدعیانِ علم کو خوش ہونا چاہیے تھا کہ انسانیت کی اس سب سے بڑی میراث

کو مُسلمانوں کی کوششوں سے حیاتِ جاوید حاصل ہوئی مگر افسوس! ضد، تعصّب اور حسد نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور عظمتِ انسانی کے اس بے بہا جوہر کے دیکھنے سے محروم ہو گئے۔

لیکن ان مغرب پرست مُسلمانوں کو کون سمجھائے، جو غلامانہ ذہنیت میں مبتلا ہو کر عزّتِ نفس کے احساسات سے ناآشنا ہو کر اس نعمت کے قبول کرنے سے انکار کر رہے ہیں، جو نہ صرف اسلام کی رفعت اور عظمت کی دلیل ہے بلکہ خود انسانیت کے لیے موجبِ فخر و مباہات ہے یہ مستشرقین کی میز سے گرے ہُوئے ٹکڑے کھانے والے مُسلمان! یہ کعبۂ یورپ کے شوق میں لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ شیدائے مغرب ہونے کے بعد یہ بدقسمت مُسلمان مشرقیت سے محروم ہو ہی گئے مگر اہلِ مغرب میں بھی اُنہیں کوئی مقام نہیں ملا۔ یہ گھر اور گھاٹ کے درمیان روایتی کُتّے کی طرح چکّر لگا رہے ہیں۔

فرنگی مُلّا کی خطرناک چال

ان مغرب پرست مُسلمانوں نے اپنے آقاؤں کو دیکھا کہ انجیل ترجموں سے پڑھی جاتی ہے، اس لیے کہ اصل انجیل (اورجنل ٹیکسٹ) ناپید ہے۔ یہ بھی اپنے آقاؤں کی نقّالی میں قرآن مجید کو انگریزی یا اُردو کے تراجم سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور بزعمِ خود اس امر کے مدّعی ہیں کہ قرآن فہمی کا حق ادا ہو گیا۔ اگر ترجموں کا سہارا اتنا کامیاب ہوتا تو بلادِ عرب کے تمام باشندے علماء و فضلاء ہوتے کیونکہ وہ عربی زبان سے آشنا ہی نہیں بلکہ عربی ان کی مادری زبان ہے اور انگلستان، جرمنی، فرانس اور امریکہ کا ہر فرد ڈاکٹر، فلسفی اور سائنسدان ہوتا کیونکہ ان کے ہاں ان کی مادری زبانوں میں یہ علوم پڑھائے جاتے ہیں لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے نہ تو ہر عرب عالمِ قرآن و سُنّت ہے اور نہ ہر انگریز سائنسدان اور فلسفی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان دانی اور فن دانی دو بالکل جُدا چیزیں ہیں۔ فن دانی کیلئے زبان دانی بُنیادی شرط ہے لیکن محض زبان دانی سے فن دانی نہیں ہوتی۔

عربی زبان میں مہارت حاصل کیے بغیر بعض نادان قرآنِ مجید کے اُردو، انگریزی تراجم پڑھ کر علومِ اسلامیہ کی مہارت کے مُدّعی ہیں اور بزعمِ خود یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم نے جس طرح قرآن کو سمجھا ہے، وہی صحیح ہے۔ اسے ہماری اصطلاح میں جہل مرکّب کہتے ہیں۔ یہ لوگ کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں انگریزی اقتدار کی خیرات سے کچھ عہدے اور اچھی تنخواہیں میّسر آگئی ہیں۔ ان کی تربیت —— سرکارِ برطانیہ کے ظلِّ عاطفت میں ہوئی تھی اور غلامانہ ذہنیت لے کر جوان ہُوئے۔ ان کی تعلیم کا معیار اور حصُولِ تعلیم کی غرض و غایت اس کے سوا اور کچُھ نہ تھی کہ وہ انگریزی کی اُونچی ڈگریاں حاصل کر کے ذمہ دارانہ غلامی کی جگہیں (اسامیاں) حاصل کر سکیں۔ ان بے چاروں کو علومِ کتاب وسُنت کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔ اب بدلتے ہُوئے حالات میں جب کہ اجنبی آقا کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ہے اور فضاؤں میں قرآن وسُنّت کی گُونج سُنائی دے رہی ہے تو ان کو اپنے اقتدار کے زوال کا اندیشہ ہے۔

یہ برطانوی سامراج کے فکری النسل مُسلمان آزادی و غلامی، مشرقیت و مغربیّت، دینداری و لادینی، عیسائیت اور اسلام کی آخری جنگ لڑ رہے ہیں۔ ان کی پہلی کوشش یہ تھی کہ اسلام نامی مذہب کی آواز بالکل دبا دی جائے اور قرآن وسُنّت کا کوئی تذکرہ حدودِ پاکستان میں باقی نہ رہے اور اس خداداد مملکت میں سیکولرازم (لادینیت) کے جھنڈے بلند ہوں، مگر اس محاذ پر شکست کھا جانے کے بعد عیّارانِ فن نے اپنے پینترے بدل دیے۔ اپنے آپ کو کتاب وسُنّت کا عالم قرار دے کر اپنے آپ ہی اپنے سروں پر دستارِ فضیلت کو پیچ دینے کی کوشش شروع کر دی اور یہ نعرہ لگایا کہ اسلام میں مُلّا ازم کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس کا معنیٰ کسی نے یہ نہیں لیا کہ یہ کٹھ مُلّا کو گالی دے رہے ہیں یا یہ علماءِ سُوء پر برس رہے ہیں بلکہ یہ سمجھا گیا کہ کہتے تو "مُلّا ازم" ہی ہیں لیکن دراصل یہ لوگ دین و مذہب اور اس کے مسائل و اصول اور ان کی پابندی کے خلاف منافقانہ زبان استعمال کر رہے ہیں۔ یہ مذہب سے بیزار ہیں اور بیزاری کا اظہار مُلّا کو گالی دے کر کرتے ہیں۔ یہ فرنگی مُلّا دینی علوم سے بے بہرہ ہیں اور اپنی

جہالت کو چھپانے کے لیے علماء پر برستے ہیں یا یہ لوگ علماء کو اپنا سیاسی حریف سمجھتے ہیں اور اس کا ذہنی انتقام مُلّا کو گالی دے کر لیتے ہیں یا ان کو یاوہ گوئی کی عادت ہے اور زبان و قلم کی آوارگی کے لیے کوئی لفظ نہیں ملتا تو مُلّا کو گالی سے اپنے نفس کے خبث کے لیے تسکین کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

علماء کی بزعمِ خود تذلیل و تحقیر کر کے اور اپنے آپ کو عالمِ دین قرار دے کر معلوم ہے، اُن کی کوششیں کیا ہیں؟

اُن کی نامُبارک و نامسعود کوششیں یہ ہیں کہ علومِ دینیہ کی جو اساس ہیں یعنی قرآن و سُنّت اور اس کے بعد صحابۂ کرام اور ائمہ دین کی تشریحات اُن کو ایک ایک کر کے اس طرح ساقط کر دیا جائے کہ وہ مذہب جس کی حفاظت علماء کرام نے چودہ سو برس سے اپنے خون پسینے سے کی۔ غُربت و افلاس کی زندگی بسر کر کے، سادہ خوراک، معمولی لباس اور گھاس پھونس کی جھونپڑیوں میں بیٹھ کر اُمراء و سلاطین کی دولت سے مُنہ موڑ کر قناعت کی زندگی اختیار کر کے کی، اس مذہب کا چراغ اُن کی پھونکوں سے گُل ہو جائے۔

"یریدون لیطفئوا نور اللّٰہِ بافواھِھم واللّٰہُ مُتمُّ نورہٖ ولو کرہ الکافرون"

اِس لیے اُنہوں نے احادیث کے خلاف کُھلی بغاوت اختیار کر لی اور یک قلم احادیثِ نبوی کو من گھڑت اور طومار کہہ کر مُسترد کر دیا اور اس کے ساتھ ہی محدّثین کرام اور ائمہ دین کے خلاف طوفانِ بے تمیزی برپا کر دیا اور جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں، اپنے آقایانِ مغرب کی تقلید میں جو اعتراضات مستشرقین نے احادیث پر کیے، وہی اعتراض ان مغرب پرستوں نے کسی قدر عبارت آرائی کے ساتھ پیش کر کے مُسلمانوں کو بہکانا شروع کر دیا۔ مجھے اس میں ذرا شک و شُبہ نہیں کہ یہ یورپ کے عیسائیوں اور مستشرقین کے ففتھ کالمسٹ ہیں اور یہ کُھلے ہوئے منافق ہیں جو اسلام کا لبادہ پہن کر وہی کام کر رہے ہیں

جو یورپ کے عیسائی مشنری کسی وقت انگریز کے ظلِ عاطفت میں کیا کرتے تھے۔

اسلامی معاشرے کی تشکیل

معزز حاضرین! اس وقت میں آپ کے سامنے قرآنِ کریم، احادیثِ نبویہؐ اور صحابہ کرامؓ کے طرزِ عمل سے حجیّتِ حدیث پر دلائل نہیں پیش کرنا چاہتا، اس کے لیے کسی اور صحبت کی ضرورت ہے۔ اس وقت مجھے جو آپ سے اس بارے میں عرض کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کی تکمیل حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے بغیر ناممکن ہے۔ صرف اسوۂ حسنہ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف تحیّۃ وسلام) ہی ایک ایسی مشعل ہے جس کی روشنی میں ہم اپنے کھوئے ہوئے راستے کو معلوم کر سکتے ہیں اور وہ اسلامی معاشرہ جو قرنِ اوّل میں ایک محیّر العقول انقلاب کا ذریعہ بنا تھا، اگر اس کی تشکیل کے عناصر معلوم کرنا چاہیں تو وہ یہ تین چیزیں ہی نظر آئیں گی:

۱۔ قرآن مجید
۲۔ آپؐ کے ارشادات و نصائح اور تعلیم و تلقین
۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ گرامی اور آپؐ کی زندگی کا عملی نمونہ یا اسوۂ حسنہ۔

اگر آپ بنظرِ غائر مطالعہ فرمائیں گے تو آپ کو صاف نظر آئے گا، بعثت نبویؐ کے مقاصد و نتائج کے ظہور میں اور جدید امّت کی تعمیر و تشکیل میں ان تینوں عناصر کا دخل ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان تینوں چیزوں کے بغیر ایک مکمّل معاشرہ اور ایک ایسی زندگی جس میں عقائد، اعمال، اخلاق، جذبات و کیفیات، ذوق و شوق، ایثار و حسنِ سلوک، مؤاسات، مکارمِ اخلاق اور اس کے ساتھ خوف و خشیّتِ الٰہی، توبہ و انابتِ الی اللہ، دعا و تضرّع زہد و قناعت، شوقِ آخرت اور دنیا کی فانی دولت کی تحقیر سب ہی ہوں، وجود میں نہیں آسکتی۔ میری بات یاد رکھو۔ زندگی زندگی سے مل سکتی ہے یعنی دیئے سے دیا جلتا ہے۔ صحابۂ کرامؓ اور اُن کے اتباع کی زندگیوں میں جو ہمیں گہرے دینی جذبات و کیفیات نظر آتی

ہیں، وہ تنہا تلاوتِ کتاب کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس محبوب ترین، مؤثر ترین اور کامل ترین زندگی کا بھی اثر ہے جو شب و روز اُن کے سامنے رہتی تھی۔ ان مجالس اور صحبتوں کا بھی فیض ہے اور ان ارشادات و نصائح کا بھی جس سے وہ آپؐ کی حیاتِ طیّبہ میں برابر مستفیض ہوتے تھے۔ ان سب کے مجموعے سے وہ نیا اسلامی معاشرہ قائم ہوا جسے عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابۂ کرامؓ کہا جاتا ہے اور اسلام کے عہدِ زرّیں سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس ماحول میں اسلام کا وہ مزاجِ خاص وجود میں آیا جس میں صرف قواعد و ضوابط کی قانونی پابندی نہ تھی، بلکہ ان پر عمل کرنے کے محرّکات و ترغیبات اور اسوۂ نبویؐ کی صحیح کیفیات اور عملِ صالح کی رُوح بھی موجود تھی۔

غرض رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ، ارشادات و نصائح کا مجموعہ جسے ہم حدیث و سُنّت کے نام سے پکارتے ہیں، دین کے لیے وہ فضا اور ماحول مہیّا کرتا ہے جس میں دین کا پودا سر سبز و بار آور ہوتا ہے۔ یہودی، عیسائی اور ایشیا کے دُوسرے مذاہب اس لیے بہت جلد مسخ ہو گئے کہ ان کے پاس اپنے پیغمبروں کی زندگی کے صحیح اور مُستند حالات اور اُن کے کلام کا کوئی ایمان آفریں مجموعہ محفوظ نہیں تھا اور ان مذاہب کو وُہ روحانی فضا اور ذہنی ماحول میسّر نہ ہوا جس میں ان کے پیرو دینی نشو و ارتقاء حاصل کرتے اور مادیّت کے حملوں سے محفوظ رہتے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیروانِ مذاہب سے اس کمی کو پُورا کرنے کے لیے احبار و رُہبان اور قسّیسین کے ملفوظات و واقعات کا سہارا لیا، مگر اس "خانہ پُری" نے رفتہ رفتہ مذاہب کو بدعات و رسوم کا مجموعہ بنا دیا اور نئی نئی تفسیروں نے اصل مذہب کو مسخ کر دیا۔

اسلام جس کو اللہ تعالیٰ نے دُنیا کا آخری مذہب قرار دیا، بحمداللہ اس حادثہ سے محفوظ رہا یعنی جس رُوحانی اور ذہنی ماحول میں اور جن قلبی کیفیات کے ساتھ صحابۂ کرامؓ نے زندگی گزاری، حدیث کے ذریعے اس پورے ماحول کو قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا۔ بعد

کو آنے والی نسلوں اور صدیوں بعد کے آنے والے انسان کے لیے یہ بالکل ممکن ہے کہ کُتب حدیث کے ذریعے وہ اپنے ماحول سے کٹ کر ایک دم اس ماحول میں پہنچ جائے جہاں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم بہ نفسِ نفیس موجود اور ارشادات و نصائح سے صحابۂ کرامؓ کو مستفیض فرما رہے ہیں اور صحابۂ کرامؓ ہمہ تن گوش بنے ہُوئے ارشاداتِ گرامی سُن رہے ہیں اور اس کے ساتھ صحابۂ کرامؓ کے جذبۂ اطاعت و انقیاد کے ایمان افروز نظارے بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔

دوستو! حدیث ایک ایسی دُوربین ہے جس سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی خانگی زندگی، آپؐ کے رات کے معمولات، دن کی مصروفیتیں اِنہی آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہیں —— ہاں ہاں آپ کے قیام و سجود کی کیفیت اِن آنکھوں سے اور آپ کی دُعا و مناجات کا زمزمہ کانوں سے سُنا جا سکتا ہے۔

مجھے بتلاؤ! جو آنکھیں آپؐ کو دعاؤں میں گڑگڑاتے ہُوئے اشک بار آنکھوں سے دیکھیں اور قدمِ مُبارک متورّم دیکھیں اور جو کان اپنے سوال کے جواب میں یہ آواز سُنیں کہ "افلا اکون عبداً شکوراً" (کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں) وہ غفلت کا شکار ہو سکتی ہیں —— ؟ اور جن لوگوں نے کاشانۂ نبوت میں دو دو مہینے چولہا گرم ہوتے نہیں دیکھا، جنہوں نے آپؐ کو پیٹ پر پتھر باندھے ہُوئے دیکھا، جنہوں نے آپؐ کی پُشت مُبارک پر خالی چٹائی پر لیٹے رہنے سے چٹائی کے نشانات پڑے دیکھے۔ جنہوں نے سونے سے پہلے آپ کو بیقراری کے ساتھ صدقہ کا بچا ہُوا سونا راہِ خدا میں خرچ کرتے دیکھا جنہوں نے مرضِ وفات میں چراغ کا تیل پڑوسی کے گھر سے قرض آتے ہُوئے دیکھا۔ اُن سے دنیائے دُنی کی حقیقت کیسے چھپ سکتی ہے اور زُہد و تقویٰ کا جذبہ کیسے ان کے اندر نہ اُبھرتا؟

دوستو! جن نفوسِ قدسیہ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو اپنے گھر والوں کی خدمت، اپنے بچّوں کے لیے سایۂ شفقت، اپنے خادموں کے ساتھ رحمدلی، اپنے رفقاء کے ساتھ

ہمدردی، اپنے ہمسایوں کے ساتھ حسنِ سلوک، اپنے مہمانوں کے ساتھ فیاضانہ میزبانی اور اپنے دشمنوں کے ساتھ صبر و تحمّل اور فتوحات کے بعد عفو و درگزر فرماتے دیکھا ہو، اُن کے اندر مکارمِ اخلاق اور انسانیتِ کاملہ کا ظہور کیوں کر نہ ہو؟

کاشانۂ نبوّت کے فیض یافتگان

یہ جو آپ سے کہہ رہا ہوں کہ دینی ماحول، روحانی فضا اور ایمانی کیفیت کی بستی جس میں صحابۂ کرامؓ نے پرورش پائی۔ اس بستی کے حالات حدیث کے ذریعے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ اس بستی میں صرف کاشانۂ نبوّت کا ہی دروازہ نہیں کھلا ہوا ہے جسے دیکھنے والوں کو یہ سب نظر آتا ہے بلکہ صحابۂ کرامؓ کے گھروں کے دروازے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ ان کے گھروں کی زندگی، طرزِ معاشرت، ان کی راتوں کا سوز و گداز، ان کے دنوں کی گرمی جہاد، ان کی بازاروں میں مصروفیت، مسجدوں میں ان کی سجدہ ریزیاں، ان کی بے نفسی و للّٰہیت، ان کا کمال انقیاد و اطاعت، ان کی بشری لغزشیں اور توبہ و انابت الی اللہ کے مناظر سب نظر آتے ہیں۔

غزوۂ تبوک سے بچھڑ جانے والے کعبؓ بن مالک کی گریہ و زاری اگر نظر آتی ہے تو عمیرؓ کا یہ قول بھی سنائی دیتا ہے کہ جھولی کی کھجوریں کھانا طویل زندگی ہے، کون اس کا انتظار کرے؟ وہ ناز و نعم میں پلے ہوئے مصعبؓ بن عمیر کی درویشانہ زندگی اور غزوۂ اُحد میں پرچم اسلام کی حفاظت میں یکے بعد دیگرے دونوں ہاتھوں کا کٹوانا اور بالآخر شہید ہو جانا بھی نظر آتا ہے۔ وہ ایک پاؤں سے معذور (لنگڑے) عمروؓ بن جموح کا بڑے الحاح سے حضورؐ سے جہاد میں شرکت کی اجازت مانگنا اور اجازت مل جانے پر میدان میں اکڑتے ہوئے جاتے بھی دکھائی دے رہا ہے وہ دعا مانگ رہا ہے: "اللّٰھم لا تردنی الیٰ اھلی" (یا اللہ مجھے اپنے گھر والوں کی طرف نہ لوٹائیو) بالآخر اس لنگڑی ٹانگ سے جہاد کرتے کرتے اس کا شہید ہو جانا بھی نظر آتا ہے۔ وہ حنظلہؓ جس کی شادی ابھی ابھی ہوئی ہے، ہمبستری سے فارغ ہونے کے بعد ابھی غسل بھی نہیں کیا اور غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کی شکست کی خبر سن

کہ اس کا بے تابانہ میدانِ جہاد کی طرف چلے جانا اور شہید ہو جانا بھی نظر آ رہا ہے۔ وہ بئرِ معونہ کے قصّہ میں عامر بن طفیل (رئیس بن عامر) کے پاس حضور کا والا نامہ پیش کرنے والے عاشقِ رسولؐ حضرت حرامؓ کے جب عامر بن طفیل نے نیزہ مارا اور وہ پار ہو گیا، تو اُن کا یہ کہنا: "فُزْتُ بربِّ الکعبۃ" (ربِّ کعبہ کی قسم میں تو کامیاب ہو گیا ہوں) بھی سُنائی دیتا ہے۔ یہاں سعدؓ بن ابی وقاص کے وہ الفاظ جو جنگِ قادسیہ میں رُستم (سپہ سالار ایرانی افواج) سے کہے سُنے جاتے ہیں: "فانّ معی قومًا یحبُّون الموت کما یحبّ الاعاجمُ الخمرَ۔"

(میرے ساتھ ایک ایسی جماعت ہے جو موت کو ایسا ہی محبوب رکھتی ہے جیسا کہ تم شراب پینے کو محبوب رکھتے ہو)

کامل اطاعت اور بے مثال امتثالِ حکم کے کیسے کیسے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہ انصاری جس نے گنبد دار مکان بنایا اور آپ نے اس پر اپنی خاموش نارضامندی کا اظہار فرمایا، کس طرح بے تابانہ جاتا ہے اور جا کر مکان مسمار کر کے زمین کے اس طرح برابر کر دیتا ہے کہ نام و نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ ابو بردہؓ کے والد کا یہ قصہ بھی سامنے آ جاتا ہے کہ ہم مجلس میں بیٹھے شراب پی رہے تھے، مَیں اُٹھا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہو کر سلام عرض کروں، ادھر شراب کی حُرمت نازل ہو چکی تھی۔ مَیں اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آیا اور مَیں نے آیہ کریمہ "فھل انتم منتھُوْن" تک پڑھ کر سُنا دی، بس پھر کیا تھا جن کے ساغر میں کچھ شراب باقی تھی، وہ فوراً گرا دی گئی اور جو شراب ہونٹوں میں پہنچ گئی تھی وہ فوراً تھوک دی گئی۔"

اللہ اللہ! اطاعت کی کیسی حیرت انگیز تصویر نظر آتی ہے جب عبدُاللہ بن ابیّ (رئیس المنافقین) کا بیٹا عبداللہؓ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کرتا ہے کہ اہلِ یثرب کو علم ہے کہ مجھ سے بڑھ کر اپنے باپ کا کوئی فرمانبردار نہیں، لیکن اگر حضورؐ ارشاد فرمائیں، تو میں اس کا سر کاٹ کر لے آؤں۔ حضورؐ نے فرمایا نہیں۔ لیکن اس نے عہد کر لیا کہ میرے باپ نے جو

یہ کہا ہے کہ "اگر مدینہ واپسی ہوئی تو جو معزز ہو گا وہ ذلیل کو نکال دے گا" ——— اس کا انتقام ضرور لوں گا۔ جب لوگ مدینہ واپس پہنچے تو عبدُاللہ بن ابیّ کا بیٹا عبدُاللہ مدینہ کے دروازے پر تلوار لیے اپنے باپ کے انتظار میں کھڑا نظر آتا ہے اور جب باپ آتا ہے تو کہتے ہیں :

"خدا کی قسم! تم مدینہ میں رسول اللہ کی اجازت کے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

لوگ ہر چند سمجھاتے ہیں، لیکن ماں باپ، خاندان، عزیز و اقارب سب پر رسول اللہؐ کی محبّت اور اطاعت کو ترجیح دینے والا عبدُاللہ کہتا ہے :

"خدا کی قسم! یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اجازت کے بغیر مدینہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔"

اطاعت اور فرمانبرداری کا کیسا عجیب منظر دیکھنے میں آتا ہے جب کہ سعدؓ بن معاذ انصاری غزدۂ بدر سے پہلے اپنی اور اپنی قوم کی وفاداری اور اطاعت شعاری کا یقین دلاتے ہوئے عرض کر رہے ہیں :

"یا رسُول اللہ! ہمارے مال و دولت میں سے جو چاہیں لے لیں اور جو چاہیں دے دیں۔ جو کچھ آپ ہم سے لے لیں گے، وہ اس سے زیادہ محبوب ہو گا جو آپ چھوڑ دیں گے اور جس بارے میں جو حکم فرمائیں گے، ہم اس کے تابع ہوں گے۔ خدا کی قسم! اگر آپ سمندر میں گھوڑا ڈال دیں گے تو ہم بھی اس میں کُود پڑیں گے۔"

محبّت و جاں نثاری کے ایسے واقعات نظر آتے ہیں کہ عشّاق و اہلِ محبّت کی تاریخ میں کبھی سُننے میں نہیں آئے۔ یہ دیکھئے حضرت خبیبؓ کو پھانسی کے تختہ پر چڑھایا گیا ہے۔ کفّار کہتے ہیں کہ اب تو تم پسند کرو گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) تمہاری جگہ ہوں۔" وہ کہتے ہیں: "خدا کی قسم! میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ آپؐ کے پاؤں میں کانٹا چبھے اور مَیں چھوٹ جاؤں۔"

یہ سعدؓ بن ربیع غزدۂ اُحد میں جن کے جسم پر ستّر زخم تیر اور تلوار کے ہیں۔ ان کی تلاش میں زید بن ثابتؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم سے جاتے ہیں۔ جب انہیں مقتولین

اور زخمیوں کے اندر دیکھ پاتے ہیں، تو حضورؐ کا سلام پہنچاتے ہیں۔ سعدؓ بن ربیع کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو میرا سلام عرض کر دو اور میرا حال بتا دو کہ میں اس وقت جنّت کی خوشبو پا رہا ہوں اور میری قوم انصار سے کہہ دو:

" اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو کچھ ہو گیا، اس حال میں کہ تم میں سے ایک آنکھ بھی حرکت کر سکتی ہو، تو اللہ کے ہاں تمہارا کوئی عذر نہ ہو گا۔"

اسی اُحد کے قصّہ میں انسؓ بن نضر نظر آتے ہیں۔ مُسلمانوں کو مغموم دیکھ کر اور یہ کہتے سُن کر کہ حضورؐ کا انتقال ہو گیا ہے، پُورے جوش سے کہہ رہے ہیں:

" مُوتوا علیٰ ما مات علیہ رسول اللہ"۔

(جس دین پر آپ نے جان دی ہم بھی اسی پر اپنی زندگی نچھاور کر دیں)

اس نعرۂ فدائیت وجاں نثاری کے بعد دشمنوں پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اسّی[۸۰] زخم جسم پر کھانے کے بعد جامِ شہادت نوش کرتے ہیں۔

وہ دیکھئے عمارہؓ بن زیاد اس غزوۂ اُحد میں شہید ہو رہے ہیں۔ سسکیاں لے رہے ہیں اور اس حالت میں گھسٹتے گھسٹتے اپنا سر نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے مُبارک قدموں میں رکھ رہے ہیں اور اپنے رخسار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے تلووں سے لگا رہے ہیں۔

اور ابو دجانہؓ کو دیکھئے کہ اُس نے اپنی پیٹھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے ڈھال بنا رکھا ہے۔ تیر پہ تیر لگ رہے ہیں اور وہ حرکت تک نہیں کر رہے۔ انہی کے ساتھ حضرت طلحہؓ کو دیکھیے کہ اپنے ایک ہاتھ کو حضورؐ کے لیے ڈھال بنا رکھا ہے اور آپ کی طرف آنے والے تیروں کو ہاتھ پر روک رہے ہیں۔ یہ ہاتھ ہمیشہ کے لیے شل ہو گیا۔

اور اس انصاری عورت کو دیکھئے کہ اس کا باپ، بھائی اور شوہر اُحد کے دن سب شہید ہو گئے ہیں۔ وہ اپنے گھر سے نکلی ہے اور غزوہ سے واپس آنے والوں سے پُوچھتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا کیا حال ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ بحمد اللہ عافیت سے

ہیں۔ لیکن وہ کہتی ہے۔ مجھے دکھاؤ میں آپؐ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ جب آپؐ کو دیکھ پاتی ہے، تو کہتی ہے: "کلّ مصیبة بعدکَ جَلَلٌ"

(آپؐ سلامت ہیں تو سب مصیبت، ہیچ ہے)

دوستو! یہ جو میں تم سے کہتا ہوں کہ زندگی سے ملتی ہے اور دیئے سے دیا جلتا ہے، دیکھتے نہیں کہ وہ فضالہؓ بن عمیر جو رسول اللہؐ کو شہید کرنے کے لیے گھر سے نکلا ہے اور آپ کو خانہ کعبہ کا طواف کرتے دیکھا۔ جب قریب پہنچا، تو آپ نے فرمایا: "کون؟" اس "کون" کے لفظ میں کتنی مقناطیسی طاقتیں تھیں کہ وہ فضالہ جو آپ کی جانِ مبارک لینے کے لیے آیا ہے، کہتا ہے، میں فضالہ ہوں۔ فرمایا: کیا سوچ کر آئے ہو۔ عرض کرتا ہے کچھ نہیں۔ آپ ہنس دیتے ہیں اور فرماتے ہیں، فضالہ اللہ کے آگے توبہ کر، پھر اپنا دستِ مبارک اُس کے سینے پر رکھ دیتے ہیں۔ فضالہ کا قلب پُرسکون ہو جاتا ہے اور مدینہ کی گلیوں میں کہتا پھرتا ہے، خدا کی قسم آج سے محمد صلی اللہ علیہ وسلّم سے زیادہ محبوب دُنیا میں کوئی چیز میرے لیے نہیں ہے۔ وہ عورت جو اس سے دل لگی کی باتیں کیا کرتی تھی، ملتی ہے اور کہتی ہے۔ آؤ دوست کچھ باتیں کریں۔ وہی فضالہ کہتا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی محبّت کے بعد اب اس قسم کی باتوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے میں اسلام قبول کر چکا ہوں، جاؤ چلی جاؤ۔

وہ کیسا اخلاقی مدرسہ اور رُوحانی تربیت گاہ تھی جو اپنے طالب علم کے اندر محاسبۂ نفس کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ ٹھیک اس وقت جب کوئی آنکھ دیکھنے والی نہیں ہوتی اور بشری کمزوری کی وجہ سے نفسِ امّارہ کسی گناہ پر آمادہ کر دیتا ہے، تو اس کا نفسِ امّارہ کس طرح نفسِ لوّامہ بن جاتا ہے۔ دل کی پھانس چین نہیں لینے دیتی۔ ضمیر ملامت کرتا ہے، گناہ کا خیال کر کے بے چین ہو جاتا ہے اور قانون کے سامنے اقرارِ جرم کر کے سخت سے سخت سزا کو برضا و رغبت قبول کرتا ہے۔ وہ ماعز بن مالک اسلمی جو زنا کے جرم کا ارتکاب

کرتا ہے، کس طرح بار بار (چار دفعہ) بارگاہِ نبوّت میں حاضر ہوتا ہے اور عرض کرتا ہے: یا رسُول اللہ! مجھے پاک کیجیے اور خوشی خوشی سنگساری کی سزا برداشت کرتا ہے۔ آپؐ اس کی حالت کو دیکھ کر فرماتے ہیں:

"لقد تابَ توبۃ لو قسمت بین امۃ لوسعتھم" (صحیح مُسلم)

(اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایک پُوری اُمّت پر تقسیم کر دی جائے، تو سب کو کافی ہو۔)

اس کے بعد غامدیّہ آتی ہے اور وہ بھی اقرارِ جُرم کرتی ہے اور کہتی ہے:

"یارسول اللہ! مجھ سے زنا کی غلطی سرزد ہو گئی ہے، مجھے پاک کیجئے"۔ وہ حاملہ ہے۔ اسے حضور واپس کر دیتے ہیں۔ وضعِ حمل کے بعد پھر آتی ہے۔ پھر واپس کر دیتے ہیں جب بچّے کا دُودھ چھڑایا، پھر واپس آتی ہے اور عرض کرتی ہے، اب تو مجھے پاک کر دیجیے۔ اسے سنگساری کا حکم دیا جاتا ہے۔ خود نمازِ جنازہ پڑھاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ عرض کرتے ہیں کہ اس زانیہ پر آپؐ جنازہ پڑھتے ہیں؟" آپؐ فرماتے ہیں:

"لقد تابت توبۃ لو قسمت بین سبعین من اھل المدینۃ لوسعتھم، ھل وجدت توبۃ افضل من ان جادت بنفسھا للہِ تعالیٰ"۔ (صحیح مسلم)

(اس نے ایسی مخلصانہ توبہ کی کہ اگر مدینہ کے ستّر لوگوں میں تقسیم کی جائے، تو اُنہیں کفایت کر جائے اور اس سے افضل توبہ کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے اللہ کے حُکم کے آگے خود اپنے آپ کو پیش کر دیا۔)

اللہ اللہ!! دیانت و امانت اور اخلاص کے کیسے کیسے نادرۂ روزگار واقعات ہیں کہ انسانی تاریخ میں ان کی مثال نہیں مل سکتی۔ مدائن فتح ہو جاتا ہے۔ تاجدارانِ آلِ ساسان کے بیش بہا خزانے صحابہؓ کے ہاتھ آتے ہیں۔ ترغیباتِ نفس اور خواہشات پر کتنا قابو ہے اور اللہ تعالےٰ کے حاضر و ناظر ہونے پر کتنا ایمان ہے۔ قبیلۂ عبدِ قیس کا ایک

گمنام شخص مالِ غنیمت لے کر آتا ہے اور خازن کے سپرد کر دیتا ہے۔ سب لوگ اس مالِ غنیمت کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں اور کہتے ہیں ایسا قیمتی سامان ہمارے دیکھنے میں نہیں آیا۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ تم نے اس مال میں سے کچھ لیا ہے؟ وہ گمنام شخص کہتا ہے: خدا کی قسم! اگر اللہ کا معاملہ نہ ہوتا تو تمہیں اس کی خبر بھی نہ ہوتی۔ لوگ پوچھتے ہیں، آپ کا نام کیا ہے؟ اللہ رے اخلاص، سراپا اخلاص کا مجسّمہ، کہتا ہے:

"میں نام نہیں بتاؤں گا، اس لیے کہ تم میری تعریف کرو گے اور تعریف صرف اللہ کے لیے ہے۔ اسی ثواب پر میں راضی ہوں۔" جب وہ واپس جاتا ہے، تو لوگ اس کا تعاقب کر کے لوگوں سے اس کا نام پوچھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام عامر اور قبیلہ عبدِ قیس سے اس گرامی قدر انسان کا تعلّق ہے۔ "فطوبیٰ لہٗ، ثم طوبیٰ لہٗ، ثم طوبیٰ لہٗ"۔

غرض ایک ایسا روحانی اور پاکیزہ ماحول صحابۂ کرامؓ کی زندگی میں نظر آتا ہے جس میں زندگی اپنے پورے تنوّعات و حقائق اور انسانی فطرت اپنے تمام خصائص کے ساتھ موجود ہے اور حدیث نے اس کا پورا فوٹو لے کر قیامت تک کے لیے اس معاشرے کے پورے حالات کو محفوظ کر دیا ہے۔

دوستو! قرآن مجید کے ساتھ آپؐ کے ارشادات و نصائح اور اس سارے ماحول کا محفوظ رہنا اسلام کا ایک اعجاز اور ایسا امتیاز ہے جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک و حصّہ دار نہیں ہے۔ عہدِ نبویؐ کی یہ تصویر اور ماحول صرف حدیث کے ذریعے محفوظ ہے۔ تدوینِ حدیث کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی بعد میں آنے والوں کی جدّت طرازی نہیں، بلکہ صحابۂ کرامؓ نے عہدِ نبویؐ ہی میں حفظِ احادیث کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں اور بعض نے کتابتِ حدیث کا بھی سلسلہ جاری رکھا، پھر انہی کے آخری دور میں تابعین کا جمعِ تدوینِ حدیث کے لیے سراپا شوق بن جانا، پھر مختلف بلادِ اسلامیہ کے شائقینِ علومِ نبویہ کے سمندر کا امڈ آنا۔ ان کا جمع و حفظِ حدیث سے عشق و شغف، حیرت انگیز

قوّتِ حافظہ، اِن کا بے مثل عزم و علوِّ ہمت، پھر اسماء الرّجال اور فنِ حدیث کے مجتہدین کا پیدا ہونا، پھر ان کا کمال انہماک و خود فراموشی، پھر اُمّت کا شوقِ حدیث اور عالمِ اسلام میں اس کی مقبولیت اور اشاعت، یہ سب واقعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ جمعِ قرآن کی طرح اللہ تعالیٰ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحیفۂ زندگی کو بھی محفوظ کرنا مقصود تھا۔ اس کی برکت سے حیاتِ طیبہ کا امتداد اور تسلسل باقی رہا۔ یعنی اُمّت کو ہر دور میں رُوحانی، علمی اور ایمانی میراث ملتی رہی جو صحابۂ کرامؓ کو براہِ راست حاصل ہُوئی تھی۔ اس طرح صرف عقائد و احکامِ شرائع ہی میں "توارث" کا سلسلہ جاری نہیں رہا بلکہ تزکیۂ نفس، ذوقِ ایمانی اور مزاجِ نبوی میں بھی توارث کا سلسلہ جاری رہا۔ اُمّت کی تاریخ میں کوئی مختصر سے مختصر زمانہ ایسا نہیں آیا جب وہ عہدِ صحابہؓ کا ذوق اور مزاج مفقود اور یکسر ناپید ہو گیا ہو۔ ہر دور میں ایسے افراد رہے جو صحابۂ کرامؓ کی اس رُوحانی اور ایمانی میراث کے وارث تھے یعنی وہی عبادت کا شوق، وہی زہد و تقویٰ، وہی خشیت و انابت الی اللہ، وہی استقامت و عزیمت، وہی دُنیا سے بے رغبتی اور آخرت کا شوق، وہی جذبہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، وہی بدعات سے نفرت اور جذبۂ اتباعِ سُنّت۔

اُمّتِ محمّدیہ کا یہ ذوقی، رُوحانی اور علمی توارث قرنِ اوّل سے چودھویں صدی کے عہدِ انحطاط تک برابر قائم ہے اور اویس قرنی، سعید بن المسیب، ابُوسفیان ثوری، عبداللہ بن مُبارک اور امام احمد بن حنبلؒ سے لے کر حضرت سیّد احمد شہیدؒ اور حضرت عبداللہ غزنویؒ تک کی زندگی میں ان کا پَرتو صاف نظر آتا ہے اور جب تک حدیث کا یہ ذخیرہ باقی، اور اس سے استفادہ کا سلسلہ جاری اور اس کے ذریعہ عہدِ صحابہؓ کا اسلامی معاشرہ محفوظ ہے، دین کا یہ صحیح مزاج جس میں آخرت کا خیال دُنیا پر، سُنّت کا اثر رسم و رواج پر، رُوحانیت کا اثر مادّیت پر غالب ہے، باقی رہے گا اور کبھی اُمّتِ محمّدیہ کو سرتاپا مادّیت، انکارِ آخرت اور بدعات و تحریفات کا پُورے طور پر شکار نہیں ہونے دے گا، بلکہ اس کے اثر سے ہمیشہ

اس اُمّت میں اصلاحی اور تجدیدی تحریکیں اُٹھتی رہیں گی اور کوئی نہ کوئی جماعت حق کی علمبردار اور سُنّت کے فروغ کے لیے کفن بردوش رہے گی اور یہی معنیٰ ہے اس حدیثِ نبوی کا:

"لا یزالُ طائفۃ" من اُمّتی ظاھرینَ علی الحق لا یضرھم من خالفھم حتّٰی یاتِی امر اللہ۔"

(یعنی میری اُمّت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا، تا قیامِ قیامت کسی مخالف کی مخالفت اِس گروہ کو جادۂ حق سے منحرف نہیں کر سکے گی۔)

یہ گروہ وہی ہو سکتا ہے، جو آپ کی تشریحاتِ قرآنی، جو آپ کے صحیفۂ زندگی اور جو آپ کے اسوۂ حسنہ اور وارثانِ علومِ نبوی، صحابۂ کرامؓ کے حالات و کیفیاتِ ایمانی اور سمع و طاعت کے ایمان افروز تذکروں کے جمع و حفظ کرنے والے تھے یعنی محدّثینِ کرام۔

مافوق العادۃ نظام

حق سُبحانہٗ و تعالیٰ نے قرآن کریم میں دو وعدے کیے ہیں۔ ایک وعدہ قرآن کریم کے لیے اور دُوسرا وعدہ قرآنِ کریم کی تشریح و بیان کے لیے اور اِن وعدوں کی تکمیل کے لیے حیرت انگیز اور مافوق العادۃ نظام اُس نے قائم کیا۔ یہ نظام اپنے قیام و بقا کے لیے نہ ملوک و سلاطین کا محتاج ہے اور نہ امراءِ دولت اور اعیانِ سلطنت کے جبر و تشدّد سے مِٹ جانے والا نظام ہے بلکہ اس کے لیے اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے ایسی مخلوق پیدا کی جس نے امراء کی دولت بخشش و نوال سے مستغنی و بے نیاز ہو کر بے مزد خدمت کی اور اس خدمت کو اپنا ایمانی فرض سمجھ کر اور ذخیرۂ آخرت جان کر سرانجام دیا۔ **فجزاھم اللہ عنّا و عن جمیع المسلمین خیر الجزاء** ——— ان دونوں وعدوں کا الگ الگ ذکر کرتا ہوں۔ وبیدہٖ التوفیق۔

پہلا وعدہ

انا نحنُ نزّلنا الذّکر و انّا لہ لحافظون (الحجر ۱)

"ہم نے قرآن مجید کو نازل کیا ہے اور ہم خود اس کے محافظ ہیں،"

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری وحی اور قیامت تک کے لیے بنی نوعِ انسان کے لیے خُدا کا آخری پیغامِ رشد و ہدایت ہے، اس لیے اس کی حفاظت کا حق جلّ و علا نے خود اپنے ذمّہ لیا اور اس کی حفاظت کے لیے مافوق العادۃ نظام قائم کیا۔ صحابۂ کرامؓ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کریم سیکھا اور اپنے سینوں میں محفوظ کیا۔ صحابۂ کرامؓ کے عہدِ مبارک سے آج تک کوئی لمحہ اور کوئی ساعت ایسی نہیں بتلائی جا سکتی جس میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد حفّاظِ قرآن کی موجود نہ رہی ہو۔ ذرا سوچو تو سہی کہ آٹھ دس سال کا بچّہ پاکستانی، ہندوستانی، افغانی، ترکی، چینی اور ملائی وغیرہ کسی قوم کا ہو جسے اپنی مادری زبان میں دس بیس صفحات کا رسالہ یاد کرانا دشوار ہوتا ہے، وہ ایک اجنبی زبان (عربی) کی اتنی ضخیم کتاب جو متشابہ جملوں سے پُر ہے، کس طرح فر فر سُنا دیتا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ نظارہ بارہا دیکھنے میں آیا کہ کسی مجلس میں ایک بڑے عالم یا حافظ سے کوئی حرف قرآن مجید کا چھوٹ گیا یا اعراب کی فروگذاشت ہوئی، تو چاروں طرف سے تصحیح کرنے والی آوازیں بلند ہو جاتی ہیں اور ممکن نہیں کہ پڑھنے والے کو غلطی پر قائم رہنے دیں۔ اس طرح حفّاظِ قرآن کے ذریعہ اللہ سُبحانہٗ و تعالیٰ نے قرآن مجید کی ایسی حفاظت کی کہ نزول کے وقت سے آج تک زیر زبر کی تبدیلی نہ ہو سکی اور اس اہتمام اور شغف کو دیکھیے کہ کسی نے قرآن کریم کے رکوع گن لیے، کسی نے آیات شمار کر لیں۔ کسی نے حروفِ قرآن کی تعداد بتلا دی، حتیٰ کہ بعض نے ایک ایک اعراب اور ایک ایک نقطہ کو شمار کر ڈالا۔ غرض جس شان اور ہیئت سے قرآن مجید اُترا، ابدوں ایک شوشہ یا زیر زبر کی تبدیلی کے محفوظ ہے۔

بعض دُشمنِ اسلام طاقتوں نے قرآن مجید کی عالمگیر قوّت کو دیکھ کر اس کی آواز کو دبانے کی کوشش کی، لیکن وہ ناکام و نامراد رہیں۔ خداوندِ عالم نے اس آواز کو چار دانگِ عالم میں پہنچایا اور دُشمنوں کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ دُنیا میں ایک بھی ایسی آسمانی کتاب نہیں، جو تیرہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو۔

اس کے ساتھ اس حیرت انگیز امر کو بھی دیکھئے۔ کہ قرآن مجید کے حفّاظ بنانے اور مدرسہ ہائے حفظِ قرآن قائم کرنے میں ملوک و سلاطین کی قوّت و دولت و سطوت کو کوئی دخل نہیں رہا۔ مسلمانوں نے از خود ہمیشہ حفظِ قرآن کے لیے اپنی والہانہ عقیدتمندیوں کا ثبوت پیش کیا اور ہمیشہ رضائے الٰہی کے حصُول کے لیے اس خدمت کو اپنی زندگی کا محبوب مشغلہ بنائے رکھّا۔ یہ ہے جو میں آپ سے کہہ رہا ہُوں کہ حفظِ قرآن کے لیے اللہ تعالیٰ نے حیرت انگیز مافوق العادۃ نظام قائم کیا اور قیامت تک کے لیے اسے ہر قسم کی تحریف سے محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا۔

دُوسرا وعدہ — ان علینا جمعہ وقرآنہ فاذا قرأناہُ فاتبع قرُانہ ثم انّ علینا بیانہ (القیامۃ ع۔۱)

(قرآن کا یاد کرا دینا اور پڑھا دینا ہمارے ذمّہ ہے۔ پس ہم جب (جبرئیل کے ذریعہ) قرآن پڑھ چکیں تو اس کے بعد آپ اس کو دہرائیں، اِس کے بعد قرآن کی تشریح بیان کرنا بھی ہمارے ذمّہ ہے)

جیسا کہ مفسّرین نے لکھّا ہے، شروع میں جس وقت حضرت جبرئیل اللہ کی طرف سے وحی لاتے تو اُن کے پڑھنے کے ساتھ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم بھی دل میں پڑھتے جاتے تھے تاکہ بروقت اسے یاد کرلیں، مبادا جبرئیلؑ کے چلے جانے کے بعد وحی پُوری طرح محفوظ نہ ہو سکے۔ مگر اس صُورت میں آپ کو بڑی دقّت ہوتی تھی۔ آپؐ کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نزولِ وحی کے وقت پڑھنے اور زبان ہلانے کی حاجت نہیں، ہمہ تن متوجّہ ہو کر سُننا ہی چاہیے۔ یہ فکر نہ کیجئے کہ وحی یاد نہیں رہے گی۔ وحی الٰہی کا تمہارے سینے میں حرف بحرف جمع کرنا اور آپ کی زبان سے پڑھوا دینا ہمارے ذمّہ ہے۔

اس لیے معلوم ہُوا کہ ایک تو قرآن ہے، دوسری چیز اس کی تشریح و توضیح۔ اس تشریح و توضیح کو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی رائے پر نہیں چھوڑا گیا، بلکہ اللہ سبحانہٗ وتعالےٰ

نے قرآن کی تبیین و تشریح اپنے ذمہ لی۔

پس یہ ناممکن ہے کہ قرآن کریم حسبِ وعدۂ الٰہی قیامت تک محفوظ رہے، مگر اس کی شرح گم ہو جائے یا محفوظ نہ رہے۔ قرآن کریم کا دُنیا میں بطورِ ذکر و ہدایت محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید اپنے تمام متعلقات کے ساتھ محفوظ رہے، یعنی نہ صرف پیمبرانہ تشریح تا ابد قرآنِ کریم کے ساتھ محفوظ رہے بلکہ عربی زبان اور عربی قواعد بھی محفوظ رہیں۔ اب مجھے آپ کے سامنے یہ بیان کرنا ہے کہ وہ کونسا محیّر العقول یا فوق العادۃ نظام ہے جس کے ذریعہ قرآن کریم کے بعد حدیث کی حفاظت کی گئی اور حفظِ قرآن کے بعد حفظِ حدیث کا بے پناہ شوق پیدا کیا گیا اور حفظِ حدیث کے لیے بے مثال قوتِ حافظہ صحابۂ کرامؓ، تابعین اور ان کے شاگردوں کو بخشی گئی۔

حفظِ حدیث کے عوامل

ذرا ان اسباب و دواعی پر نظر ڈالیے جو صحابۂ کرامؓ کو حفظِ کتاب و سنّت کے لیے میسر ہوئے اور جن کی بدولت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات و نصائح اور آپؐ کی مُبارک زندگی کے احوال و وقائع محفوظ ہو گئے اور اس طرح محفوظ ہوئے کہ دُنیا کے کسی فاتح، کسی حکمران، کسی شہنشاہ، کسی فلسفی غرض کسی بڑے سے بڑے انسان کی زندگی کے احوال و وقائع اس طرح محفوظ نہیں ہوئے جس طرح رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے محفوظ ہیں۔

پہلا عامل

جس عہد میں کتاب وسنّت کی حفاظت و اشاعت کی ذمہ داری قدرت کی جانب سے ان لوگوں کے سپرد ہوئی جو صحابۂ کرامؓ کے نام سے پکارے جاتے ہیں، دُنیا جانتی ہے کہ وہ اُمّی تھے، وہ خط و کتابت سے کوئی زیادہ آشنا نہ تھے سوائے معدودے چند افراد کے ان کی اکثریت علمی اور کتابی مشاغل سے ناآشنا تھی اور اس وقت کی دو متمدن قوموں مشرق میں ایرانی اور مغرب میں رُومیوں

کے ساتھ اُن کا کوئی تعلق نہ تھا جس سے معلوم ہو سکے کہ عرب ان سے علمی استفادہ کرتے تھے۔ اس لیے ان کا تمام تر دار و مدار حافظہ پر تھا۔ یہاں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ عرب کے اُمّی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ علمی مشاغل سے بالکل بے بہرہ تھے۔ اُن کا سب سے بڑا دماغی مشغلہ شعر و شاعری تھا۔ وہ عرب قبائل کے انساب سے بھی دلچسپی رکھتے تھے لیکن یہ صحیح ہے کہ معمولی نوشت و خواند کا سلسلہ چند گِنے چُنے لوگوں تک محدود تھا۔ عام طور پر ان میں لکھنے پڑھنے کا مذاق نہ تھا۔ ان کو اپنے حافظہ پر بڑا اعتماد تھا اور فخر تھا بلکہ زبانی یاد رکھنے کی کچھ فطری سی عادت اُن کی تھی۔ حافظ ابن عبدالبّر لکھتے ہیں:

"مذھب العرب انھم کانوا مطبوعین علی الحفظ مخصوصین بذلک" (جامع)

(عرب کی عام حالت یہ تھی کہ وہ زبانی یاد رکھنے کی فطری عادت رکھتے تھے اور اس بارہ میں ان کو خاص خصوصیّت حاصل تھی۔) عرب کے ایک شاعر کا کہنا ہے۔ ؎

لیس بعلم ما حوی القمطر ما العلم الا ما حواہُ الصدر

(علم وہ نہیں جو کتابوں میں درج ہو، عِلم صرف وہی ہے جو سینہ میں محفوظ ہو)

دُوسرا شاعر کہتا ہے: ؎

علمی معی حیث ما یمّمت احملہ بطنی وعاءٌ لہ لا بطن صندوق

(میرا علم میرے ساتھ ہے، جہاں جاتا ہُوں اُٹھائے لیے جاتا ہُوں۔ میرا بطن اس کا محافظ ہے نہ کہ صندوق شکم)

؎ ان کنت فی البیتِ کان العلم معی اذا کنتُ فی السوق کان العلم فی السوق

(اگر گھر میں رہتا ہُوں تو عِلم میرے ساتھ ہوتا ہے، جب بازار جاتا ہُوں، تو میرا علم بھی بازار میں ہوتا ہے۔)

ان اشعار سے اس قوم کے خاص رجحان کا پتا چلتا ہے۔ اس خاص مذاق کا یہ نتیجہ تھا

کہ قدرتی طور پر ان کو اپنے حافظہ پر بھروسا کرنا پڑتا تھا۔ عربوں کے حافظہ کی قوت کے جو واقعات کتابوں میں ملتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ کتابوں اور نوشتوں پر مدار رکھنے والی قومیں مشکل سے ان کو باور کر سکیں گی۔

"کان احدھم یحفظ اشعار بعض فی سمعۃ واحدۃ" (جامع)

(ان میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو صرف ایک دفعہ سُن کر لوگوں کے اشعار یاد کر لیا کرتے تھے۔)

حضرت عباس رضؓ کے متعلق مشہور ہے کہ ان کے سامنے عمر بن ابی ربیعہ شاعر آیا اور ستّر اشعار کا ایک طویل قصیدہ پڑھا۔ شاعر کے چلے جانے کے بعد ایک شعر کے متعلق کچھ گفتگو چلی۔ ابنِ عباس رضؓ نے فرمایا کہ اُس نے فلاں مصرعہ یوں پڑھا تھا۔ دُوسرے شریکِ مجلس نے کہا کہ تمہیں پہلی دفعہ میں کیا پُورا مصرعہ یاد رہ گیا؟ ابن عباس رضؓ نے فرمایا کہو تو پُورے ستّر شعر سُنا دوں؟ اُس نے کہا۔ ہاں سُنائیے۔ آپ نے اسی ترتیب کے ساتھ ستّر (۷۰) شعر سُنا دیئے۔

علاوہ اس کے کہ عرب کا حافظہ قُدرتی طور پر غیر معمولی تھا، اس کے ساتھ یہ بھی نظر آتا ہے کہ جس ذات پاک نے قرآن مجید کے متعلق "انا لہٗ لحٰفِظُون" کا اعلان کیا تھا اُس نے قرآن کی عملی شکل یا قرآن کی تبیین و تشریح یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات و نصائح اور وقائع زندگی کی حفاظت کا کام جن کے سپرد کر دیا تھا، ان کے حافظوں کو غیبی تائید کے ذریعہ سے بھی کچھ غیر معمولی طور پر قوی تر کر دیا تھا۔

صحیح بخاری میں حضرت ابُوہریرۃؓ کا یہ قصّہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ جب اُنہوں نے دربارِ رسالت میں نسیان کی شکایت کی تو آنحضرتؐ کی خاص توجہ اور دُعا کی برکت سے ان کا حافظہ ایسا قوی ہو گیا کہ پھر وہ کوئی چیز بھول نہیں سکتے تھے۔ اس قوّت حافظہ کی برکت سے ان کے پاس اتنا ذخیرہ جمع ہو گیا کہ کسی دُوسرے صحابی کے پاس نہ تھا۔ لوگوں کو ان کی کثرتِ

روایت پر تعجب ہوتا تو خود ہی فرماتے :

"ان الناس یقولون اکثر ابوھریرۃ ولولا آیتان من کتاب اللہ ما حدثت حدیثا ثم تلا (ان الذین یکتمون ما انزل اللہ من الکتاب ـ و ـ ان الذین یکتمون ما انزلنا من البینات والھدی) وان اخواننا من المھاجرین کان یشغلھم الصفق بالاسواق واخواننا الانصار کان یشغلھم العمل فی اموالھم وان اباھریرۃ کان یلزم رسول اللہ یشبع بطنہ ویحضر مالا یحضرون" (صحاح بحوالہ جامع)

(یعنی لوگ کہتے ہیں کہ ابوہریرۃؓ بہت حدیثیں بیان کرتا ہے اگر قرآن کریم کی دو آیتیں میرے پیشِ نظر نہ ہوتیں، تو میں کبھی کوئی حدیث بیان نہ کرتا اور دو آیتیں جن میں کتمانِ علم کے لیے وعید ہے پڑھیں اور ساتھ ہی یہ کہا کہ میرے بھائی مہاجرین کا یہ حال تھا کہ وہ بازاروں میں کاروبار میں مصروف رہتے۔ اور انصار اپنے باغات اور کھیتوں میں مشغول رہتے اور ابوہریرۃؓ نے رسول اکرمؐ کی مجلس اپنے لیے لازم کر رکھی تھی اور قوت لایموت پر گزارہ کرتا تھا۔ ابوہریرۃؓ آپ کی ہر مجلس میں موجود رہتے اور دوسرے صحابی اس قدر حاضر باشی نہیں کر سکتے تھے)

ابن سعدؒ کی روایت کے مطابق حضرت ابوہریرۃؓ تیس سال کی عمر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں خیبر کے مقام پر حاضر ہوئے۔ حضرت ابوہریرۃؓ فرماتے ہیں:

"پھر میں نے نبی اکرمؐ کے پاس قیام کیا تا آنکہ آپ کی وفات ہوگئی۔ میں آنحضرتؐ کے ساتھ ساتھ ہر جگہ رہتا۔ آپؐ اپنی بیویوں کے مکانوں پر جاتے، تو میں آپؐ کے ساتھ جاتا۔ ہر وقت آپؐ کی خدمت کرتا حج اور سفرِ جہاد میں بھی آپؐ کے ساتھ رہتا۔"

اس مسلسل حاضر باشی اور خدمت کا نتیجہ خود ابوہریرۃؓ فرماتے ہیں:

"میری اس وابستگی دربارِ نبویؐ کو دیکھ کر مجھ سے دوسرے صحابی نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلّم کی احادیث دریافت کرتے تھے، ان دریافت کرنے والوں میں عمرؓ بھی ہیں، عثمانؓ بھی، علیؓ بھی اور طلحہؓ و زبیرؓ بھی ہیں۔"

ایک دفعہ مروان بن الحکم نے حضرت ابوہریرۃؓ کا اس خیال سے امتحان لینا چاہا کہ یہ احادیث بہت بیان کرتے ہیں۔ دیکھا جائے کہ ان کی یادداشت قائم ہے یا بھول بھلائی حدیثیں بیان کرتے رہتے ہیں۔ امام بخاریؒ نے کتاب الکنیٰ میں اس امتحان کا ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

"مروان بن الحکم کے سیکرٹری ابوالزعزعہ کا بیان ہے کہ ایک دن مروان نے حضرت ابوہریرۃؓ کو طلب کیا۔ آپ تشریف لائے۔ مروان نے ان کے آنے سے پہلے ہی اپنے سیکرٹری ابوالزعزعہ کو حکم دے رکھا تھا کہ پردہ کے پیچھے دوات قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ جاؤ۔ مَیں ابوہریرۃؓ سے احادیث دریافت کروں گا۔ جو حدیثیں وہ بیان کریں، ان کو تم لکھتے چلے جانا۔ یہی کیا گیا۔ مروان حضرت ابوہریرۃؓ سے احادیث دریافت کرتا۔ حضرت ابوہریرۃؓ بیان کرتے چلے جاتے اور پس پردہ ابوالزعزعہ لکھتا جاتا تھا۔ ان احادیث کی تعداد کیا تھی؟ خود ابوالزعزعہ کا بیان ہے:

فجعل یسأل وانا اکتب حدیثاً کثیراً —— مروان نے ابوہریرۃؓ سے پوچھنا شروع کیا۔ وہ پوچھتا جاتا اور میں احادیث لکھتا جاتا؛ چنانچہ بہت سی احادیث مَیں نے لکھ لیں۔

حضرت ابوہریرۃؓ کو قطعاً مروان کی اس پوشیدہ کارروائی کا علم نہ تھا۔ مجلس برخاست ہوگئی اور حضرت ابوہریرۃؓ واپس تشریف لے گئے۔ مروان نے ان احادیث کے مجموعہ کو بحفاظت تمام رکھوا دیا۔ ابوالزعزعہ کہتے ہیں کہ سال بھر کے بعد مروان بن الحکم نے حضرت ابوہریرۃؓ کو دوبارہ طلب فرمایا اور مجھے حکم دیا کہ میں مکتوبہ احادیث کے مجموعہ کو لے کر پسِ پردہ بیٹھ جاؤں۔ مَیں ان سے ان ہی احادیث کو پھر پوچھوں گا۔ دیکھتا ہوں

کہ اب وہ کیا بیان کرتے ہیں ؟"

یہ حضرت ابوہریرہؓ کا گویا مروانی حکومت کی طرف سے امتحان تھا —— امتحان لیا گیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ خود ابوالزعزہ کی زبانی سُنیئے۔ ان ہی کے الفاظ عربی میں ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہُوں۔ وہ یہ ہیں :

"فترکہٗ سنۃً ثم ارسلہ وا جلسنی وراء ستر فجعل یسألہ وانا انظر فی الکتاب فما زاد ولا نقص۔" (کتاب الکنیٰ ۔ امام بخاری ص ۳۳)

یعنی مروان نے احادیث کے مجمُوعہ کو سال بھر تک رکھ چھوڑا۔ سال بھر کے بعد مجھے پھر پسِ پردہ بٹھا کر حضرت ابوہریرہؓ سے سوالات کرنا شروع کر دیے۔ ادھر میں کتاب دیکھتا جاتا تھا۔ پس ابوہریرہؓ نے نہ کسی لفظ کا اضافہ کیا اور نہ کم کیا۔

یہ ہے جو مَیں آپ سے کہتا ہوں کہ قرآن کریم کی تشریح و تفسیر یعنی حدیثِ نبوی کے حفظ و بقا کا کام جن لوگوں کے سپُرد کیا، اُن کے حافظوں کو غیبی تائید سے غیر معمولی طور پر قوی کر دیا تھا۔

دُوسرا عامل

صحابۂ کرامؓ کو النبی الصادق المصدوق صلی اللہ علیہ وسلّم سے جو والہانہ محبّت و عقیدت تھی، اس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔

بقول گاڈفرے ہگنس (عیسائی)، :

"حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے پیغام نے وہ نشہ اپنے پیروؤں میں پیدا کر دیا تھا جس کو حضرت عیسیٰؑ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے سُود ہے اور مَیں تو کہتا ہُوں کہ عیسائی ہی نہیں بلکہ دُنیا کو چاہیے کہ یہ یاد رکھے —— کہ اس نشہ کی مثال نہ اس سے پہلے دیکھی گئی اور نہ اس کے بعد دیکھی جا سکتی ہے۔"

عروہ بن مسعود ثقفی جو اس وقت تک مشرّف بہ اسلام نہ ہوئے تھے، صُلحِ حدیبیہ کے

موقع پر قریش کے سامنے صحابۂ کرامؓ کی والہانہ محبت و عقیدت کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

ای قوم واللہ لقد وفدت علی الملوک، وفدت علی قیصر وکسریٰ والنجاشی واللہ مارائیتُ ملکاً قط یعظمہ اصحابہ مایعظم اصحاب محمد محمداً، واللہ ان تنخم نخامتہ الا وقعت فی کف رجلٍ منھم فدلک بھا وجھہ وجلدہ، واذا امرھم ابتدروا امرہٗ، واذا توضّا کادوا یقتتلون علیٰ وضوئہ واذا تکلم خفضوا اصواتھم عندہٗ وما یحدّقُون الیہِ النظر تعظیماً لہٗ"۔ (صحیح بخاری)

(اے میری قوم! خُدا کی قسم مجھے بادشاہوں کے دربار میں حاضری کا موقع ملا ہے۔ قیصرِ روم، کسریٰ ایران، نجاشی (شاہِ حبش) کے ہاں باریابی حاصل ہوئی ہے۔ بخدا میں نے کسی بادشاہ کے لوگوں کو اتنی عظمت کرتے ہُوئے نہیں دیکھا جتنی محمدؐ کے ساتھی محمدؐ کی کرتے ہیں۔ بخدا جب وہ تھُوکتا ہے تو وہ ضرور کسی نہ کسی کے ہاتھ پر گرتا ہے، پھر وہ اسے اپنے چہرے اور بدن پر مل لیتا ہے۔ محمدؐ جب کسی بات کا انہیں حکم دیتے ہیں، اس کی تعمیل کی طرف جھپٹ پڑتے ہیں۔ جب محمدؐ وضو کرتے ہیں، تو وہ آپؐ کے وضو کے پانی پر آپس میں اُلجھ پڑتے ہیں۔ جب وہ بات کرتے ہیں تو سب کی آوازیں پست ہو جاتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ وہ کمالِ عظمت کی وجہ سے محمدؐ کی طرف نگاہ بھر کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔")

آپ اندازہ کیجئے کہ یہ ایک دوست کی نہیں، ایک دُشمن کی شہادت ہے۔ پس جس جماعت کی گہری محبت، دلی اُلفت اور رُوحانی عقیدت کا یہ عالم ہو کہ تھُوک اور وضو کے پانی پر ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں گویا آپس میں اُلجھ رہے ہیں اور آپؐ کے ایک مُوئے مُبارک کو گویا دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب سمجھتے ہوں ——— جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عبیدہؓ جنہیں حضرت انسؓ خادم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعے ایک مُوئے مُبارک ہاتھ آگیا ہے، فرماتے ہیں:

"لان تکون عندی شعرۃ منھا احب الیّ من الدنیا ومافیھا۔"

(میرے پاس آپؐ کا ایک بال ہونا اس درجہ محبوب ہے کہ دُنیا اور دُنیا میں جو کچھ ہے، وہ سب کچھ اس کے مقابلہ میں ہیچ ہے)

خدارا بتایئے کہ جن لوگوں کا قلبی اور رُوحانی تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ اس قسم کا ہو کہ ایک موئے مبارک بھی ان کے نزدیک دُنیا ومافیہا سے زیادہ محبوب ہو، تو اُن کے نزدیک آپؐ کے ارشادات وفرمودات اور آپؐ کے نصائح ووقائع زندگی کس درجہ محبوب ہوں گے اور کیا یہ علم النفس کا مسلّمہ مسئلہ نہیں کہ جب کسی سے محبّت سچّی ہوتی ہے اور دل کی گہرائیوں میں اس کی محبوبیت اُتر چکی ہو تو محبِّ صادق اپنے محبوب کی باتوں کے ذکر کرنے میں لذّت حاصل کرتا ہے۔ ؎

لہا احادیث من ذکراک تشغلہا　　عن الشراب وتلہیہا عن الزاد

بلکہ حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اس کی باتوں کو یاد کر کے وہ کھانے پینے سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے اور —— اس کی ایک ایک ادا کو یاد رکھتا ہے۔ اس کے نقش ونگار کے لیے بہتر سے بہتر تشبیہات تلاش کرتا ہے اور اس کی سی عادت اپنے اندر پیدا کرنے کو موجب فخر سمجھتا ہے۔ صحابۂ کرامؓ جنھوں نے اپنا مال وجان سب کچھ آپ پر قربان کر رکھا تھا اور وہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو اپنے نفس، اپنے ماں باپ، اپنے خاندان بلکہ سارے عالم سے زیادہ محبوب سمجھتے تھے، وہ کیونکر دُنیا کے عاشقوں سے کم تر ہو سکتے ہیں۔ یقیناً ہم دیکھتے ہیں کہ وہ حضورؐ کے اقوال وافعال واحوال کے حفظ میں اور پھر اس کا ایک دُوسرے سے مذاکرہ کرنے میں اس درجہ شوق اور انہماک رکھتے تھے کہ پوری انسانیّت کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ کسی ماہر فن مصوّر اور قادر الفن نقّاش کی مصوّری ونقّاشی کیا مثال پیش کر سکتی ہے اس تصویر کی جو حضرت علیؓ بن ابی طالب اور ہندؓ بن ابی ہالہ نے حضورؐ کا حُلیہ مُبارک بیان کرنے میں پیش کی ہے۔ اگر طولِ کلام کا خوف نہ ہوتا، تو میں اسے ضرور ذکر

کرتا ـــــــ لیکن میں عرض کروں گا کہ اس کے لیے شمائلِ ترمذی کو دیکھئے اور اپنے ایمان کو تازہ کیجئے۔ اور اندازہ کیجئے کہ جن لوگوں نے آپ کے چہرۂ مبارک اور آپ کے قدوقامت اور شمائل کے لیے اس قسم کی قلمکاری کی ہے۔ وہ آپؐ کے ارشادات و نصائح اور آپؐ کی زندگی کے معمولات کے حفظ کرنے اور اس کے بار بار کے تذکرے سے لطف اندوز ہونے میں کوتاہی کرتے ہوں گے؟

حدیث کے زندہ نسخے

اب میں آپ کے سامنے صحابۂ کرامؓ کے بے پایاں شوقِ حدیث کے بعض واقعات عرض کرنا چاہتا ہوں جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حدیثِ پاک کے لیے صحابہ کرامؓ کے دل میں کس قدر عزّت و احترام تھا اور اس کے حصُول کے لیے جو ذوق و شوق ان کے اندر تھا اس کی مثال تاریخِ عالم میں کہیں نہیں مل سکتی۔

جابرؓ بن عبدُاللہ

حضرت جابرؓ بن عبدُاللہ کا گھر مدینہ ہی میں تھا اور ان مقتدر اصحابِ کرام میں سے ہیں، جن کو "مکثّرین" کہا جاتا ہے۔ ابنِ جوزی نے اپنی کتاب "تلقیح" میں لکھا ہے کہ ان سے ایک ہزار پانچ سو چھ حدیثیں مروی ہیں اور حافظ ابنِ حجرؒ نے اصابہ میں لکھا ہے کہ حضرت جابرؓ کا ایک حلقۂ درس تھا جس میں لوگ ان سے علم حاصل کرتے تھے۔ آپ اس جلیل القدر صحابی کا اپنا بیان سُنیے، فرماتے ہیں:

بلغنی حدیث عن رجل من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلّم فابتعت بعیراً فشددت علیہ رحلی ثم سرت الیہ شہرا حتّٰی قدمت الشام فاذا عبد اللہ بن انیس الانصاری فاتیت منزلہٗ و ارسلت الیہ ان جابرا علی الباب فرجع الی الرّسول فقال جابر بن عبد اللہ فقلت نعم فخرج الیّ فاعتنقتہ و اعتنقنی قال قلت حدیث بلغنی عنکَ انکَ سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فی المظالم لم اسمعہ انا منہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم یقول۔

(الحدیث) (جامع بیان العلم صد ۹۳)

(نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے اصحاب میں سے ایک صحابی کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ ان کے پاس نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ایک حدیث مظالم سے متعلق ہے۔ (اس حدیث کا علم اس صحابی سے براہِ راست حاصل کرنے کے لیے) مَیں نے ایک اُونٹ خریدا اور پلان ڈالا اور شام کی طرف روانہ ہوا۔ ایک ماہ تک برابر چلتا رہا حتیٰ کہ میں شام پہنچ گیا اور عبداللہؓ بن انیس انصاری (جن کے نام سے انہیں حدیث پہنچی تھی) کے گھر پہنچا۔ اُن کے مکان کے اندر کسی قاصد کو بھیجا اور کہا اطلاع کردو تمہارے دروازے پر جابر کھڑا ہے قاصد نے واپس آکر پُوچھا کہ کیا جابرؓ بن عبداللہ ہیں؟ مَیں نے کہا۔ ہاں۔ یہ سُن کر عبداللہؓ بن انیس باہر نکل آئے۔ دونوں ایک دُوسرے سے بغلگیر ہُوئے۔ علیک سلیک کے بعد جابرؓ کہتے ہیں کہ مَیں نے پُوچھا مجھے آپ کے نام سے ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پہنچی ہے جو آپؐ نے ایک دُوسرے پر ظلم کرنے اور اس کی سزا سے متعلّق فرمائی ہے۔ (مَیں نے یہ حدیث خود آنحضرتؐ سے نہیں سُنی ہے) آپ نے یہ حدیث سُنی ہے؟ عبداللہ بن انیسؓ نے جواب میں کہا، ہاں۔ مَیں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ سلّم سے یہ حدیث سُنی ہے۔ (اس کے بعد عبداللہؓ بن انیس نے پُوری حدیث سُنائی۔))

صحیح بخاری کی روایت میں یہ الفاظ زائد ہیں:

"مجھے معلوم ہُوا ہے کہ آپ کے پاس ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہے۔ مجھے یہ خوف دامن گیر ہُوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ سے اس حدیث کے سُننے سے پہلے مَیں فوت ہو جاؤں۔" (فخشیت ان اموات قبل ان اسمعه)

ذرا اندازہ کیجئے اس عشق و شیفتگی کا کہ ایک حدیث جو صحابی کے ذریعے معلوم ہو چکی ہے لیکن اب براہ راست اس صحابی سے حدیث سُننے کے لیے شام کے سفر کا قصد کرتے ہیں۔ خاص اس مقصد کے لیے ایک اُونٹ خریدتے ہیں، ایک ماہ کا برابر سفر کرتے ہیں

اور اس صحابی سے ملاقات کا مقصد وحید بیان کرتے ہیں اور سفر کی ساری کوفت دُور ہو جاتی ہے جب ان کی زبان سے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلّم کی حدیث سُن لیتے ہیں۔

ابو ایُّوب انصاریؓ

اس سے بھی زیادہ ایمان افروز واقعہ مشہور صحابی حضرت ابو ایُّوب انصاریؓ کا ہے۔ ایک حدیث جو انہوں نے خود رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے سُنی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس حدیث کے متعلق انہیں مزید توثیق کی ضرورت محسوس ہُوئی۔ جس وقت حضرت ابو ایُّوب انصاریؓ نے یہ حدیث آنحضرتؐ سے سُنی تھی اُس وقت دربارِ رسالتؐ میں عقبہؓ بن عامر بھی موجود تھے۔ لیکن وہ اس وقت مصر میں قیام پذیر تھے۔ آپ کو سُن کر حیرت ہوگی کہ صرف ایک حدیث سُننے کے لیے اور اس کی توثیق کے لیے حضرت ابو ایُّوب انصاریؓ مدینہ منوّرہ سے مصر کا سفر اختیار کرتے ہیں اور عقبہؓ بن عامر کے پاس پہنچ کر فرماتے ہیں۔

"حدثنا ما سمعته من رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فی ستر المسلم لم یبق احد سمعه غیری و غیرک۔"

(مجھ سے وہ حدیث بیان کیجئے جسے آپ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے مُسلمانوں کی عیب پوشی کے متعلّق سُنا ہے۔ اب اس حدیث کے سُننے والوں میں سے میرے اور آپکے سوا کوئی باقی نہیں رہا ہے۔)

حضرت عقبہؓ بن عامر اُن کے سامنے وہ حدیث بیان کرتے ہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں: "من ستر مُسلما علی خزیه ستر اللہ علیه یوم القیامة۔"

(جس نے کسی مُسلمان کے عیب پر پردہ ڈالا، اللہ اُس کے عیبوں پر قیامت کے دن پردہ ڈالے گا۔)

اس کے بعد سُنیے۔ حضرت ابو ایُّوب انصاریؓ اس حدیث کے سُننے کے بعد محبت حدیث اور اس بارے میں اپنے اخلاص کا کیا مظاہرہ کرتے ہیں۔ روایت میں ہے:

"فاتی ابو ایوب راحلته فرکبها و انصرف الی المدینة وما حلّ رحله"

(حضرت ابو ایوبؓ حدیث سُنتے ہی اپنی سواری کی طرف پلٹے، سوار ہوئے اور مدینہ کی طرف واپس لوٹ گئے۔ آپ نے مصر میں اپنی سواری کی کاٹھی بھی نہ اتاری) (جامع بیان العلم صہ ۱۹۴)

ایک عاشقِ حدیث صحابیؓ

سنن دارمی میں ایک اور صحابی کے متعلق یہ روایت ہے:

"ان رجلا من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلّم رحل الی فضالة بن عبداللہ وھو بمصر فقدم علیه وھو یمد ناقته له فقال مرحبا قال اما انی لم اٰتك زائراً ولکن سمعت انا وانت حدیثا من رسول اللہ رجوت ان یکون عندك منه علم۔"

(دارمی صہ ۱۳۸ طبع مصر)

آنحضرتؐ کے صحابیوں میں سے ایک صحابی فضالہؓ بن عبداللہ کے پاس مصر پہنچے۔ (حضرت فضالہؓ اس وقت اپنی اونٹنی کا چارہ تیار کر رہے تھے) فضالہؓ نے مسافر صحابیؓ نے کہا میں آپ کی زیارت کے لیے نہیں آیا ہوں بلکہ میں نے اور آپ نے ایک حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے سُنی تھی۔ میں یہ اُمید لے کر آیا ہوں کہ وہ حدیث آپ کو یاد ہوگی)

عمرؓ بن الخطاب

حضرت عمرؓ بن الخطاب نے وحی الٰہی اور احوالِ نبویؐ سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے کیا پروگرام بنا رکھا تھا۔

صحیح بخاری میں اس کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں:

"کُنت انا وجارٌ لی من الانصار فی بنی امیه بن زید وھی من عوالی المدینة وکنّا نتاوّب النزول علی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلّم ینزل یوماً وانزل یوما فاذا نزلت جئته بخبر ذٰلك الیوم من الوحی وغیرہ واذا نزل فعل مثل ذٰلك۔"

(میں اور میرا ایک انصاری پڑوسی ہم دونوں بنی اُمیہ بن زید والوں کی بستی میں رہتے
تھے جو مدینہ کی بالائی بستیوں میں سے ہے۔ ہم دونوں آنحضرتؐ کی خدمت میں باری باری ۱۲۵
حاضر ہوتے تھے۔ ایک دن وہ حاضر ہوتے اور ایک دن میں حاضری دیتا۔ میں جس دن
حاضر ہوتا اُس دن کے حالات اور وحی وغیرہ کی خبر ان کو سناتا اور جب وہ حاضر ہوتے تو
وہ بھی اسی طرح کرتے)

حدیث کی کتابوں میں اس کا کافی ذخیرہ موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفاء راشدین
اور دُوسرے جلیل القدر صحابہ ایک دُوسرے سے آنحضرتؐ کی حدیث معلوم کیا کرتے تھے۔
مردوں سے اگر پتہ نہ چلتا تو امہات المؤمنین کے پاس کسی کو بھیج دیا جاتا۔ اگر اُن کے پاس
کوئی حدیث ہوتی تو وہ بیان کر دیتیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کے ذکر میں پہلے بیان کر چکا ہوں
کہ ان کی مسلسل حاضر باشی کی وجہ سے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت
زبیرؓ جیسے اکابر صحابہؓ اُن سے احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم معلوم کیا کرتے تھے۔

حضرت انسؓ جن کو نو برس تک صحبتِ نبویؐ میں حاضر رہنے کا شرف حاصل ہے۔
ایک دفعہ وہ حدیث سُنا رہے تھے کہ حلقہ کے لوگوں میں سے کسی نے پوچھا:

"أنت سمعته من رسولِ اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم؟"

(کیا آپ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا ہے؟)

حضرت انسؓ جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

"واللّٰہ ما کل ما حدثکم عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم سمعناہُ و
لکن لم یکن یکذبُ بعضنا بعضاً" (طبرانی کبیر۔ مستدرک حاکم)

(قسم بخدا! تمام وہ احادیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے ہم روایت کرتے
ہیں، ضروری نہیں کہ آپؐ سے ہم نے خود سُنی ہوں، بلکہ ایک دُوسرے سے
سُن کر بھی روایت کرتے ہیں کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو جھوٹ

نہیں بیان کرتا)

حضرت براء بن عازبؓ سے بھی اسی قسم کے الفاظ مسند امام احمدؒ میں منقول ہیں۔ فرماتے ہیں: "ما کل الحدیث سمعناہُ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم یحدثنا اصحابنا عنہ کانت تشغلنا عنہ رعیۃ الابل۔"

(تمام احادیث ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے بلا واسطہ نہیں سُنی ہیں۔ ہمارے ساتھی آپؐ سے احادیث سنتے اور ہمیں وہ احادیث بیان کر دیتے اس لیے کہ ہم اُونٹوں کو چرانے میں مشغول رہتے تھے)

غرض محدود معاشی ذرائع کی وجہ سے مہاجرین کو اپنے اہل وعیال کی پرورش کے لیے عموماً بیوپار یا صنعتی کاروبار میں مشغول ہونا پڑتا تھا۔ جس گاؤں کا حضرت عمرؓ نے ذکر کیا ہے یہاں آپ کی نگرانی میں کپڑا بُننے کے کرگھے تھے اور سنح نامی گاؤں میں حضرت ابوبکرؓ کا کارخانہ تھا ـــ انصار عموماً اپنے باغات اور کھیتوں میں مصروف رہتے تھے۔

لیکن بایں ہمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے احوال و وقائع اور ارشادات و نصائح کے سُننے اور یاد کرنے کا خاص شغف ان میں موجود تھا جس کی برکت سے احادیث کا وہ ذخیرہ تابعین نے ان سے حاصل کیا اور تابعین سے اُمّت نے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

وبعد از قرآن اصل دین وسرمایۂ یقین علم حدیث است و آنچہ امروز از علم حدیث بدست مردمان است ساختہ و پرداختہ شیخین است بآں سبب کہ جُملہ صالحان از حدیث شیخین خود روایت کردہ اند، نہ پنداری کہ شیخین ہمیں قدر روایت کردہ اند کہ در کُتب اسانید بایشاں نسبت کردہ مے شود، بلکہ بسیارے از احادیث مرفوعہ کہ در مسانید مکثرین از صحابہ مذکور است۔ بحقیقت روایت شیخین است کہ عبداللہ بن عمرؓ و عبداللہ بن عباسؓ و ابوہریرہؓ آں را ارسال نمودہ اند و با نحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم رفع کردہ و اہل مسانید ظاہر آں را اعتبار کردہ در مسانید

ایشاناں در نمودہ اند۔"

(قرۃ العینین ص ۵۵)

("یعنی قرآن کریم کے بعد اصل دین اور سرمایۂ یقین علمِ حدیث ہے اور یہ جو آج علمِ حدیث کا ذخیرہ لوگوں کے پاس موجود ہے یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کا ہی تو ساختہ پرداختہ ہے۔ بات یہ ہے کہ اکثر صحیح احادیث ان ہر دو حضرات ہی کی مروی ہیں اور یہ خیال نہ کرنا کہ حضرات شیخین سے صرف وہی احادیث مروی ہیں جو کتبِ حدیث میں ان کی طرف منسوب ہیں، بلکہ بہت سی مرفوع احادیث جو کُتب حدیث میں بہت سے صحابہؓ سے مروی ہیں، حقیقت میں حضرات شیخین ہی کی روایات ہیں — عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور ابوہریرہؓ ان روایات کو مرسلاً روایت کر کے مرفوع حدیث ذکر کر دیتے ہیں — اور کُتب حدیث کے مصنّفین ان روایات کی ظاہری صورت کا اعتبار کر کے اپنی اپنی کتابوں میں انہی صحابہؓ کی روایات میں درج کر دیتے ہیں")

آپ نے دیکھا کہ اس خطبہ کو پڑھتے ہُوئے جذبات کی تطہیر بھی ہوتی ہے اور کتاب وسُنّت کا علم بھی حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ اسوۂ رسُول میں ڈوب جانے کی دلیل ہے کہ خطابت یُزکّیھم ویعلّمھم الکتاب والحکمہ کی سراپا تفسیر بن جائے۔

نظریات و رجحانات

توحید

صفاتِ الٰہی

بزرگوں سے مرادیں مانگنا

صاحبِ قبر سے دُعا کروانا

قبروں کے پاس عبادت کرنا

سجدۂ تعظیمی

مقامِ رسالتؐ

خلافت کب تک رہی ؟

حُبِّ اہل بیت

امام حُسین علیہ السلام سے عقیدت

بزرگوں کا ادب

توحید

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصنیف "حجۃ اللہ البالغۃ" کے "باب التوحید" کا حضرت والد علیہ الرحمہ نے اُردو ترجمہ کیا اور اس پر نہایت مفید تعلیقات کا اضافہ کیا۔ ترجمہ اور تعلیقات کا اصل مسودہ اس وقت پیشِ نظر ہے۔ عقیدۂ توحید کو تمام نیکیوں کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ اس رسالے کے ابتدائی صفحات میں حضرت والد علیہ الرحمہ نے توحید کے مدارج کی وضاحت فرمائی ہے جس کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ توحید کے چار درجے ہیں۔ ایک یہ کہ واجب الوجود صرف اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ یعنی صرف وہی ہیں جو اپنے وجود میں کسی دوسرے کے محتاج نہیں۔ اس کے سوا کوئی واجب الوجود نہیں۔ دوسرے یہ کہ صرف اللہ ہی عرش، آسمانوں، زمینوں اور تمام موجودات کا خالق ہے۔ توحید کے یہ دونوں درجے ایسے ہیں جن پر آسمانی کتابوں میں بحث کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی، اس لیے کہ یہود و نصاریٰ تو درکنار مُشرکینِ عرب کو بھی ان سے اختلاف نہ تھا۔ قرآنِ عظیم میں نہایت تصریح کے ساتھ یہ بیان فرمایا ہے کہ یہ دونوں مدارجِ توحید ان کے نزدیک بھی مسلّم تھے۔ توحید کے ان دو پہلوؤں کے مشرکینِ عرب بھی قائل تھے، اس بات کی وضاحت حضرت والد علیہ الرحمہ نے تعلیقات میں ان تین آیتوں سے کی ہے:

۱۔ "وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ لَيَقُولُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيزُ الْعَلِيمُ" (الزخرف : ۹)

(اگر آپ ان سے پُوچھیں کہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، تو وہ ضرور کہیں گے کہ غالب علم والے نے انہیں پیدا کیا)

۲ — وَلَئِن سَأَلتَهُم مَّن خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالأَرضَ وَسَخَّرَ الشَّمسَ وَالقَمَرَ لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ فَأَنّٰى يُؤفَكُونَ (العنکبوت: ۶۱)

(اگر آپ ان سے پُوچھیں کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور سُورج اور چاند کو مسخر کیا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے)

۳ — وَلَئِن سَأَلتَهُم مَّن نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَحيَا بِهِ الأَرضَ مِن بَعدِ مَوتِهَا لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ (العنکبوت: ۶۳)

(اگر آپ ان سے پُوچھیں کہ کس نے آسمان کی طرف سے بارش کا پانی اُتارا اور اس کے ذریعے سے زمین کو مر جانے کے بعد پھر زندگی بخشی، تو وہ ضرور کہیں گے کہ وہ اللہ ہے)

فرماتے ہیں کہ توحید کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ زمین و آسمان اور جُملہ کائنات کی تدبیر و انتظام کو صرف اللہ تعالیٰ سے ہی متعلق سمجھا جائے اور کسی کو تصرّفاتِ کائنات و تدبیرِ عالم میں اس کا شریک نہ جانے اور چوتھا درجۂ توحید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو عبادت کا مستحق نہ ٹھرایا جائے۔ توحید کے یہ دونوں درجے آپس میں لازم و ملزوم ہیں اور اُن کے درمیان ایسا طبعی رابطہ ہے کہ جو شخص تیسرے درجۂ توحید کو مانے گا وُہی چوتھے درجے میں بھی ثابت قدم رہیگا۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ مشرکین کا مسلمانوں سے اختلاف جو کچھ ہُوا ہے وہ انہی آخری دو مدارجِ توحید میں ہُوا ہے۔ مُشرکینِ عرب میں سے ایک گروہ کا یہ عقیدہ تھا کہ حق تعالیٰ کی ذاتِ اقدس اس قدر بلند و برتر ہے کہ ہم اس کی براہِ راست عبادت سے اس کا قرب حاصل نہیں کر سکتے۔ اس تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ جو اس کا تقرّب حاصل کر چکے ہیں، ان کی جناب میں رسائی پیدا کر لی جائے۔ ان کے توسّل کے بغیر اللہ

تعالیٰ کا قُرب حاصل کرنا ممکن نہیں۔ اُن کا یہ گماں تھا کہ اُن سے جو پہلے نیک لوگ گزرے ہیں اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اطاعت کر کے اس کے ہاں ایسا بلند مقام حاصل کر لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خلعت الوہیت سے سرفراز فرمایا ہے اور ان کو اس عالم کے بعض امور میں تصرّف کا اختیار دے دیا ہے۔ اُن کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہ بزرگ سُنتے ہیں، دیکھتے ہیں، اپنے پرستاروں کی سفارشیں کرتے ہیں۔ ان کی حاجت روائی اور مشکل کشائی میں مدد کرتے ہیں اور معاملات کی تدبیر انہی سے متعلّق ہے۔ اسی خیال سے اُنہوں نے پتھروں کے بُت اُن بزرگوں کے نام پر بنائے اور ان بزرگوں کی ارواح کی طرف متوجّہ ہونے کے لیے ان مادّی صُورتوں کو وسیلہ اور ذریعہ بنایا اور بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ پچھلے لوگوں نے اپنے اسلاف سے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور ان بُتوں کو ہی اصل سمجھنے لگ گئے اور خود انہی کو معبُود اور حاجت روا قرار دے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ حق سُبحانہٗ و تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان مُشرکین کے باطل عقائد کی تردید میں کبھی تو اس پر تنبیہہ کی ہے کہ تمام کام اللہ ہی کے حکم سے سر انجام پاتے ہیں اور وہی سب کا مالک اور اسی کے قبضۂ قُدرت اور تصرّف میں سب کچھ ہے اور کوئی دُوسرا اس کا شریک نہیں اور کبھی اس بناء پر ملامت کی ہے کہ وہ محض پتھر کی مورتیوں کی پُوجا کرتے ہیں[1]۔"

صفاتِ الٰہی

حضرت والد علیہ الرحمہ نے تعلیقات میں "استواء علی العرش" پر یہ نوٹ دیا ہے:

"استواء علی العرش" اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ میں سے ایک صفت ہے۔ صفاتِ الٰہی کے متعلّق یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ نصوصِ قرآن و حدیث میں کئی ایسے الفاظ حق سبحانہٗ تعالیٰ کی صفات کے لیے استعمال کیے گئے ہیں جو مخلوق کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔

---

[1] باب التوحید صفحہ ۳ تا ۸

جیسا کہ سمیع، بصیر، علیم اور متکلّم۔ خالق و مخلوق میں جس طرح مشابہت اور مماثلت نہیں "لیس کمثلہ شیئ" اسی طرح ان کی صفات میں بھی مشابہت اور مماثلت نہیں، جس طرح ہم یہ ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سُنتا ہے، دیکھتا ہے، کلام فرماتا ہے جیسا کہ اس کی شانِ اقدس کے لائق ہے، اسی طرح "استواء علی العرش" کے متعلق بھی یہی ایمان ہونا چاہیے کہ "استواء کما یلیق بشانہٖ" جیسا اس کی شانِ ارفع کے لائق ہے اسی طرح اسے استواء علی العرش سے متصف مانتے ہیں۔"[1]

حضرت والد علیہ الرحمہ کے ہاں تشدّد اور غلو نہ تھا۔ مسلک میں اعتدال تھا۔ بزرگانِ کرام کے لیے لفظ "سیّدنا" کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتے تھے۔ ایک موقع پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے ارشاد فرمایا تھا "السیّد ھو اللہ" یعنی حقیقی معنوں میں سیادت اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے اور اسی حدیث کی بنا پر بعض علماء نے مخلوق کے لیے اس لفظ کے استعمال کو ناجائز قرار دیا۔ اس حدیث کی تشریح تعلیقات میں یُوں کرتے ہیں:

"مسند امام احمدؒ اور سنن ابی داؤد میں پوری روایت یُوں ہے کہ مطرف بن عبداللہ بن الشخیر کہتے ہیں کہ میں بنی عامر کے ایک وفد کے رُکن کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہُوا، تو ہم نے آپؐ سے عرض کیا: "انت سیدنا" آپؐ ہمارے سیّد ہیں تو آپ نے فرمایا: "السید ھو اللہ" "سیّد" کا اطلاق اللہ کے لیے ہے۔ اس کے بعد ہم نے کہا کہ آپؐ ہم سب میں عظیم المرتبت اور افضل ہیں، آپؐ نے فرمایا "ہاں! یوں کہو یا اس کے کوئی ہم معنی لفظ کہہ سکتے ہو۔" وفود میں جو لوگ حاضرِ خدمتِ اقدس ہوتے تھے ان میں سے اکثر نئے نئے حلقۂ اسلام میں داخل ہُوئے تھے۔ ایسے لوگوں کے لیے احتیاط کے طور پر نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم ایسے الفاظ و آداب سے بھی منع فرماتے تھے جن سے

---

[1] باب التوحید (تعلیقات)، ص ۶

کسی قسم کا ادنیٰ میلان بھی شرک کی طرف ہو جائے۔ جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ شروع شروع میں آپؐ نے مردوں اور عورتوں سب کو زیارتِ قبور سے منع فرمادیا تھا، لیکن جب اسلام راسخ ہو گیا اور عقیدۂ توحید پختہ ہو گیا اور عبادتِ قبور کا شائبہ تک نہ رہا تب آپؐ نے زیارت قبور کی اجازت دے دی۔ یہ تفصیل اس لیے کی گئی ہے کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آپؐ نے انصار سے سعدؓ بن معاذ کے بارے میں فرمایا: "قوموا الیٰ سیدکم" یعنی اپنے سیّد کی طرف کھڑے ہو جاؤ اور آپؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ کے لیے فرمایا: "سیدا کھول اھل الجنة" یہ دونوں جنّت کے بزرگ عمر کے لوگوں کے سیّد ہیں (ترمذی) اور حضرت حسنؓ کے لیے فرمایا: "ابنی ھٰذا سید" میرا یہ بیٹا سید ہے۔ (بخاری) اور حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ دونوں کے لیے فرمایا: "سیدا شباب اھل الجنة" یہ دونوں جنّت کے نوجوانوں کے سیّد ہیں (ترمذی)، اور فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لیے فرمایا: سیدۃ نساء اھل الجنّة" جنّت کی تمام عورتوں کی سیدہ (سردار) ہیں (صحیحین) اور غلام کے لیے فرمایا: "انّ العبد اذا نصح سیدہ الخ"۔ غلام جب اپنے آقا کی خیر خواہی کرے اور اللہ کی عبادت اچھی طرح سے کرے، اسے دوگنا ثواب ہوگا (صحیحین)، معلوم ہوا کہ سیّد کا لفظ سردارِ قوم، بزرگ، محترم اور آقا کے معنوں میں استعمال ہو سکتا ہے[۱]۔"

بعض لوگ توحید بیان کرتے ہوئے انبیاء اور اولیاء کا ذکر ناشائستہ انداز میں کرتے ہیں۔ حضرت کو یہ بات بہت ناگوار ہوتی تھی؛ چنانچہ تعلیقات میں لکھتے ہیں:

"یہ بہت اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ فرقِ مراتب بیان کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ذکر اس طرح نہ کریں کہ اس سے ادب کے خلاف کوئی لفظ زبان پر آجائے مثلاً علمِ غیب کے مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح اگر کوئی کہہ دے کہ آپ غیب وغیب

---

۱ باب التوحید (تعلیقات) صد ۱۳

کچھ نہیں جانتے تھے (معاذ اللہ) تو یہ سوءِ ادب ہوگا اور آپؐ کی شان میں سوءِ ادب کفر کی حد تک پہنچا دیتا ہے کیونکہ قرآنِ کریم میں حق تعالیٰ نے آپؐ کے متعلق یہ آداب بیان فرمائے ہیں: "اور اپنی آوازیں پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی آواز سے اُونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دُوسرے سے زور سے بولتے ہو، اس طرح ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔" (حجرات - ۲)

"پیغمبر کے بُلانے کو ایسا خیال نہ کرنا جیسا کہ تم آپس میں ایک دُوسرے کو بُلاتے ہو"

(نُور - ۶۳) یعنی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو ادب اور تعظیم سے بُلانا چاہیے۔ پس یُوں کہنا چاہیے کہ مغیبات کا عِلم حق سبحانہٗ و تعالیٰ ہی کو ہے لیکن اُس نے بعض غیب کی باتوں کا علم اپنے رسولِ پاکؐ کو عطا فرمایا ہے۔ یہ تو ہے تکوینیات کے متعلق۔ رہا شرعیات کا عِلم جو انبیاکرام کے منصب سے متعلق ہے، اس بارہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا عِلم اوّلین و آخرین سے بڑھ کر ہے اور وہ علوم و معارف حق تعالیٰ نے آپؐ کو مرحمت فرمائے ہیں کہ کسی انسان کی طاقت ہی نہیں کہ ان سب پر حاوی ہو سکے۔

یاربّ صلِّ وسلّم دائماً ابداً علیٰ حبیبک خیرالخلق کلّھم[۱]"

بزرگوں سے مُرادیں مانگنا

حضرت والد علیہ الرحمۃ ہر اُس بات سے جس میں شرکِ جلی یا شرکِ خفی کا ہلکا سا بھی شائبہ ہوتا یا جس بات کے منجر الی الشرک ہونے کا احتمال ہوتا، شدّت سے منع فرماتے تھے۔ فرماتے تھے کہ بزرگوں کی قبروں پر جا کر اُن سے مرادیں مانگنا شرکِ جلی ہے۔ عربوں کے جس فعل کی بنا پر قرآن مجید انہیں مُشرک ٹھہراتا ہے، وہ یہی تھا کہ وہ اپنی مصیبتوں اور حاجتوں میں اللہ کے سوا اپنے بزرگوں کو پُکارتے اور اُن سے مدد چاہتے تھے اور ان کو اسی فعلِ شنیع

[۱] باب التوحید (تعلیقات) صہ ۱۸-۱۹

سے بار بار مختلف پیرایوں میں روکا ہے ——— فلا تدعوا مع اللہ احداً۔ اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو۔ فرماتے تھے کہ "دُعا" کا لفظ یہاں اپنے اصلی مفہوم "پُکارنے" کے معنی میں بھی استعمال ہُوا ہے۔ "دُعا" سے یہاں مراد عبادت نہیں ہے جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں وضاحت فرمائی اور متعدد آیتوں سے استدلال کیا ہے۔

صاحبِ قبر سے دُعا کروانا

فرماتے تھے کسی بُزرگ کی قبر پر جا کر اُن سے یہ کہنا کہ آپ میرے لیے دُعا کریں، صریحاً ناجائز ہے اور کتاب و سُنّت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے ایسا نہیں کیا اور نہ اس امر کی صحابہؓ کو تلقین فرمائی۔ خلفائے راشدین سے بھی اس بات کا ثبوت نہیں ملتا۔ صحابۂ کرامؓ، تابعین اور تبعِ تابعین میں سے کسی سے یہ ثابت نہیں۔ فرماتے تھے کہ دُعا کا تعلق دار العمل سے ہے اور وہ انبیاء اور صلحاء جو اس دُنیا سے رحلت فرما گئے وہ دار الجزاء میں ہیں۔

قبروں کے پاس عبادت کرنا

بعض لوگ بزرگوں کی قبروں پر اُن سے مُرادیں مانگنے کے لیے نہیں جاتے اور نہ اُن سے دُعا کے لیے کہتے ہیں۔ ان قبروں کو متبرک سمجھ کر اُن کے پاس بیٹھ کر ذکرِ الٰہی میں مشغول ہوتے ہیں۔ فرماتے تھے کہ شریعتِ محمدیہ میں قبرستان معبد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسجد کو ذکر اور عبادت کی جگہ مقرر فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ٹھہرائے ہوئے معبد کو چھوڑ کر قبروں کے پاس بیٹھ کر عبادت کرنا غیر صحت مندانہ رجحان ہے اور شرعاً ناجائز ہے۔

سجدۂ تعظیمی

فرماتے تھے کہ سجدۂ تعظیمی شریعتِ محمدیہ میں حرام ہے اور جو لوگ قبروں کو سجدہ کرتے ہیں، وہ گناہِ کبیرہ کا ارتکاب

کرتے ہیں۔ فرماتے تھے "توحید" کی منزل سخت کٹھن ہے اور تمام انبیاء کی بعثت کا ایک عظیم مقصد انسانوں کو توحید کی معرفت بخشنا اور عملی زندگی میں توحید پر قائم رہنے کی ان میں صلاحیت پیدا کرنا تھا۔ فرماتے تھے جبتک توحید کے مندرجہ ذیل مقامات کی معرفت حاصل نہ ہو اور عملی زندگی میں اِن مقامات پر ثابت قدمی حاصل نہ ہو، اس وقت تک توحید کچی اور ادھوری ہے۔

۱ — "لَا محْبُوبَ اِلاَّ اللّٰہ"۔ یعنی محبوبِ حقیقی اللہ ہی ہے اور اس کی محبت تمام محبتوں پر غالب ہونی چاہیے۔ اس کی ذات تمام چاہتوں اور محبتوں کا مرکز و محور ہونی چاہیے۔ ہم سب کو اسی کی خاطر چاہیں، سب کو اسی کی خاطر پیار کریں اور جب اس کی محبت، اور غیروں کی محبت کے تقاضوں میں تصادم ہو تو سب کو اس کی خاطر خیر باد کہہ دیں۔

۲ — لَا مُتَصَرِّفَ فِی العَالَمِ اِلَّا اللّٰہ۔ اس جہان میں تصرف و اختیار اللہ ہی کا ہے۔ نفع و ضرر کا مالک وہی ہے۔ اگر تمام انسان مل کر چاہیں کہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچا سکیں، اگر اللہ کی مشیّت نہ ہو، تو تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکیں گے۔

۳ — لَا مَخُوفَ اِلَّا اللّٰہ۔ جب نفع و ضرر کا اللہ ہی مالک ہے، تو خوف بھی صرف اللہ ہی کا دل میں ہونا چاہیے۔ اللہ کے سوا کسی کا خوف دل میں باقی نہ رہے۔

۴ — لَا مَرْجُوَّ اِلَّا اللّٰہ۔ جب نفع و ضرر کا وہی مالک ہے، تو ہماری تمام اُمیدیں بھی اسی سے وابستہ ہونی چاہئیں۔"

فرماتے تھے: "بعض لوگ قبروں سے تو مرادیں نہیں مانگتے ہیں لیکن امراء، روساء اور حکّام کے دروازوں کی دھول چاٹتے ہیں۔ محض قبروں پر چادر نہ چڑھا کر اور چراغ نہ جلا کر یہ سمجھنا کہ توحید کے سب تقاضے پُورے ہو گئے ہیں، بہت بڑی خود فریبی ہے۔ قرآن نے جہاں بھی توحید بیان کی۔ "من دون اللہ" کے لفظ استعمال کیے۔

(۱) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ اَنْدَادًا۔ اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ سے ہٹ کر اوروں کو اس کا ہم پلّہ بنا لیتے ہیں۔

(ب) انَّ الذین تدعون من دون اللہِ عبادٌ امثالکم - اللہ کے علاوہ جن کو تُم پکارتے ہو، وہ بھی تمہاری طرح بندگانِ الٰہی ہیں۔

(ج) وَالذّین یَدعُونَ مِن دون اللہ لا یَخلُقُونَ شیاً وَھُم یُخلَقُونَ۔ اور جو لوگ اللہ کے سوا اوروں کو پُکارتے ہیں، وہ خود کسی چیز کے خالق نہیں بلکہ اُنہیں پیدا کیا گیا ہے۔ فرماتے تھے:

"مِن دُون اللہ" کے لفظ اتنے جامع ہیں کہ ان میں تمام غیر اللہ شامل ہیں۔ اس میں تمام مُردوں اور زندوں کی یکساں نفی کی گئی ہے اور زندہ خداوندوں کی نفی کرنا زیادہ کٹھن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں زندہ خداؤں کی نفی کا ذکر بہت شرح وبسط کے ساتھ کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کی نفی کیسے کی؟ حضرت مُوسیٰؑ نے فرعون کے سامنے "نعرۂ لا" کیسے لگایا؟ کتنے لوگ ہیں جنہیں موحّد ہونے کا دعویٰ ہے اور وہ توحید کی ابجد ہوز سے بھی نا آشنا ہیں۔ ظالم اور جابر حکمرانوں کے خوف کے مارے اُن کی زبانیں گنگ ہیں اور کلمۂ حق کہتے ہُوئے ہکلاتی ہیں۔ کتنے علما ہیں جو اپنے آپ کو توحید کے بُلند ترین مقام پر فائز سمجھتے ہیں اور پُوری ملّتِ اسلامیہ کو حقیر جانتے ہیں اور اُن کی توحید کا یہ حال ہے کہ حقیر ترین دنیوی اغراض کے لیے دُنیادار سرمایہ داروں کے گھروں کا طواف کرتے ہیں اور اُن کی صُبحیں اور شامیں ان کی چاپلوسی میں بسر ہوتی ہیں۔ کیا "مِن دُون اللہ" میں صرف حضرت عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت علی ہجویریؒ ہی شامل ہیں؟ کیا فاسق وفاجر حکّام اور دُنیادار سرمایہ دار "من دُون اللہ" میں شامل نہیں ہیں؟ —— یہ کیا منطق ہُوئی ...؟ توحید کا یہ تصوّر ان لوگوں نے اپنے جی سے گھڑ لیا ہے۔ کتابُ اللہ اور حدیثِ رسول اللہ کی توحید تو بڑی انقلاب آفریں ہے۔"

مقامِ رسالتؐ

حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے ساتھ والہانہ محبت تھی اور اُن کا ذکر نہایت ادب وتعظیم سے کرتے تھے۔

مقامِ رسالت بیان کرتے ہوئے حافظ ابنِ قیمؒ کا یہ قول مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔
کسی شخص نے حافظ ابنِ قیمؒ سے پوچھا کہ روضۂ اطہر افضل ہے یا کعبہ؟ تو حافظ ابنِ قیمؒ نے فرمایا:

"إنْ اردتَ مجرد الحجرة فالكعبة افضل وإن اردت وهو فيها فلا والله ولا العرش وحملته ولا جنّت عدن ولا الافلاك الدائرة لِانّ بالحجرة جسدًا لو وُزن بالكونين لرَجَحَ" [1]

(اگر تمہاری مُراد محض حجرۂ نبویؐ سے ہے تو کعبہ افضل ہے اور اگر تمہاری مُراد جسدِ اطہر سمیت روضۂ انور سے ہے تو خُدا کی قسم وہ عرش سے افضل ہے۔ حاملینِ عرش سے افضل ہے، جنّتِ عدن سے افضل ہے گردش کرنے والے افلاک سے افضل ہے؛ اس لیے کہ روضہ میں ایک ایسا جسدِ اطہر ہے کہ اگر دونوں جہانوں کے ساتھ بھی اُسے تولا جائے، تو وہ بھاری رہے۔)

خلافت کب تک رہی؟

اپنی ایک یادداشت میں "ازالۃ الخفاء" کے حوالے سے یہ حدیث نقل کی ہے۔

قال صلی اللہ علیہ وسلّم "الخلافة بعدی ثلاثون سنة ثم یکون بعد ذٰلک الملک۔" (حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے فرمایا میرے بعد خلافت تیس برس رہے گی پھر اس کے بعد ملوکیت ہوگی)

اس کے بعد ایک دوسری روایت بھی نقل کی ہے جس کے الفاظ یوں ہیں:
"ثم یکون ملکاً عضوضاً" پھر اس کے بعد ظالم بادشاہ ہوگا۔
یہ جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے فرمایا خلافت تیس برس تک رہے گی، تو حضرت

---

[1] بدائع الفوائد۔ ج۔۳ صفحہ ۱۳۵

والد علیہ الرحمۃ نے ان تیس برسوں کا حساب باضابطہ اپنی یادداشت میں یوں قلمبند کیا ہے :

		دن	ماہ	سال
ایام ابی بکر الصدیقؓ	سنتین وثلاثۃ اشھر وثمانیۃ ایام	۸	۳	۲
ایام عمرؓ	عشر سنین وستۃ اشھر واربع لیال	۴	۶	۱۰
ایام عثمانؓ	احد عشرۃ سنۃ واحد عشر شھراً وثلاثۃ عشر یوماً	۱۳	۱۱	۱۱
ایام علیؓ	اربع سنین وسبعۃ اشھر ویوماً	۱	۷	۴
ایام الحسنؓ	ثمانیۃ اشھر وعشرۃ ایام	۱۰	۸	—
		۶	۰	۳۰

اس کے بعد شاہ ولی اللہؒ کا "ازالۃ الخفاء" سے یہ قول نقل کیا ہے :

"حضرت معاویہؓ وبنو امیہ وبنو عباس ازاں خارج باشند۔"

حُبِّ اہلِ بیت

اہلِ بیت سے اُنہیں بے پناہ محبت اور عقیدت تھی۔ اپنے مقالے "اُسوۂ حسین" میں خانوادۂ نبوت کی مدح وتوصیف میں یوں رقمطراز ہیں :

"اس میں کوئی شک نہیں کہ اہلِ بیت کی محبت کے پاکیزہ جذبات اور مخلصانہ ولولے ایک مومن قانت اور مسلم صادق کی زندگی کی ایک قیمتی متاع ہے اور یہ صحیح ہے کہ اس محبت اور شیفتگی کا سرچشمہ فی الحقیقت وہ محبت وعقیدت ہے جو اس مقدس ومطہر وجود سے متعلق ہے جس کو خدا نے تمام کائناتِ انسانی میں ہر طرح کی محبوبیت کے لیے چن لیا پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ جس خاندانِ نبوت کو خدا نے قرآنِ کریم میں مخاطب کر کے ان کی طہارت اور پاکیزگی کا اعلان کیا ہو :

"انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم

تَطۡهِيۡرًا ۔" (سورۂ احزاب)

(اے اہلِ بیت! خدا کو تو بس یہی منظور رہے کہ تُم سے ہر قسم کی میل کچیل دُور کردے اور تم کو ایسا پاک وصاف کردے جیسا پاک وصاف ہونے کا حق ہے)

اور جن کی عزّت وعظمت کا یہ عالم ہو کہ قرآنِ کریم میں مُسلمانوں کو ان پر صلوٰۃ وسلام بھیجنے کا حکم دیا گیا ہو:

"اِنَّ اللہ وَمَلائکتہ یُصَلُّوۡنَ علی النبیّ یا ایُّھا الذیۡن آمَنُوۡا صَلُّوۡا علیہ وَسَلِّمُوۡا تسلیماً ۔"

(اللہ اور اُس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے رہتے ہیں۔ مسلمانو! تُم بھی اس پر درود وسلام بھیجتے رہو)

جس کی تشریح کے لیے ایک صحابی نے آپؐ سے دریافت کیا:

اَمَرَنَا اللہُ ان نصلّی علیکَ یا رسُول اللہِ فکیفَ نُصلّی علیکَ ۔"

(ہمیں اللہ نے آپؐ پر درود بھیجنے کا حکم دیا ہے، ہمیں بتائیے کہ کس طرح آپؐ پر درود بھیجا کریں۔)

آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا، یوں کہو:

"اللّٰھُمَّ صلِّ علیٰ محمدٍ وعلیٰ آلِ محمدٍ کما صلّیتَ علیٰ آلِ ابراھیمَ وَ بارِکۡ علیٰ محمدٍ وعلیٰ آلِ محمدٍ کما بارکتَ علیٰ آلِ ابراھیمَ انکَ حمیدٌ مجیدٌ۔"

(صحیح مسلم۔ ج۔ اوّل)

اور جن کی محبّت ومودّت اس درجہ مطلوب ومنظور ہو کہ قرآنِ کریم میں اس کے لیے یُوں ارشاد ہو:

"قُل لا اَسۡئلُکُمۡ علیہِ اجراً اِلاَّ المودّۃَ فی القربیٰ ۔" —— آپؐ اس کا اعلان کردیجئے کہ مَیں تم لوگوں سے تبلیغِ رسالت پر کوئی مزدوری نہیں مانگتا، مگر اقرباء

کی محبّت ۔"

اور جن کے عزّ و شرف کا یہ مقام ہو کہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ آپؐ نے ان کا ذکر کیا ہو:

"وَ اَنَا تَارِکٌ فِیکُم الثَّقلَینِ ۔ کِتَابُ اللّٰہِ وَ اَھلُ بَیتِی۔" (صحیح مسلم)

(میں تم میں دو بزرگ ترین چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں ۔ ایک اللہ کی کتاب، دُوسرے اہلِ بیت ۔)

اور جن کی محبوبیت کا یہ حال ہو کہ آپؐ ان کے متعلق فرمائیں:

"ھٰذَانِ ابنَایَ وَ ابنَا ابنَتِی اَللّٰھُمَّ اِنِّی اُحِبُّھُمَا فَاحِبَّھُمَا وَ اَحِبَّ مَن یُحِبُّھُمَا ۔" (ترمذی)

(یہ حسنؑ اور حسینؑ میرے بیٹے اور میری بیٹی کے بیٹے ہیں ۔ یا اللہ! مَیں ان سے محبّت رکھتا ہوں، تو بھی ان کو اپنا محبوب بنا اور جو ان سے محبت کرے اس سے بھی تو محبّت کر ۔)

اور جن کے فضل و شرف کے لیے بابِ کعبہ کو تھام کر آپؐ نے یہ مثال دی ہو:

"الا اِنَّ مَثَل اَھلَ بیتِی فیکم مَثَلُ سفینتِ نُوحٍ من رکبھا نجا و من تَخَلَّفَ عَنھَا ھَلَکَ ۔" (مسند امام احمد عن ابی ذرؓ)

(دیکھو! میرے اہل بیت کی مثال تُم میں کشتئ نوحؑ کی طرح ہے، جو اس میں سوار ہوا وہ بچ گیا، جو اس سے دُور رہا ہلاک ہو گیا)

اور جن کے احترام کو قائم رکھنے کے لیے یہ وصیّت فرمائی ہو:

وَ لَن یَتَفَرَّقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الحَوضَ فَانظُرُوا کَیفَ تَخلُفُونِی فِیھِمَا ۔" (ترمذی)

(دیکھو! کتاب اللہ اور میری اولاد (اہل بیت) دونوں ایک دُوسرے سے جُدا نہیں ہوں گے تا آنکہ حوضِ کوثر پر میرے پاس پہنچ جائیں ۔ پس خیال رکھنا کہ

میرے بعد تم ان سے کس طرح کا سلوک کرتے ہو)

پس جس خاندانِ نبوّت کی محبوبیّت اور محمودیّت کا یہ مرتبہ ہو اس کی محبّت و عشق میں جتنی بھی گھڑیاں کٹ جائیں اور جتنی بھی راتیں آنکھوں میں بسر ہوں اور اُن کی تعریف و توصیف میں جس قدر بھی زبانیں زمزمہ پیرا ہوں، یقیناً رُوح کی سعادت اور دل کی طہارت اور انسانیّت کا حاصل ہے[1]۔"

امام حسینؑ علیہ السلام سے عقیدت

حضرت امام حسین علیہ السلام کا ذکر والہانہ شیفتگی سے کرتے اور اُن کی تنقیص کرنے والوں سے اُنہیں شدید کراہت تھی۔ امام حسین علیہ السلام سے ان کی محبت و عقیدت کا اندازہ ان کے مقالے "اُسوۂ حسینؑ" کی ابتدائی عبارت سے کیا جا سکتا ہے:

"سیدنا و امامنا حُسین بن فاطمہ بنت رسُول اللہ (صلوٰۃ اللہِ و سلامہٗ علیہم اجمعین) کی شہادت کا واقعہ جو شریعت محمدیہؐ کی بے شمار بصیرتیں اپنے اندر پنہاں رکھتا تھا، افسوس کہ وہ بھی افراط و تفریط کی دست درازیوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ افسوس کہ ماتمی مجالس کی چیخ پکار اور ماتمیوں کی سینہ کوبی کے شور میں اس کی صدائے عبرت انگیز گم ہو گئی۔ آہ! اشکبار آنکھوں کے آنسوؤں کے سیلاب میں اس کا سارا سامانِ عبرت و بصیرت بہ گیا۔ افسوس! اس کی ساری عظمت و بزرگی تعزیوں کے ساتھ ہی زمین میں دفن کر دی گئی۔ آہ! دُشمن اور دوست دونوں نے اس کے ساتھ بے انصافی کی۔ دُشمن نے اس واقعہ شہادت پر خوشیاں منائیں اور اس کی عظمت کو اپنے جور و استبداد کے زور سے مٹانے کی کوشش کی، لیکن دوست نے بھی اس کے حقیقی شرف سے غفلت برتی اور مختلف بدعات اور شرکیہ رسوم کے تاریک پردوں میں اس کو چھپایا۔ دُشمنوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا کہ اس کی دعوتِ حق اور صبر و استقامت اور جہاد فی سبیل الحریت کو بُری شکل میں پیش کیا، لیکن دوست نے دوست ہو کر بھی اس کی دعوت قبول نہ کی اور

[1] اُسوۂ حسینؑ صہ ۶ تا ۱۱ مطبوعہ جمعیت اہلحدیث قصور۔ ضلع لاہور

اس کے صبر و استقامت کو نہ سمجھا اور ان تمام جاہلانہ رسموں کی تقلید کی جن سے خود سید الشہداء اور ان کے جدِ امجد علیہم الصلوٰۃ والسّلام نے منع فرمایا تھا۔

پس آیئے کہ دُنیا کی مجالسِ ماتم میں ایک نئے حلقۂ ماتم کا اضافہ کریں اور زخم رسیدہ دِلوں کو خون آلودہ آنسوؤں کا چشمہ بنانے کی بجائے خود واقعۂ شہادت کو اسرارِ شریعت کا سرچشمہ بنائیں اور حضرت امام کی شہادت کے تذکار میں ایسی مجلس منعقد کریں جو عبرت و بصیرت کا پُورا سامان اپنے ساتھ رکھتی ہو۔ جو واقعۂ شہادت کی حقیقی عظمت کو پورے طور پر بے نقاب کر دے۔ جو سینہ کوبی اور ماتمی بین کی چیخ پکار کی بجائے صبر و برداشت، عزیمت و استقامت، ایثار و قُربانی، جاں نثاری و فدائیت اور شہادت و فنافی سبیل الحریت کا درس دے"۔ ؎۱

بزرگوں کا ادب

بزرگوں کا غایت درجہ ادب فرماتے تھے اور اُن کا نام نہایت احترام سے لیتے تھے۔ اگر کوئی بزرگوں کی شان میں گستاخی کرتا یا کسی امام کا نام لیتے ہوئے آداب کو ملحوظ نہ رکھتا تو سخت برہم ہوتے اور بعض حالتوں میں طبیعت اس قدر مکدر رہتی کہ اُس آدمی سے گفتگو ہی موقوف فرما دیتے۔ ائمۂ کرام اور اولیاء اللہ کے ادب پر ہر سال دو چار خطبے ضرور دیتے تھے۔ اُنکی آواز میرے کانوں میں اب بھی گُونج رہی ہے۔ وہ مولانا رومؒ کا یہ شعر پڑھتے:

از خُدا خواہیم توفیقِ ادب　　　بے ادب محروم ماند از فضلِ رب

(ہم خدا سے ادب کی توفیق چاہتے ہیں۔ بے ادب اللہ کے فضل و کرم سے محروم ہے)

یہ بھی فرماتے کہ حضرت خواجہ محمد پارسا رحمۃ اللہ علیہ نے وصیت کی تھی:

اندر رہِ حق جملہ ادب باید بود　　　تا جاں باقی است در طلب باید بود

؎۱ اسوۂ حُسینؓ صد ۵، ۶۔ مطبوعہ جمعیت اہلحدیث قصور ضلع لاہور

در ہر دم گر ہزار دریا بخشی کم باید بود خشک لب باید بود

(اللہ کی راہ میں سراپا ادب رہنا چاہیے جب تک جسم میں جاں باقی ہے، تلاش جاری رہنی چاہیے۔ اگر ہر سانس میں فیضان کے ہزار دریا بھی تو پی جائے تو پھر بھی کم ہے اور ہونٹ خشک رہنے چاہئیں۔)

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کا جو ادب اور احترام کرتے تھے، بڑے ذوق وشوق سے بیان فرماتے۔ اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے صاحب زادوں کے نام حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ایک خط کی یہ عبارت سناتے:

"ایں فقیر از سر تا قدم غرقِ احسانہائے والدِ بزرگوارِ شما است۔ دریں طریق سبقِ الف ب را از ایشاں گرفتہ است و تہجی حروف ایں راہ را از ایشاں آموختہ۔"[1]

(یہ فقیر سر سے پاؤں تک آپ کے والدِ ماجد کے احسانات میں ڈوبا ہوا ہے اور اس راستے میں ابجد ہوز بھی انہی سے حاصل کی تھی)

"اگر در مدتِ عمر سرِ خود را پائمال اقدام خدمۂ عتبۂ علیۂ شما کردہ باشد ہیچ نہ کردہ باشد۔"[2]

(اگر زندگی بھر آپ کے آستانۂ عالیہ کے خادموں کے پاؤں تلے اپنے سر کو پامال کروں تو بھی نیازمندی کا حق ادا نہیں ہوتا)

فرماتے کہ شیخ علاؤ الدین سمنانی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ اپنے مشائخ سے ایک اعتبار سے آگے نکل گئے تھے مگر فرماتے یہی تھے:

"اگر سرِ من بآسماں ساید، ہنوز خاکِ آستانۂ مشائخ من بالا باشد۔"

(اگر میرا سر آسمان سے بھی جا لگے، تو میرے مشائخ کے آستانے کی خاک بھی مجھ سے برتر ہے)

---

[1]، [2]۔ مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ ص ۲۶۶ دفتر اوّل

فرماتے تھے کہ بزرگوں سے اختلاف بھی کیا جائے تو نہایت ادب اور تواضع سے اختلاف کرنا چاہیے۔ حضرت مجدّد علیہ الرحمہ کس قدر ادب، اور سلیقے سے اختلافِ رائے کا اظہار فرماتے تھے۔ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

"من کمینہ خوشہ چینِ خرمنہائے دَولِ ایشانم و رذیلے زلّہ بردارِ خوانہائے نِعَمِ ایشاں ..... امّا چہ تواں کرد کہ حقوق خداوندی جل سلطانہ فوق حقوق ایشانست۔[1]"

(یہ بندۂ کمینہ انہی کے رُوحانی خرمنوں کا خوشہ چیں ہے اور انہی کی نوازشوں کے دسترخوان کا اُلش کھانے والا ہے .... مگر کیا کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق اُن کے حقوق سے بڑھ کر ہیں)

پھر حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فقرہ بھی اکثر نقل فرماتے تھے:

"بعضے از بزرگاں می گویند کہ ایں بدعتِ حسنہ است و ایں بدعتِ سیّئہ است اما فقیر با ایشاں موافقت نہ دارد۔"

(بعض بزرگ کہتے ہیں کہ ایک بدعتِ حسنہ ہے اور ایک بدعتِ سیئہ ہے، لیکن فقیر ان بزرگوں سے اتفاق نہیں کرتا)

---

[1] مکتوبات حضرت مجدّد الف ثانیؒ حصہ ششم دفتر دوم صہ ۱۰۵

مسائلِ تصوّف

تصوّف کیا ہے ؟

حضرت مجددؒ سے طبعی مناسبت

طریقت شریعت کا جز ہے

مسائل متفرقۂ تصوّف

اشغال صوفیہ کی شرعی حیثیت

لطائف کی حقیقت اور تعداد

لطائف ستّہ

الاوہی القلب کی تشریح

ذکر لسانی افضل ہے یا ذکر قلبی

بیعت طریقت

کشف و کرامات

توجّہ اور تصرّف

یوں تو شب خیزی، تہجد گزاری اور کثرتِ ذکر زندگی بھر آپ کا معمول رہا، مگر آخری عمر میں وہ ہمہ تن اور ہمہ دل اللہ کی طرف متوجہ تھے اور تصوّف کی طرف اُن کا میلان بہت بڑھ گیا تھا۔ آخری علالت سے قبل تصوّف کے بعض عنوانوں پر چند مقالے تحریر فرمائے۔ ان میں سے بعض مقالے عربی میں ہیں اور بعض اُردو میں۔

ان مکالمات کی روشنی میں جو اس موضوع پر ان کے ساتھ وقتاً فوقتاً ہوئے اور اُن مقالوں کی روشنی میں مختلف مسائلِ تصوّف پر اُن کے رجحانات کی وضاحت کی جاتی ہے۔

تصوّف کیا ہے؟

"مسائلِ متفرقہ تصوّف" میں لکھتے ہیں:

"تصوّف لوٹنے پوٹنے کا نام نہیں ہے بلکہ مقامات کا نام تصوّف ہے اور مقامات یہی ملکات ہیں — اخلاص، رضاء، تواضع وغیرہ۔ ان کو حاصل کرو اور ان کے اضداد، ریا و کبر، حسد و بغض، حرص، طول امل سے باز رہو، بس صوفی ہو گئے۔" صفحہ ۱۰

"مسائل متفرقہ تصوّف" میں لکھتے ہیں:

"یاد رکھو اصل مقصد تصوّف سے یہ ہے۔ اعمالِ شرعیہ یعنی طاعتِ واجبہ و مستحبہ کا بجالانا اور معاصی سے اجتناب کرنا۔ یہ بندہ کی طبیعتِ ثانیہ بن جائے۔ بس یہ وہ چیز ہے جس سے قرب و رضائے حق حاصل ہوتی ہے۔ کیفیات و کشفیات کا اس سے

کچھ تعلق نہیں۔ اگر ایک شخص ادائے طاعت و اجتناب عن المعاصی میں پختہ ہو، وہ کامل صوفی ہے۔ گو کیفیات کچھ بھی اس پر وارد نہ ہوتی ہوں اور جس پر کیفیات بکثرت وارد ہوتی ہوں، کشف و تصوّف میں ملکہ رکھتا ہو، مگر اوامر و نواہی میں پختگی حاصل نہ ہو، وہ صوفی نہیں۔" (ص۔۲)

حضرت مجدد سے طبعی مُناسبت

حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے ساتھ انہیں طبعی مُناسبت بہت تھی۔ اور اُن کے مکتوبات کا مطالعہ بڑے التزام سے کرتے تھے۔ مکتوبات کا وہ نسخہ جو اُن کے زیرِ مطالعہ رہا راقم الحروف کے پیشِ نظر ہے۔ سُرخ پنسل سے جگہ جگہ عبارتیں نشان زدہ ہیں بالخصوص وہ عبارتیں جن میں اتباعِ سُنّت پر حضرت مجدّد صاحبؒ نے زور دیا ہے۔ حضرت والد علیہ الرحمہ نے اُن عبارتوں کو مکتوبات کی دونوں جلدوں کے شروع میں خالی صفحات پر قلمبند بھی کیا ہے۔ ان میں سے اکثر عبارتیں اُنہیں زبانی یاد تھیں اور خطبوں کے دَوران بڑی محبّت اور عقیدت کے ساتھ ان عبارتوں کو حرفاً حرفاً نقل کیا کرتے تھے۔ اُن میں سے بعض عبارتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔ اِن عبارتوں سے تصوّف کے بارے میں اُن کے رجحانات کے تعین میں مدد ملے گی۔

"طریقت و حقیقت کہ صوفیہ بآں مُمتاز گشتہ اند، ہر دو خادمِ شریعت اند۔
کوتہ اندیشاں احوال و مواجید را از مقاصد مے شمرند و مشاہدات و تجلّیات را
از مطالب مے انگارند۔ لاجرم گرفتارانِ زندانِ وہم و خیال می مانند .....
از کمالاتِ شریعت محروم میگردند۔"[1]

(طریقت و حقیقت کہ صُوفیاء اس سے مُمتاز ہیں، دونوں خادمِ شریعت ہیں۔ کوتاہ نظر کیفیات، اور وجد کو منزلِ مقصود سمجھتے ہیں اور مشاہدات و تجلّیات کو مطالب شمار

---

[1] مکتوبات ج۔۱ صہ ۹۸ مکتوب ۳۶

کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے ہی توہّمات میں گرفتار اور شریعت کے کمالات سے محروم رہ جاتے ہیں)

"بعد از طیّ منازلِ سلوک و قطعِ مقاماتِ جذبہ معلوم شد کہ مقصود ازیں سیر و سلوک تحصیلِ مقامِ اخلاص ست ... وایں اخلاص جزویست از اجزائے شریعت چہ شریعت راسہ جزواست علم و عمل و اخلاص ..... امّا فہمِ ہر کس ایں جا نہ رسد۔ اکثر عالم بخواب و خیال آرمیدہ اند و بجوز و مویز اکتفا نمودہ انداز کمالات شریعت چہ دانند و بہ حقیقتِ طریقت و حقیقت چہ وارسند۔ شریعت را پوست خیال می کنند و حقیقت را مغز می دانند۔ نمی دانند کہ حقیقتِ معاملہ چیست، بہ تُرّہاتِ صوفیہ مغرور اند و بہ احوال و مقامات مفتون۔ ھَدَاھُمُ اللّٰہُ سُبحانَہٗ سَوَاءَ الطریق"[1]

(سلوک کے منازل اور جذب کے مقامات طے کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ سیر و سلوک سے مقصد مقامِ اخلاص کا حصول ہے .... اور یہ اخلاص شریعت کے اجزاء میں سے ایک جز ہے۔ شریعت کے تین جز ہیں۔ علم، عمل اور اخلاص ... ہاں البتّہ ہر شخص کے فہم کی رسائی اس بات تک نہیں، اکثر خواب و خیال کی دُنیا میں مگن ہیں اور ذرا سے رُوحانی فائدے پر اُنہوں نے قناعت کر لی ہے۔ شریعت کے کمالات ہی کو نہیں جانتے طریقت و حقیقت کی حقیقت کیا سمجھیں گے۔ شریعت کو چھلکا سمجھتے ہیں اور حقیقت کو مغز جانتے ہیں۔ حقیقت حال سے ناآشنا ہیں۔ صُوفیا، کی شطحیّات نے انہیں خود فریبی میں مُبتلا کر رکھا ہے اور احوال و مقامات کے فریفتہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سیدھی راہ کی ہدایت دے)

سلسلۂ نقشبندیہ کی طرف ان کا طبعی رجحان بہت تھا۔ طریقۂ نقشبندیہ کی تعریف میں

---

[1] مکتوب ۴۰۔ ج ۱ ص ۱۰۴

مکتوبات کی اس عبارت کو سُرخ پنسل سے نشان لگایا ہے:

"اکابر طریقۂ علیۂ نقشبندیہ قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم التزامِ متابعتِ سنّتِ سنیّہ نمودہ اند و اختیارِ عمل بعزیمت فرمودہ اگر بایں التزام و اختیار ایشاں را باحوال و مواجید مشرّف سازند نعمتِ عظیم می دانند و اگر احوال و مواجید بایشاں بدہند و دریں التزام و اختیار فتورے یابند آں احوال را نمے پسندند و آں مواجید را نمی خواہند و دراں فتور جز خرابیٔ خود ہیچ نمی دانند زیرا کہ برہمان و جوگیانِ ہند و فلاسفۂ یونان از قسم تجلّیاتِ صوری و مکاشفاتِ مثالی و علوم توحیدی بسیار دارند امّا غیر از خرابی و رسوائی نتیجہ آن ندارند و جُز بعد و حرمان نقدِ وقتِ شان نیست۔"[1]

(اکابر طریقۂ نقشبندیہ اتباعِ سنّت کا التزام کرتے ہیں اور رخصت کی بجائے عزیمت پر عمل کرتے ہیں۔ اگر اتباعِ سُنّت کا التزام کرتے ہُوئے انہیں کیفیات و احوال سے مشرّف فرمائیں تو اسے نعمتِ عظمیٰ جانتے ہیں اور اگر کیفیات و احوال کے وارد ہونے سے اتباعِ سُنّت میں کوتاہی ہونے لگے، تو اُن کیفیات و احوال کو پسند نہیں کرتے اور اُن احوال کے خواہاں نہیں ہوتے اور اتباعِ سُنّت میں سُستی کو اپنے لیے خرابی کا باعث جانتے ہیں۔ اس لیے کہ ہندوستان کے برہمن اور جوگی اور یونان کے حکماء کو بھی تجلّیاتِ صوری، مکاشفاتِ مثالی اور علومِ توحیدی سے حصّۂ وافر حاصل ہے، لیکن خرابی و رسوائی اور بُعد حرماں کے سوا انہیں کچھ حاصل نہیں ہُوا)

ایک دن مجھ سے فرمایا:

"شریعت کا وہ حصّہ جو تزکیۂ باطن سے متعلق ہے۔ اصطلاحاً تصوّف کہلاتا ہے۔"

فرماتے تھے:

---

[1] مکتوبات دفترِ اوّل حصّہ چہارم مکتوب ۲۳۷

"حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے بعثت کے بعد جو کام سرانجام دیا، قرآن مجید اُسے متعدد جگہوں پر یُوں بیان کرتا ہے: یَتْلُو علیھم آیاتہٖ وَیُزکیھم وَ یُعَلِّمُھُم الکتاب والحکمۃ —— یہ جو بار بار خدا کہتا ہے: "یزکیھم" یعنی وہ اُن کا تزکیہ کرتے ہیں۔ اسی تزکیہ کے اصول و آداب کو ہم طریقت یا تصوّف سے تعبیر کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہماری درسگاہوں میں تعلیم کتاب وحکمت کا تو اہتمام کیا جاتا ہے لیکن تزکیۂ نفس جس کا ذکر قرآن مجید تعلیمِ کتاب وحکمت کے علاوہ الگ مستقل بالذّات بار بار کرتا ہے، اس کا قطعی طور پر کوئی اہتمام نہیں۔"

مَیں نے اُن سے پُوچھا: کیا تصوّف کی مروّجہ اصطلاحات کا استعمال آپ کے نزدیک درست ہے؟" تو حضرت نے فرمایا:

"جیسے محدّثین کی اصطلاحات ہیں، فقہاء کی اصطلاحات ہیں، صرفیوں اور نحویوں کی اصطلاحات ہیں، اسی طرح تزکیۂ نفس کا علم جب باضابطہ طور پر مرتّب اور مدّون ہُوا تو اصطلاحات ناگزیر تھیں۔"

ایک دن فقہ اور تصوّف میں فرق بیان کرتے ہُوئے فرمایا:

"بات بڑی سیدھی ہے۔ وضو کن باتوں سے ٹوٹتا ہے؟ نماز کن باتوں سے باطل ہوتی ہے؟ یہ فقہ ہے اور نماز میں حضور کیسے حاصل ہو؟ رقّت اور خشیت کیسے حاصل ہو اور سینے سے چکّی کے چلنے کی آواز کیسے آئے؟ یہ تصوّف ہے اور دونوں کا ماخذ کتاب وسُنّت ہے۔"

اشغالِ صُوفیہ کی شرعی حیثیت

مَیں نے ایک روز اُن کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ جو صوفیاء کے ہاں لطائف کی مشق ہے، نفی اثبات کا مخصوص طریقہ ہے یا حبسِ دم کا شغل ہے، کیا یہ بدعات ہیں؟ تو حضرت نے فرمایا:

"یہ بزرگانِ کرام کا اجتہاد ہے۔"

مَیں نے عرض کیا: اِس اجتہاد کی علّت کیا ہے؟

فرمانے لگے: نزولِ انوار دافعِ وساوس ہوتا ہے، پھر انوارِ رسالت بالخصوص انوارِ رسالتِ محمدیہ بدرجۂ اتم دافعِ وساوس تھے۔ جب انوارِ رسالت منقطع ہو گئے، تو وساوس اُبھرنے لگے اور عبادت میں جمعیتِ خاطر اور یکسوئی باقی نہ رہی۔ قرآن کے اس حکم پر عمل مُشکل ہوا کہ اُٹھتے بیٹھتے پہلو بدلتے ہُوئے اللہ کا ذکر کرو۔ حدیث میں ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے تھے۔ انوارِ رسالت کے منقطع ہو جانے کی وجہ سے دوامِ ذکر ممکن العمل نہ رہا۔ پس دوامِ ذکر حاصل کرنے کے لیے اور عبادت میں جمعیّتِ خاطر اور یکسوئی پیدا کرنے کے لیے بزرگانِ کرام نے اجتہاد کیا۔" فرمایا: اگر معاملات میں اجتہاد ہو سکتا ہے تو عبادات میں جمعیتِ خاطر پیدا کرنے کے لیے اجتہاد کیوں نہیں ہو سکتا۔ پھر ایک اور شام بندۂ عاجز ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں بتایا کہ بعض علماء سے اشغالِ صوفیہ پر مجھے گفتگو کا اتفاق ہوا ہے اور وہ انہیں بدعات اور محدثات قرار دیتے ہیں۔

حضرت والد علیہ الرحمہ کی پیشانی پر شکن پڑ گئی اور فرمانے لگے:

"ان علماء کا ذہن صاف ہونا چاہیے۔ جب وہ ان اشغال کو بدعات قرار دیتے ہیں، تو دُوسرے لفظوں میں وہ معاذ اللہ —— خاکم بدہن یہ کہتے ہیں کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ بدعتی تھے، حضرت مجدّد الف ثانیؒ بدعتی تھے، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ سب بدعتی تھے۔ ایک طرف تو یہی علماء ہندوستان میں اپنی تاریخ کا آغاز ان ہی بزرگوں سے کرتے ہیں اور ان کے ساتھ نسبت ملاتے ہیں، دُوسری طرف ان بزرگوں کے اجتہادات کو بدعت قرار دیتے ہیں۔ اس منطقی تضاد سے انہیں نجات پانی چاہیے۔"

معارف اللطائف میں یُوں رقمطراز ہیں :

" صوفیائے کرام کے اشغال کو بعض حضرات اس لیے پسند نہیں کرتے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے یہ منقول نہیں، لیکن اگر ذرا دقتِ نظر سے یہ حضرات دیکھتے تو ان پر یہ واضح ہو جاتا کہ صحابۂ کرامؓ کو ان اشغال و مراقبات کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ ان کو سیّد الانبیاء والمرسلین کی صحبت کے فیوض سے بہرہ ور اور آپ کے انفاسِ طیبہ کی برکات سے مستفیض ہونے کی سعادت حاصل تھی اور اس فیضان کی وجہ سے صحابۂ کرام کے قلوب و اذہان ایسی قوی اور کامل استعداد کے مالک تھے کہ اُن کو ان اشغال و مراقبات کو واسطۂ مقصود بنانے کی ضرورت نہ تھی۔ فرائض و سنن کی بجا آوری، محرّمات بلکہ مشتبہات سے اجتناب ہی ان اشغال وغیرہ کے ثمرات کے حصول کیلئے کافی تھے

اس کی مثال یُوں سمجھیے کہ علوم مروّجہ (صرف و نحو اور مرتّب فقہ و اصولِ فقہ) صحابۂ کرام کے عہدِ مبارک میں مدوّن نہیں ہُوئے تھے کیونکہ عرب ہونے کی وجہ سے وہ قواعد صرف و نحو کے محتاج نہ تھے اور عام مسائل دریافت کرنے میں آپ کی ذات بابرکات ہی کافی تھی لیکن بعد میں جب اسلام جزیرۃ العرب سے نکل کر عجم میں پہنچا اور خاص آپ کی ذاتِ اقدس سے بُعد ہوتا چلا گیا، ہر قسم کی ظاہری اور باطنی ضروریات اور حلِّ مشکلات کے لیے تدوینِ علوم کی ضرورتوں کا احساس ہوتا گیا۔ علماء کرام اور ائمۂ ہُدیٰ نے بہت جلد باحسن وجوہ ان ضرورتوں کو پُورا کیا۔ محدّثین جمع و تدوینِ حدیث اور فقہ الحدیث کے مرتّب کرنے، فقہا قانونِ اسلام کے مدوّن کرنے اور اصول احکام کے مرتّب کرنے کی طرف متوجّہ ہو گئے اور بعض اہلِ علم نے امانتِ باطنی کی حفاظت اور اس کی اصلاح کی طرف اپنی توجہات کو منعطف کیا، جن کی برکت سے اصلاحِ نفس، تزکیۂ نفس اور مجاہدۂ نفس کے قواعد مرتّب ہُوئے اور دُنیا ان کے فیوض و برکاتِ رُوحانی سے مستفیض ہُوئی۔ جزاھم اللہ عنّا وعن سائر المسلمین احسن الجزاء۔" ص ۱۸، ۱۹

اس مقالے کے آخری لفظ سُنیے اگر گوشِ نصیحت نیوش ہے۔

"بہر حال ہم لوگ بُعدِ زمانۂ نبوّت کی وجہ سے ضعیف الاستعداد اور دُنیا کے ظاہری حسن وجمال سے بہت متأثر اور ضعیف الایمان ہیں۔ اس لیے ہم جیسے لوگوں کو تزکیۂ نفس اور وصول الی اللہ (جو ثقلین کی پیدائش کی حکمتِ اصلیہ ہے) کے لیے ان وسائل و تدابیر کی شدید ترین حاجت ہے اور تجربہ اس کا شاہد ہے۔" (صفحہ ۱۹)

لطائف کی حقیقت اور تعداد

"معارف اللطائف" میں لکھتے ہیں:

"حکماء اور صُوفیہ دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ انسان مرکّب تو ضرور ہے۔ لیکن اس کے تمام اجزاء مادّی نہیں بلکہ بعض اجزا مادّی ہیں اور بعض غیر مادّی۔ اس کے بعد ان میں یہ اختلاف نظر آتا ہے کہ حکماء صرف نفس ناطقہ کے غیر مادی ہونے کے قائل ہیں۔ صوفیا کے نزدیک اجزاء غیر مادی متعدد ہیں اور صرف نفس ناطقہ ہی نہیں بلکہ پانچ جزو غیر مادّی ہیں۔ صوفیا کے نزدیک انسان دس اجزاء سے مرکب ہے۔ پانچ مادی اور پانچ غیر مادی ہیں۔ مادی اجزاء انسانی یہ ہیں: عناصر اربعہ۔ "آب، خاک، ہوا اور آگ" اور نفس کے غیر مادی اجزاء یہ ہیں: قلب، روح، سرّ، خفی اور اخفیٰ۔ انہی اجزاء خمسہ مجردہ یعنی غیر مادیہ کا نام لطائف خمسہ ہے۔

لطائفِ ستّہ

بعض صوفیا اپنی اصطلاح میں ان میں نفس کو بھی شامل کر لیتے ہیں اور مجمُوعہ کو لطائف ستّہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ آج کل یہی نام مشہور ہیں۔ حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں اکثر لطائفِ خمسہ کا عنوان نظر آتا ہے۔ صحیح یہی ہے کہ لطائف خمسہ ہی ہیں۔ جن بزرگوں نے نفس کو بھی ان لطائف کے ساتھ شمار کیا ہے اُنہوں نے تغلیباً ذکر کیا ہے جیسا کہ قمرین اور عمرین وغیرہ (شمس و قمر اور ابوبکرؓ و عمرؓ کے لیے) میں تغلیباً کہا جاتا ہے۔ چونکہ

مولینا داؤد غزنوی رحؒ کی تحریر کا عکس

"معارف اللطائف" کا ایک اقتباس

پ متفرق نوادرات د ر اشغال صوفیہ کی شرعی حیثیت)

صوفیا لطائف خمسہ کے ساتھ نفس کے آثار و احوال سے بھی بحث کرتے ہیں، اس لیے بعض بزرگوں نے مقاصدِ تصوّف کے لحاظ سے نفس کو تغلیباً لطائف میں شمار کر کے لطائف ستہ قرار دیئے ہیں۔" صفحہ ۱،۲

مشائخِ نقشبند کے ہاں لطائفِ خمسہ میں سے ہر لطیفہ کو علیحدہ علیحدہ ذاکر بنانے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ صرف قلب سے ذکر کی مشق کی جائے اور محض لطیفۂ قلب کے مسلسل اور پیہم ذکر سے وہ تمام ثمرات اور نتائج حاصل ہو جاتے ہیں جو لطائف کی مشق سے حاصل کیے جاتے ہیں[1]۔ یہ حضرات لطائف کی طرف تفصیلی توجہ کو حجاب سمجھتے ہیں۔

مشائخ کا اختلاف تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد حضرت والد علیہ الرحمۃ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے طریقے کو ترجیح دیتے ہیں حضرت لکھتے ہیں۔

"احادیث میں ایسے امور کے سلسلہ میں صرف قلب ہی کا ذکر آتا ہے اور چونکہ لطائف کا شغل رکھنے والے حضرات کے نزدیک لطائفِ خمسہ میں باہم اِتصال ہے، اس لیے صرف ذکرِ قلب سے ہی بقیہ لطائف میں آثار و افعال مذکورہ سرایت کر جاتے ہیں کیونکہ یہ مرایا متعاکسہ کی طرح ہیں۔" صفحہ ۵

اس کے بعد "معارف اللطائف" میں یہ بحث کی گئی ہے کہ لطیفۂ قلب اور قلبِ صنوبری (مضغہ، لحم) کا آپس میں کیا تعلق ہے اور اِس مشہور حدیث شریف کی تشریح کی گئی ہے کہ جسم میں ایک لوتھڑا ہے جب سنور جاتا ہے تو سارا جسم سنور جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے اور دیکھو وہ دل ہے۔

فرماتے ہیں:

"اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرات صوفیا کے نزدیک

---

[1] بحوالہ اشرف المسائل صفحہ ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴

قلب صنوبری (مضغۂ لحم) اور شے ہے اور وہ قلب جو لطیفہ ہے، دُوسری چیز ہے۔ قلب صنوبری جسد ظاہری کا جزو ہے اور وہ قلب جو لطیفہ ہے اس کا تعلق قلب صنوبری سے افاضۂ آثار و انوار کا ہے۔ جیسے حکماء بیان کرتے ہیں کہ نفس ناطقہ مجرّد ہے اور جزو بدن نہیں مگر اس کا تعلّق بدن سے تصرّف و تدبیر کا ہے۔ ایسے ہی بقیہ لطائفِ اربعہ کا بھی خاص خاص مقامات جسم سے ایسا ہی تعلّق ہے۔ اسی تعلّق کی وجہ سے جب ذاکر لطائف سے ذکر کرنا چاہتا ہے تو اُن لطائف کے خاص خاص مقامات کی جانب جن کو ان لطائف سے تعلق ہے، توجہ کرتا ہے۔ اسی لیے جب لطیفۂ قلب کو ذاکر بنایا جاتا ہے، تو قلب صنوبری کی جانب توجّہ کی جاتی ہے۔ علیٰ ہٰذالقیاس دُوسرے لطائف بھی۔ صفحہ (۵)

اِلاّ وھی القلب کی تشریح

"حدیث شریف میں ہے: "اِنّ فی الجسد لمضغة اذا اصلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وهی القلب"۔ اس کی بنا پر یہ شبہ وارد ہو سکتا ہے کہ جس قلب کی اصلاح سے سارے جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے، اسے مضغة فرمایا، تو یہ تو قلبِ صنوبری ہوا، نہ کہ لطیفۂ قلب۔ اس کے متعلّق حضرات مشائخ نے یہ فرمایا ہے کہ اس میں شک نہیں کہ حدیث میں "قلب" سے مراد گو لطیفۂ قلب نہیں بلکہ مضغة ہی مذکور ہے مگر یہ حکم "اذا اصلحت صلح الجسد کله" دراصل اسی لطیفۂ قلب کا ہے۔ جس کو مضغة یا قلب صنوبری سے غایت اتّصال اور تعلّق کی وجہ سے ذکر فرمایا، جیسے حالت ادراکیہ کو صورت علمیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔" صفحہ ۶

حضرت نے "معارف اللطائف" میں اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ لطائف کی مشق کسی کی ولایت کی دلیل نہیں اور اصل مقصود دوامِ ذکر کا حصول اور ملکۂ یادداشت کا رسوخ ہے۔ اسی مقالے میں یوں رقمطراز ہیں:

"یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ لطائف کے آثار کا ظہور و تحقق ولایت

کی دلیل نہیں اور نہ ان آثار و کوائف کے وجود سے مقبولیت پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ صفحہ ۱۳ ..... "الغرض ذکر لطائف و سلطان الاذکار وغیرہ سے مقصود اصلی یہ ہے کہ ذاکر کے دل و دماغ میں ایک مستحکم و راسخ ملکۂ یادداشت پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے اکثر اوقات مقصود سے ذہول و غفلت نہ ہو بلکہ ذکر میں مشغول رہے، اسی کثرت کو صوفیہ کے کلام میں دوامِ ذکر سے تعبیر کیا جاتا ہے، جسے ہم عدم ذہول سے بھی تعبیر کر لیتے ہیں کیونکہ ہر شے کا دوام اس کی مناسبت سے ہوا کرتا ہے۔ مثلاً زید کہتا ہے کہ میں ہمیشہ پانچوں نمازیں پڑھتا ہوں، تو اس فقرہ میں "ہمیشہ" سے مراد روزانہ ہو گی اور عمر کہتا ہے کہ میں ہمیشہ جمعہ کی نماز ادا کرتا ہوں، تو یہاں "ہمیشہ" سے مراد ہر ہفتہ ہو گا اور بکر کہتا ہے کہ میں ہمیشہ عید الفطر کی نماز پڑھتا ہوں، تو یہاں "ہمیشہ" سے مراد سالانہ ہو گی۔ اسی قاعدہ کے مطابق ذکر کے دوام سے مراد ذکر کے مناسب ہی ہو گا اور وہ ہے اکثر اوقات میں عدم ذہول۔ کیونکہ اوقات کے ایک ایک لمحہ کا مصروفِ ذکر ہونا عادت محال اور ناممکن ہے۔ نیند وغیرہ امور جو انسانی زندگی کے لیے عادتاً لازمی اور لابدی ہیں، ان میں ذہول لازمی ہے، اسی لیے بعض حضرات صوفیہ نے لفظ دوام کا استعمال ترک کر دیا ہے اور فرمایا ہے کہ طریقت میں مقصود کثرتِ ذکر اور دوامِ طاعت ہے جیسا کہ حافظ شیرازی نے کہا ہے:

در بزم عیش یک دو قدح نوش کن برو
یعنی طمع مدار وصالِ دوام را " (صفحہ ۱۵)

ذکرِ لسانی افضل ہے یا ذکرِ قلبی

اس بارے میں اُن کی رائے وہی تھی جس کا اظہار حافظ ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ

نے "الوابل الصّیب" میں کیا ہے۔ اپنے مقالے "ذکراللہ عزّوجل" میں حافظ ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

" الذکر تارۃ تکون بالقلب واللسان، وذٰلک افضل الذکر، وبالقلب وحدہ تارۃ وھی الدرجۃ الثانیہ، وباللسان وحدہ تارۃ وھی الدرجۃ الثالثۃ، افضل الذکر ما تواطأ علیہ القلب واللسان، وانّما کان ذکر القلب وحدہ افضل من ذکر اللسان وحدہ لانّ ذکر القلب یثمر المعرفۃ ویھیّج المحبۃ ویثیر الحیاء، ویبعث علی المخافۃ ویدعوا الی المراقبۃ ویردع عن التقصیر فی الطاعات والتھاون فی المعاصی والسّیّئات۔ وذکر اللسان وحدہ لایوجب شیئاً من ھٰذہ الآثار، وان اثمر شیئاً منھا فثمرۃ ضعیفۃ۔" (صفحہ ۳)

(ذکر کبھی بیک وقت دل اور زبان سے ہوتا ہے اور یہ ذکر کی سب سے افضل صورت ہے اور کبھی صرف دل سے ہوتا ہے اور فضیلت کے لحاظ سے یہ دُوسرے درجے کا ذکر ہے اور کبھی صرف زبان سے ہوتا ہے اور یہ ذکر کا تیسرا درجہ ہے۔ سب سے افضل ذکر وہ ہے جس میں دل اور زبان میں ہم آہنگی ہو اور صرف قلبی ذکر، صرف ذکرِ لسانی سے افضل ہے اس لیے کہ ذکرِ قلبی سے معرفت پیدا ہوتی ہے، محبّت اور حیاء اُبھرتی ہے ذکرِ قلبی خشیت کا باعث ہے اور مراقبے کی استعداد پیدا کرتا ہے اور طاعات میں کوتاہی سے روکتا ہے اور نافرمانیوں اور بدعمالیوں کو حقیر سمجھنے سے باز رکھتا ہے اور ذکرِ لسانی تنہا ایسے کوئی نتائج پیدا نہیں کرتا اور اگر کوئی اثر پیدا کرے بھی تو بہت ہلکا ہوتا ہے۔)

بیعتِ طریقت

بیعتِ طریقت کے بارے میں حضرت والد علیہ الرحمہ کی رائے وہی تھی جس کا اظہار حضرت شاہ ولی اللہؒ

ے "القول الجمیل" میں کیا۔ بیعتِ طریقت کو مسنون اور موجب برکات سمجھتے تھے۔ فرماتے تھے کہ یہ کہنا درست نہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے عہد میں صرف بیعتِ اسلام اور بیعتِ جہاد ہی تھی۔ مُسلم شریف، ابو داؤد اور نسائی کی اس حدیث سے استدلال فرماتے تھے:

عن عوف بن مالك الاشجعي قال كنّا عند النبي صلى الله تسعة او ثمانية او سبعة فقال الا تبايعون رسول الله صلى الله عليه وسلم فبسطنا ايدينا وقُلنا على ما نبايعك يا رسُول الله قال على ان تعبدوا الله ولا تشركوا به شيئاً وتصلوا الصلوٰت الخمس وتسمعوا وتطيعوا واسر كلمة خفية قال ولا تسئلوا الناس شيئاً فلقد رأيت بعض اولئك النفر يسقط سوط احدهم فما يسأل احداً يناوله اِيّاه۔"

(حضرت عوف بن مالک اشجعی کہتے ہیں کہ ہم لوگ حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی مجلس میں حاضر تھے۔ ہم سات آدمی تھے یا آٹھ نو ہوں گے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ تم اللہ کے رسولؐ سے بیعت نہیں کرتے؟ ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے اور عرض کیا یا رسول اللہ! کس امر پر آپ کی بیعت کریں؟ آپؐ نے فرمایا کہ ان باتوں پر بیعت کرو کہ تم اللہ کی عبادت کرو گے اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ گے اور پانچ وقت نماز پڑھو گے اور احکام توجہ سے سنو گے اور اطاعت کرو گے اور ایک بات آہستہ کی اور وہ یہ تھی کہ لوگوں سے کوئی چیز مت مانگو۔ عوف بن مالک رضؓ کہتے ہیں کہ میں نے ان میں سے بعض افراد کو دیکھا کہ اُن میں سے کسی کا کوڑا گر جاتا تو وہ بھی کسی سے نہ مانگتا کہ اُسے اُٹھا کر دے دے۔)

فرماتے تھے: یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس حدیث میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے مخاطب صحابۂ کرام ہیں، اس لیے یہ بیعتِ اسلام نہ تھی اور بیعت کے مضمون سے ظاہر

ہے کہ بیعتِ جہاد بھی نہ تھی بلکہ اعمالِ صالحہ کے التزام و اہتمام پر بیعت لی گئی اور صوفیائے کرام کے ہاں جو بیعت معمول ہے، اس کی حقیقت بھی اعمالِ صالحہ کے التزام و اہتمام کا معاہدہ ہے۔"

کشف و کرامات

وہ اس بات کے قائل تھے کہ اولیاء اللہ کو کشف ہوتا ہے اور خرقِ عادت بات کا ظہور بھی اُن سے ہو سکتا ہے لیکن کشف و کرامت کو ولایت کی کسوٹی نہیں مانتے تھے۔ فرماتے تھے کہ کشف، کافر، ملحد اور دہریے کو بھی ہو سکتا ہے۔ مجاہدے اور ریاضت سے انسان میں بعض باطنی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں، جن کی وجہ سے ریاضت کرنے والے کو کشف ہونے لگتا ہے اور شریعت میں کشفی علوم کو حجت نہ مانتے تھے۔ اسی طرح خرقِ عادت کا ظہور، فرماتے تھے کہ جوگیوں سے بھی ہوتا ہے اور یہ ریاضت کا ثمرہ ہے۔ کسی کی ولایت کی دلیل نہیں۔ بعض صحابہؓ سے عمر بھر کسی بھی خرقِ عادت بات کا ظہور نہیں ہوا، اس کے باوجود وہ تمام اُمّت سے افضل ہیں۔

توجّہ اور تصرّف

توجّہ اور تصرّف کے بارے میں بھی اُن کی رائے یہ تھی کہ اسے کمال اور قربِ الٰہی میں کوئی دخل نہیں اور نہ ولایت و مقبولیّت کی علامت ہے کیونکہ توجّہ میں یکسوئی کی مشق سے ایک فاسق و فاجر آدمی بھی اپنی ہمّت باطنی کو مضبوط اور قوی بنا سکتا ہے۔ مسمریزم اور عملِ تنویم کا دار و مدار بھی ہمّتِ باطنی کی مشق پر ہے۔ مشائخ میں بھی یہ قوّت کثرتِ مجاہدہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس قوّت کا استعمال اگر کسی نیک مقصد کے لیے ہو، تو اس تصرّف کو بھی محمود سمجھا جائے گا اور اگر مقصود مذموم ہے تو یہ تصرّف بھی مذموم ہوگا۔

فقہی موقف

تقلیدِ ائمہ

مضمون "استدراک" سے چند اقتباسات

تقلیدِ ائمّہ

فرماتے تھے:

"اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ ہم تقلید سے مطلقاً انکار کرتے ہیں اور عوام کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ وہ تفسیر، حدیث اور فقہ سے بے بہرہ ہونے کے باوجود، ائمہ کرام کے اقوال کو ٹھکرا دیا کریں اور بے زمام اور بے مہار ہو کر جو چاہیں کریں، تو وہ صریحاً غلط فہمی میں مُبتلا ہے۔"

ان کے فقہی موقف پر ان سے بارہا گفتگو ہُوئی۔ وہ فقہائے کرام بالخصوص ائمہ اربعہ کی مساعیِ جمیلہ کو بنظرِ استحسان دیکھتے تھے۔ ایک مضمون میں اپنے فقہی موقف کی وضاحت کرتے ہُوئے لکھتے ہیں:

" ائمۂ دین نے جو دین کی خدمت کی ہے، اُمّت قیامت تک ان کے احسان سے عہدہ برا نہیں ہو سکتی۔ ہمارے نزدیک ائمۂ دین کے لیے جو شخص دل میں سُوءِ ظن رکھتا ہے یا زبان سے ان کی شان میں بے ادبی اور گُستاخی کے الفاظ استعمال کرتا ہے، یہ اس کی شقاوتِ قلبی کی علامت ہے اور میرے نزدیک اس کے سوءِ خاتمہ کا خوف ہے۔ ہمارے نزدیک ائمۂ دین کی ہدایت و درایت پر اُمّت کا اجماع ہے۔"

"اس عاجز نے اپنے والدِ بزرگوار مولانا عبدالجبّار غزنوی رحمۃ اللہ رحمۃ واسعہ کے

درس میں امام ابنِ تیمیہؒ کی یہ عبارت اس کثرت سے سُنی ہے کہ طالب علمی کے زمانہ سے مجھے یاد ہے۔ فرمایا کرتے تھے :

قَولنا فیھا (فی مسئلۃ الصفات) ما قال اللہ وقال رسولہ والسابقون الاوّلون من المھاجرین والانصار الذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ وائمۃ الھدیٰ الذین اجمع المسلمون علی ھدایتھم ودرایتھم۔ ھٰذا ھو قولنا فی ھذا الباب وفی غیرہٖ۔

یعنی صفات کے مسئلہ میں ہمارا فتویٰ وہی ہے جو اللہ عزوجل نے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا اور جو عقیدہ صحابۂ کرام، مہاجرین و انصار کا اور ان کے تابعین کا تھا رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ اور جو فتویٰ ائمۂ دین کا ہے، جن کی ہدایت و درایت پر اُمّت کا اجماع ہے اور یہی ہمارے فتویٰ کا انداز ہے مسئلہ صفات کے بارے میں اور دُوسرے مسائل کے بارے میں۔

حضرت والد بزرگوارؒ جس وقت اجمع المسلمون علیٰ ھدایتھم ودرایتھم پر پہنچتے تو اس فقرہ کو کئی بار ارشاد فرماتے۔ اس وقت آپ کی آواز بلند ہو جاتی اور آپ کا چہرۂ مبارک جلالِ ایمان سے سُرخ ہو جاتا اور ہمیشہ اپنے درس میں امام احمدؒ کی یہ نصیحت ہمیں ارشاد فرماتے

"اِیاکَ اَنْ تتکلّمُ فی مَسْئَلَۃٍ لَیس لَکَ فِیھَا اِمامٌ[1]"

یہ ہے موقف اور مسلک حضرت والد علیہ الرحمہ کا جو انہیں ان کے اساتذہ اور اسلافِ کرام سے ملا تھا۔

---

[1] دیکھو کسی ایسے مسئلے پر گفتگو نہ کرنا جس میں کسی امام کا فتویٰ تمہیں حاصل نہ ہو۔ دیکھیے ان کا مضمون استدراک "الاعتصام" شمارہ ۱۵ اگست ۱۹۵۸ء

وہ تقلید کو بعض حالتوں میں واجب قرار دیتے تھے اور بعض حالتوں میں اسے جائز سمجھتے تھے۔

۱- ائمہ اہل سنت میں سے کسی ایک امام کی تقلید کو جو بغیر کسی تعیّن کے ہو، واجب قرار دیتے تھے۔

۲- اور ایک امامِ معیّن کی تقلید بشرطیکہ اس تعیین کو امرِ شرعی نہ سمجھا جائے، مباح قرار دیتے تھے۔

۳- اور کسی ایک امامِ معیّن کی تقلید کو امرِ شرعی سمجھنا اور اس کی تقلید ترک کرنے کو شریعت سے خارج ہونے کے مترادف سمجھنا ناجائز قرار دیتے تھے۔[۱]

اس بات پر حضرت بہت زور دیتے تھے کہ جب تفسیر، حدیث اور فقہ پر دسترس رکھنے والے کسی عالم کو حدیثِ صحیح غیر منسوخ اپنے امام کے مذہب کے خلاف مل جائے تو اسے اپنے امام کا قول اس حدیث رسول اللہ علیہ وسلّم کے لیے ترک کر دینا چاہیے۔ فرماتے تھے: کوئی فقیہ صحیح معنوں میں حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ حدیثِ صحیح غیر منسوخ کو امام کے قول پر ترجیح نہ دے۔ امام ابوحنیفہؒ سے پوچھا گیا کہ اگر آپ کوئی ایسا مسئلہ بیان کریں کہ قرآن مجید میں اس کے خلاف آیت مل جائے تو کیا کریں۔ فرمایا:

اُتْرُکُوا قَوْلِی بِکِتَابِ اللّٰہِ (میری بات کتاب اللہ کی خاطر چھوڑ دو)

پھر پوچھا گیا کہ آپ کے قول کے خلاف اگر حدیث مل جائے تو فرمایا:

اُتْرُکُوا قَوْلِی بِخَبَرِ رَسُولِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلّم (حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث کے لیے بھی میرا قول چھوڑ دو) پھر پوچھا کہ اگر صحابہؓ کا

---

[۱] دیکھیے ان کا مضمون "استدراک" الاعتصام۔ شمارہ ۱۵ اگست ۱۹۵۸ء

قول آپ کے فتویٰ کے خلاف مل جائے تو کیا کریں ۔ جواب دیا کہ آثارِ صحابہؓ کے مقابلے میں بھی میرا قول چھوڑ دو۔"

فرماتے تھے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے یہ ارشادات 'روضۃ العلماء' میں صاحبِ ھدایہ سے منقول ہیں۔

یہ مسئلہ بیان کرتے ہُوئے ائمۂ کرام کے اقوال کے انبار لگا دیتے تھے ۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھی شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ کی کتاب "الیواقیت والجواھر" کے حوالے سے نقل کرتے ۔"ہر شخص کے کلام میں سے اخذ بھی کیا جا سکتا ہے اور اسے ردّ بھی کیا جا سکتا ہے ۔ صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کا ارشاد ہے جسے ہر حالت میں قبول کرنا چاہیے اور جسے ردّ نہیں کیا جا سکتا ۔"

اسی طرح فرماتے تھے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ارشاد ہے :

اذ بَلَغَکُمْ خَبَرٌ صَحِیْحٌ یُخَالِفُ مَذْھَبِی وَاعْلَمُوْا اَنَّہٗ مَذْھَبِیْ

(جب تمہیں میرے مذہب کے خلاف حدیث صحیح مل جائے تو اسی کی پیروی کرو سمجھ لو کہ وہی میرا مذہب ہے)

اور فرماتے اسی طرح امام احمدؒ بن حنبل تاکید کرتے تھے کہ حدیث کے مقابل کسی اور کا قول پیش نہ کرنا چاہیے ۔ جیسا کہ امام شعرانیؒ نے 'الیواقیت والجواہر' میں لکھا ہے۔

پس صحیح معنوں میں حنفی ، مالکی ، شافعی یا حنبلی بننے کے لیے بھی ضروری ہے کہ حدیثِ صحیح پر عمل کیا جائے ، ورنہ اپنے امام کی بھی مخالفت کرے گا اور اس کی اطاعت سے بھی باہر ہو گا۔" فرماتے تھے :

" میرا فقہی موقف وہی ہے جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کا موقف تھا اور اُنہوں نے 'عقد الجید' انصاف، حجۃ اللہ البالغہ اور تفہیمات میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ اور یہی مذہب تھا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ [1] کا اور یہی مذہب تھا میاں نذیر حسینؒ [2]

---

[1] دیکھیے تفسیر مظہری ۔ [2] ملاحظہ فرمایئے انکی کتاب 'معیار الحق'

کا اور یہی مذہب تھا مولانا حبیب اللہ قندھاریؒ کا۔"

اہلحدیث اور احناف کے درمیان فاصلوں کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہے اور فرقہ وارانہ عصبیّت کی آگ بجھانے کی مسلسل تگ و دو کرتے رہے۔ اہلِ حدیث کو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ادب و احترام کی تلقین کرتے رہے اور احناف کو حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت امام ابنِ تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی تکریم و تعظیم ملحوظ رکھنے کی نصیحت کرتے رہے۔ اس سلسلے میں ان کے ارشادات ملاحظہ فرمائیے۔

حضرت مولانا سیّد محمد داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نوّر اللہ مرقدہ کے مضمون "استدراک" سے چند

اقتباسات

الاعتصام ۱۵ر اگست ۱۹۵۸ء

"بعض دیوبندی احباب کہا کرتے ہیں کہ غزنوی خاندان کے علماء کا مسلک اس بارے میں قابلِ ستائش ہے لیکن دُوسرے علماء اہل حدیث کا یہ مسلک نہیں، اس لیے بعض مقتدر علماء اہلِ حدیث کے اقتباسات ذکر کرتا ہوں شاید کہ دِلوں سے کدُورت دور ہو اور سوءِ ظن کی جو عام بیماری ہے، وہ دُور ہو سکے۔

مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹیؒ ہماری جماعت کے مشہور مقتدر علماء میں سے تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب 'تاریخِ اہل حدیث' میں امام ابوحنیفہؒ کی مدح و توصیف اور ان کے خلاف ارجاء وغیرہ الزامات کے دفعیہ میں $\frac{23 \times 29}{8}$ سائز کے ۸ صفحات ...... وقف کیے ـــــــ اور مقتدر مشاہیر علماءِ سلف مثلاً امام ابنِ تیمیہؒ، امام ذہبیؒ، حافظ

ابن حجرؒ اور علامہ شہرستانیؒ کے اقوال نقل کر کے یہ تبلایا ہے۔ الناس فی ابی حنیفۃ حَاسِدٌ او جاھلٌ۔ یعنی حضرت امام ابو حنیفہؒ کے حق میں بُری رائے رکھنے والے کچھ لوگ تو حاسد ہیں اور کچھ ان کے مقام سے بے خبر ہیں۔

پھر کسی جگہ ان کا ذکر امام اعظمؒ کے نام سے کرتے ہیں۔ کسی جگہ سیّدنا امام ابو حنیفہؒ کہہ کر ادب و احترام سے ذکر کرتے ہیں اور حضرت الامام الاعظمؒ کے خلاف جو سب سے زیادہ سنگین حملہ امام سفیانؒ کے حوالہ سے بروایت نعیم بن حماد کیا جاتا ہے اس پر معقول اور مدلّل جرح کر کے ثابت کیا ہے کہ نعیم بن حمّاد سُنّت کی تقویت میں اور امام ابو حنیفہؒ کی بدگوئی میں جھوٹی حدیثیں اور من گھڑت حکایات وضع کر لیا کرتا تھا۔ اور اس ساری بحث کو آخر میں مولانا محمد ابراہیمؒ اس فقرہ کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔

(خلاصۃ الکلام یہ کہ نعیم کی شخصیت ایسی نہیں ہے کہ اس کی روایت کی بنا پر حضرت امام ابو حنیفہؒ جیسے بزرگ امام کے حق میں بدگوئی کریں۔ جن کو حافظ ذہبیؒ جیسے ناقد الرجال امام اعظم کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں اور حافظ ابن کثیرؒ البدایہ والنہایہ میں آپ کی نہایت تعریف کرتے ہیں اور آپ کے حق میں فرماتے ہیں۔ احد ائمۃِ الاسلام وسادۃ الاسلام واحد ارکانِ العلماء واحد الائمۃِ الاربعۃ اصحاب المذاھب المتبوعہ)

نیز حافظ ابنِ کثیرؒ عبد اللہ بن داؤدؒ حریبی سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا لوگوں کو مناسب ہے کہ اپنی نماز میں امام ابو حنیفہؒ کے لیے دُعا کیا کریں کیونکہ اُنہوں نے ان پر فقہ اور سنن (نبویہ) کو محفوظ رکھا۔

(البدایہ والنہایہ جلد دہم صفحہ ۱۰۷)

نواب صدیق حسن خاںؒ جن کا ذکر بعض حلقوں میں اہانت اور تحقیر کے ساتھ کیا

جاتا ہے اپنی مشہور تصنیف 'الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ' میں تبع تابعین کے ذکر میں فرماتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی نسبت سے یہ تیسرا طبقہ ہیں اور اس طبقے کے اکابر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

منهم الامام جعفر الصادق والبوحنيفه النعمان بن ثابت الامام الاعظم ومالكؒ والاوزاعیؒ والثوریؒ وابن جریجؒ ومحمد بن ادریس الشافعیؒ وغيرهم وهذه الطبقات الثلاثة هی المشهود لها بالخير على لسان نبينا صلى الله عليه وسلّم ..... وهم الصدر الاوّل والسلف الصالح والمحتجّ بهم فی كل باب ص ۴۲

کہ ان تبع تابعین میں سے امام جعفر صادقؒ ، امام اعظم ابوحنیفہؒ ، امام مالکؒ ، امام شافعیؒ امام اوزاعیؒ وغیرہم ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد کے مطابق یہ تین زمانے (صحابہؓ تابعین، تبع تابعین) خیر و برکت کے ہیں اور یہی اسلام کے صدر اوّل اور ہمارے سلف صالح ہیں جن سے ہر باب میں سند پیش کی جاسکتی ہے۔

مولانا سید نذیر حسین محدث دہلویؒ جو امامِ عرب و عجم اور استاذ العلماء ہیں جن کا ذکر کئی ایک اکابر علماء دیوبند نے حقارت سے کیا ہے، اپنی کتاب 'معیار الحق' میں امام ابوحنیفہؒ کے تابعی ہونے کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

(ہر چند کہ فضائل سے امام صاحب کے ہم کو عین عزت اور فخر ہے، اس لیے کہ وہ ہمارے پیشوا ہیں اور ہم انکے امرِ حق میں پیرو ہیں ان فضائل سے جو فی الواقع بھی ہوں اور ساتھ اسناد صحیح کے ثابت ہوں ... اور اس میں امام صاحب کی کسر شان اور مذمت نہیں ہے اس لیے کہ انکی فضیلت تابعی ہونے پر موقوف نہیں۔ ان کا مجتہد ہونا اور متبع سنت اور متقی پرہیزگار ہونا کافی ہے۔ ان کے فضائل میں، اور آیۃ کریمہ اِنَّ

اکرمکم عند اللہ اتقاکم زینت بخش مراتب) صفحہ ۵

مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ علماء دیو بند میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان سے دو واقعات ان کے خلیفۂ مجاز خواجہ عزیزالحسن صاحبؒ اشرف السوانح میں نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

کہ حضرت والا جناب مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے جو اہلحدیث کے بہت سربرآوردہ علماء میں سے تھے دو بار ملے۔ ایک بار دہلی میں طالب علمی کے زمانہ میں اور ایک بار آرہ (بہار) میں۔ دہلی کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ایک واقعہ بیان کرتے ہیں۔

اس زمانے میں ایک غیر مقلد طالب علم مدرسہ دیوبند میں پڑھتا تھا۔ اس نے حضرت امام محمدؒ کی شان میں کچھ گستاخانہ کلمات استعمال کیے۔ اس پر اور طالب علموں نے اسے پیٹ دیا تھا۔ اس واقعہ کی (مولانا نذیر حسین صاحبؒ سے) شکایت بھی کی۔ حضرت والا نے فرمایا کہ اس نے امام محمدؒ کی شان میں گستاخانہ کلمات استعمال کیے تھے اس پر طلباء کو غصہ آگیا۔ یہ سن کر مولوی صاحب نے فرمایا کہ واقعی یہ اس کی بڑی بے جا حرکت تھی۔

دوسرا واقعہ آرہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اس وقت ایک غالی غیر مقلد مولوی صاحب نے جو ان کے پاس بیٹھے تھے، دوران گفتگو حضرت ابن ہمامؒ کی کچھ تنقیص کی۔ مولوی صاحب یعنی مولانا نذیر حسینؒ نے ان کو ڈانٹا کہ یہ بڑے لوگ تھے ہمارا منہ نہیں کہ ہم ان کی شان میں کچھ کہہ سکیں۔

(اشرف السوانح حصہ اوّل صفحہ ۱۲۳-۱۲۴)

یہ دونوں واقعات اہل حدیث علماء کی روایت سے نہیں بلکہ اکابر علماء دیوبند کے واسطہ سے ہیں —— ان سے کس قدر وضاحت سے ثابت ہوتا ہے کہ اکابر علماء اہل حدیث امام ابو حنیفہؒ، امام محمدؒ اور ان کے بہت بعد کے علماء جیسا کہ علامہ ابن ہمامؒ

کے لیے کس درجہ ادب واحترام رکھتے تھے۔

اگر ہم ان تمام عبارات کو نقل کریں جو علماء اہلحدیث اور اکابر اہلحدیث نے اپنی تصنیفات میں تحریر فرمائی ہیں تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے۔ یہ سب کی سب اس پر شاہد عدل ہیں کہ انہوں نے ائمۂ دین کے ادب و احترام کے اظہار میں کبھی کوتاہی نہیں کی اور اپنے تلامذہ اور وابستگانِ دامن کے دِلوں میں ائمۂ کرام کی تعظیم و تکریم کے نیک جذبات پیدا کرنے میں ہمیشہ کوشش کی۔

لیکن اگر کوئی شخص اہلحدیث کہلا کر کسی امام کے حق میں سوءِ ظن رکھتا ہے یا ادب و احترام سے ذکر نہیں کرتا ہے تو اس کا طرزِ عمل جماعت اہلحدیث کا مسلک نہیں بن جائیگا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ کوئی حنفی کہلا کر امام شافعیؒ کی شان میں گستاخی کے کلمات کہے۔ اس کی ایک مثال عرض کرتا ہوں۔

ملاں جیونؒ نے اپنی مشہور درسی کتاب 'نورالانوار' میں جہالت کے تین اقسام بیان کیے ہیں۔ قسم اوّل لکھتے ہیں "جہل باطل" ہے اور اس کا حکم یہ ہے 'لا یصلح عذراً فی الآخرۃ'، یہ جہالت قابلِ عفو نہیں۔ آخرت میں یہ عذر نہیں سنا جائے گا کہ جہالت اور بے خبری سے یہ گناہ سرزد ہوا ہے۔ اس کی مثال میں فرماتے ہیں 'کجہل الکافر' جیسا کہ کافر۔ دلائل توحید و رسالت کے واضح ہونے کے باوجود اگر اس سے جاہل رہے تو آخرت میں یہ جہالت قابلِ عفو نہیں۔

اِس کی دوسری مثال اُنہوں نے یہ دی ہے۔ کجہل صاحب الھویٰ فی صفاتِ اللہ واحکام الآخرۃ کجہل المعتزلۃ۔ یعنی صفاتِ الٰہیہ اور احکام آخرت میں معتزلہ کا جہل بھی جہل باطل ہے اور آخرت میں یہ عذر نہیں بن سکے گا یعنی اس پر مواخذہ ہوگا اور یہ جہل قابلِ سزا ہے۔

اس کی تیسری مثال ملاں جیون نے یہ بیان کی ہے وجہل الباغی باطاعۃ

الامام الحق۔ یعنی امام برحق سے بغاوت کرنے والے کی جہالت بھی جہل باطل ہے۔

اس کی چوتھی مثال میں امام شافعیؒ کو پیش کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

وجہل من خالف فی اجتھادہ الکتاب کجہل الشافعیؒ فی حل متروک التسمیۃ عامداً قیاساً علی متروک التسمیۃ ناسیا۔ والسنۃ المشہورۃ کجہل الشافعیؒ فی جواز القضاء بشاھد ویمین۔۔۔ بحث الاحکام۔ نور الانوار مطبع مصطفائی ص ۲۵۴)

یعنی جس مجتہد کا اجتہاد کتاب اللہ کے مخالف ہو وہ جہل باطل ہے جیسا کہ امام شافعیؒ کا جہل کہ انہوں نے اس ذبیحہ کو بھی حلال کہہ دیا ہے جسے مسلمان ذبح کرے اور عمداً بسم اللہ اللہ اکبر نہ کہے اور اسے قیاس کیا ہے انہوں نے اس پر کہ اگر کوئی مسلمان ذبح کے وقت بھول کر تسمیہ نہ کہے تو وہ حلال ہوتا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ بھی جہل باطل میں داخل ہے کہ مجتہد کسی مشہور حدیث کے خلاف فتویٰ دے جیسا کہ امام شافعیؒ کی جہالت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ایک گواہ اور قسم کے ساتھ مدعی کے حق میں فیصلہ ہو سکتا ہے۔

اس تحریر کے بعد مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ملّا جیونؒ جیسے مقتدر عالم نے امام شافعیؒ کے ایک مسئلہ اجتہادی اور ایک مسئلہ منصوصہ کو جہل باطل قرار دے کر جہل کافر، جہل معتزلہ اور جہل باغی کے ساتھ ملا دیا ہے ——— خود ملّا جیونؒ کو بھی اس سوء ادب کا احساس ہوا۔ افسوس کہ اس احساس کے بعد انہوں نے دوسرا ظلم یہ کیا کہ کہا:" میں تنہا اس سوءِ ادب کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ ہمارے اسلاف بھی اس سوءِ ادب میں میرے ساتھ شریک ہیں۔" ان کے الفاظ یہ ہیں۔

وقد نقلنا کل ھٰذا علی نحو ما قال اسلافنا وان کنا لم نجترء علیہ

ہم نے امام شافعیؒ کے متعلق جو کچھ نقل کیا ہے یہ ہمارے اسلاف کے کہنے کی بنا پر ہے ورنہ ہم اس قدر جرأت نہ کر سکتے تھے۔ مولانا عبدالحلیم لکھنویؒ حاشیے پر لکھتے ہیں:

لان فی ھذا البیان سُوء الادب

اس لیے جُرأت نہ کرتے کہ اس بیان میں امام شافعیؒ کی بے ادبی ہے۔

نورالانوار درسی کتاب ہے اور تمام مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ کیا اس کا یہ معنی سمجھا جائے کہ تمام حنفی مدارس میں امام شافعیؒ کے لیے سوءِ ادب کی سبقاً و درساً تعلیم دی جاتی ہے ——؟

ایک واقعہ یاد آگیا۔ مجھ سے یہ واقعہ مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ خلیفۂ اعظم حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا۔ حضرت مفتی صاحب اپنے علم وفضل کے لحاظ سے ہمارے زمانہ کے ممتاز علماء میں سے ہیں۔ تصوّف میں ان کا قدم راسخ ہے تصوّف میں عالمانہ بصیرت جیسے انہیں حاصل ہے بہت کم صوفیاء کو حاصل ہوگی۔ بہت بڑے عالم اور خُلقِ عظیم کے مطاع اور مخدوم ہیں لیکن ساتھ ہی بڑے متواضع اور منکسرالمزاج ہیں۔ فرماتے ہیں:

کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دفعہ خواب میں دیکھا کہ "امام شافعیؒ برہنہ تلوار لیے مدرسہ دیوبند میں بڑے غصہ کی حالت میں گھوم رہے ہیں"۔ حضرت شیخ الہندؒ اس خواب سے بہت پریشان ہوئے اور صبح ہوتے ہی حضرت مولانا انور شاہؒ سے ذکر کیا اور فرمایا کہ کسی نے حضرت امام شافعیؒ کی شان میں گستاخی کی ہے۔ شاہ صاحب نے تحقیقات کے بعد عرض کیا کہ حضرت سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا کہ ایک شافعی طالب علم نے حنفی مسلک اختیار کر لیا ہے۔

اس عاجز کی رائے میں اتنی سی بات کے لیے امام شافعیؒ کا شمشیر بکف ہو کر مدرسہ دیوبند میں غصہ کی حالت میں پھرنا کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ حنفی اور شافعی سے اختلافی مسائل کے بیان کرنے میں بالعموم ادب کا دامن چھوٹ جاتا ہے اور طلباء اس بارے میں زیادہ بے احتیاط ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند

اس بارے میں زیادہ بدنام ہے۔ اس لیے مثالی طور پر حضرت شیخ الہندؒ کو خواب میں سمجھایا گیا۔
اور ہمارے مدرسہ کا حال سُنیے۔ ایک روز حضرت والد بزرگوار (مولانا عبد الجبار غزنویؒ)
کے درس بخاری میں ایک طالب علم نے کہہ دیا کہ امام ابوحنیفہؒ کو پندرہ حدیثیں یاد تھیں۔
مجھے ان سے زیادہ حدیثیں یاد ہیں۔ والد صاحب کا چہرۂ مبارک غصہ سے سُرخ ہوگیا۔
اس کو حلقۂ درس سے نکال دیا اور مدرسہ سے بھی خارج کر دیا اور بفحوائے "اتّقوا فراسة
المومن فانه ینظر بنور الله" فرمایا کہ اس شخص کا خاتمہ دین حق پر نہیں ہوگا۔ ایک ہفتہ
نہیں گزرا تھا کہ معلوم ہوا کہ وہ طالب عِلم مُرتد ہو گیا ہے۔ اعاذنا الله من سوء
الخاتمه۔

یہ ہے جو آپ سے کہہ رہا ہوں کہ جس طرح ایک حنفی عالم یا حنفی درس گاہ اگر امام
شافعیؒ کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کرے تو اس کو احناف کا من حیث الجماعت
مسلک نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی اہل حدیث امام ابوحنیفہؒ کے حق میں کوئی
ناشائستہ لفظ استعمال کرتا ہے یا دل میں سوءِ ظن رکھتا ہے تو یہ اہلِ حدیث کا مسلک نہیں
کہلائے گا۔"

مرزائیت کی تردید

اسلام اور قادیانیت

نئی اُمّت کی تشریح

دعوائے نبوت بدرجۂ کمال

نبوّت کی تشریح

صاحبِ شریعت ہونے کا دعویٰ

فتوائے کفر کی تدریجی رفتار

قادیانی "کلام اللہ"

نئی اُمّت کا اعلان

قادیانی دین

مسلمانوں سے قطع تعلق

اسلامی اداروں سے بے تعلقی

نماز عید علیحدہ پڑھو

حکیم نورالدین کا فتویٰ

مسلمانوں کا جنازہ نہ پڑھو

مسلمانوں سے نکاح حرام

حکیم نورالدین کا مسلم مقاطعہ

اقتصادی مقاطعہ

مرزائیوں کا اقتصادی اقرارنامہ

مرزائیوں کے مسلم ہمدرد

اسلامی سلطنت کی تباہی پر خوشی

حضرت والد علیہ الرحمہ اتحاد بین المسلمین کے زبردست حامی اور داعی تھے، لیکن قادیانیّت کے ساتھ کسی قسم کے سمجھوتے کی کوئی گنجائش اُن کے ہاں نہ تھی۔ وہ مرزائیوں کو مسلمانوں سے خارج سمجھتے تھے اور انہیں الگ فرقہ قرار دیتے تھے۔ قادیانیّت کے بارے میں اُن کے موقف کی وضاحت کے لیے اُن کا ایک مکمّل مضمون نقل کیا جاتا ہے۔ یہ مضمون اُنہوں نے ۱۹۳۶ء میں لکھا تھا، لیکن مضمون کی افادیت اب بھی برقرار ہے۔ اس مضمون میں اُنہوں نے مرزا غلام احمد اور مرزا محمود کی تحریروں سے ثابت کیا ہے کہ مرزائی مُسلمانوں سے الگ ایک فرقہ ہے اور خود مرزا غلام احمد اور اُن کے خلفاء کی تعلیمات، اور اُن کے طرزِ عمل کی بنا پر مرزائی اس بات کے سزاوار ہیں کہ انہیں مسلمانوں سے الگ ایک اقلیّت قرار دیا جائے۔

"اسلام اور قادیانیت"

مرزائی مُسلمانوں سے الگ ایک فرقہ ہے

مرزا غلام احمد اور مرزا محمُود کی تحریروں کی روشنی میں

قادیانیّت ایک فتنہ ہے، لیکن یہ فتنہ ہر اعتبار سے پہلے فتنوں سے زیادہ اہم، زیادہ وسیع، زیادہ منظّم اور حکومتِ وقت کی پُشت پناہی کے ساتھ خود کاشتہ پودے کی طرح پرورش پا رہا ہے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اسلام کی سیزدہ صدسالہ زندگی میں اس سے قبل کبھی اُمّتِ مسلّمہ کو اس قسم کے فتنہ سے سابقہ نہیں پڑا۔

اخبار "زمیندار" کا مرزائی نمبر ۱۹۳۶ء و الاعتصام، شمارہ ۶، مارچ ۱۹۵۳ء

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے نئے مذہب کی بنیاد اس غلام آباد میں اس وقت رکھی جب کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی محکومی اور غلامی کی وجہ سے مذہبی اور سیاسی پستی کی انتہا کو پہنچ چکے تھے اور بظاہر اس رقیت اور تعبّد سے نکلنے اور حرّیت و آزادی کے لیے سر اُٹھانے کی کوئی اُمید نہ رہی تھی۔ اس وقت بانیٔ فرقہ نے مسلمانوں کی درماندگی اور ذلّت کا یقین رکھتے ہوئے اور مسلمانوں کی پستی کو ابدی زوال خیال کرتے ہوئے مجدّدیت، مہدویت، مسیحیت اور نبوّت کے دعاوی کو بتدریج پیش کیا۔ جوں جوں حکومتِ وقت کی آئینی گرفت اس بدقسمت ملک کے رہنے والوں پر قوی تر ہوتی گئی بانیٔ فرقہ اپنے دعاوی کو پہلے سے بلند و ارفع کرتا چلا گیا، حتیٰ کہ وہ وقت آ گیا جب کہ بانیٔ فرقہ کو یقین آ گیا کہ حکومت کا دیا ہوا امن و امان جہاں اس کے دعاوی کی بلا خطر اشاعت اور آزادانہ تبلیغ کا ضامن ہے، وہاں حکومت کی قوت و سطوت ملک پر وہ سکّہ بٹھا چکی ہے کہ دعاوی کو اگر انتہائی منزل تک پہنچا کر بالکل نئے مذہب اور نئی اُمّت کی بُنیاد رکھ دی جائے، تو مسلمانوں کی قوت مزاحم نہ ہو سکے گی، بلکہ بہت ممکن اور قرینِ قیاس ہے کہ یہ نئی اُمّت کی تجویز حکومتِ وقت کے منشاء کے مطابق ہو اور اس کے حاکمانہ اغراض کو زیادہ مستحکم کرنے والی ثابت ہو۔

نئی اُمّت کی تشریح

وہ مُسلمان جو اس خطرناک غلطی میں مُبتلا ہیں کہ قادیانی گروہ اسلام کا ایک فرقہ ہے اور اُسے اسلام اور اُمّتِ مسلمہ سے الگ ایک نیا فرقہ یا نئی اُمّت کہنے کو اور اس کے خلاف کُفر کے فتوے صادر کرنے کو تنگ خیالی اور اتحادِ اسلام کے منافی سمجھتے ہیں، اُن کے لیے اس سلسلہ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ بانیٔ فرقہ اور اس کے خلفاء اور جانشینوں کے اقوال کا یہاں مختصر ذکر کر دوں تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے جب تبلیغِ اسلام کی آڑ میں اپنی پیری مریدی کا حلقہ کافی وسیع کر لیا اور مختلف پیش گوئیوں اور

اُن کی عجیب و غریب تشریحات کو شائع کر کے مریدوں کی عقیدتمندی کو وقتاً فوقتاً امتحان کی کسوٹی پر پرکھ کر مجدّدیت، مہدویت، مسیحیت اور نبوّت کی منزلیں حسب بتدریج طے کر لیں تو کس طرح اُس نے ایک نئے مذہب اور نئی اُمّت کے قیام کا اعلان کیا اور اپنے ماننے والوں کے سوا تمام مسلمانوں کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کیا اور اس کے سوا اُس کے لیے کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ اپنی جماعت کو ایک علیحدہ قوم اور الگ اُمّت بنانے کے لیے ہر اس فردِ بشر کو جو اس کی نبوّت کا قائل نہ ہو، کافر قرار دے اور اُن سے ہر طرح قطعِ تعلّق کا اعلان کرے۔

دعوئے نبوّت بدرجۂ کمال

مختلف دعاوی بتدریج اپنے مریدوں سے منوانے کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی اپنے دعوئے نبوّت کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے اور ایک نبی اور ایک اُمّت اور اس کی شریعت اور اس کی کتاب اور اس کی ارضِ حرم غرض پوری نقالی کے واسطے یہ اعلانات وقتاً فوقتاً کرتا رہا:

"اور مَیں اس خُدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اُس نے مجھے بھیجا ہے اور اُس نے میرا نام نبی رکھّا ہے اور اُس نے مجھے مسیحِ موعود کے نام سے پکارا ہے اور اُس نے میری تصدیق کے لیے بڑے بڑے نشان ظاہر کیے جو تین لاکھ تک پہنچتے ہیں۔" (تتمّہ حقیقت الوحی صہ ۶۷)

"خدا نے میرے ہزار ہا نشانوں سے میری وہ تائید کی کہ بہت ہی کم نبی گزرے ہیں جن کی یہ تائید کی گئی، لیکن پھر بھی جن کے دلوں پر مہریں ہیں، وہ خدا کے نشانوں سے کچھ بھی فائدہ نہیں اُٹھاتے۔" (تتمّہ حقیقت الوحی صہ ۱۴۸)

نبوّت کی تشریح

مرزا غلام احمد کی نبوت کے متعلق تا کہ کسی قسم کا شک وشبہ باقی نہ رہے، اس کے خلیفۂ دوم اور اس کے بیٹے

میاں محمود کی بعض عبارات نقل کرتا ہوں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ لوگ مرزا کو دوسرے انبیاء کی طرح حقیقی نبی مانتے ہیں:

"میں حضرت مرزا صاحب کی نبوّت کے متعلق لکھ آیا ہوں کہ نبوّت کے حقوق کے لحاظ سے وہ ایسی ہی نبوّت ہے جیسے اور نبیوں کی۔ صرف نبوّت کے حاصل کرنے کے طریقوں میں فرق ہے (القول الفیصل صہ ۲۳)

پس شریعتِ اسلامی نبی کے جو معنی کرتی ہے، اس معنی سے مرزا صاحب ہرگز مجازی نبی نہیں ہیں بلکہ حقیقی نبی ہونے کے دعویدار ہیں۔

صاحبِ شریعت ہونے کا دعویٰ

صرف دعوائے نبوّت پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ صاحبِ شریعت نبی ہونے کا دعویٰ کیا۔ دیکھئے:

"یہ بھی تو سمجھو کہ شریعت کیا چیز ہے؟ جس نے اپنی وحی کے ذریعہ سے چند امر و نہی بیان کیے اور اپنی اُمّت کے لیے ایک قانون مقرر کیا، وہی صاحبِ شریعت ہو گیا۔ میری وحی میں امر بھی ہے نہی بھی ..... اور اگر کہو کہ شریعت سے وہ شریعت مُراد ہے جس میں نئے احکام ہوں تو یہ باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ان هٰذا لفی الصحف الاولٰی صحف ابراهیم و مُوسیٰ۔ یعنی قرآن کی تعلیم توریت میں بھی موجود ہے۔ (اربعین نمبر ۴ صہ ۷)

صاحب امر و نہی اور صاحب شریعت کے ادّعا کے ساتھ یہ بھی دعویٰ کر دیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے وقت میں جو احکام تھے ان میں سے بعض کی تنسیخ مسیح موعود کے وقت میں کر دی گئی۔

"جہاد یعنی دینی لڑائیوں کی شدّت کو خُدا تعالیٰ آہستہ آہستہ کم کرتا گیا ہے۔ حضرت مُوسیٰ کے وقت میں اس قدر شدّت تھی کہ شیرخوار بچے بھی قتل کیے

جاتے تھے۔ پھر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے وقت میں بچّوں اور بوڑھوں اور عورتوں کا قتل ممنوع ہو گیا.... اور پھر مسیح موعود کے وقت قطعاً جہاد کا حکم موقوف کر دیا گیا۔"
(اربعین نمبر ۴ صہ ۱۵)

دعویٰ نبوّت سے پہلے جب کہ صرف محدّث اور ملہم ہونے کا دعویٰ تھا، اس وقت مرزا نے یہ نکتہ اپنے مریدوں کو بتایا:

"یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ اپنے دعویٰ کے انکار کرنے والے کو کافر کہنا یہ صرف ان نبیوں کی شان ہے جو خُدا تعالیٰ کی طرف سے شریعت اور احکام جدیدہ لاتے ہیں، لیکن صاحب شریعت کے سوا اور جس قدر محدّث ہیں، گو وہ کیسے ہی جناب الٰہی میں اعلیٰ شان رکھتے ہوں اور خلعت مکالمۂ الٰہیہ سے سرفراز ہوں، اُن کے انکار سے کوئی کافر نہیں بن جاتا۔"
(تریاق القلوب صہ ۱۳۰)

مرزا غلام احمد کا یہ اعلان لاہوری جماعت کی ان تمام تاویلات کی جڑ کاٹ دیتا ہے جس سے وہ عوام مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں اور فریب کارانہ طریق پر مرزا کے دعاوی کو پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ تو الم نشرح ہے کہ مرزا نے اپنے منکرین کو جہنمی اور کافر بارہا کہا ہے۔

فتویٰ کفر کی تدریجی رفتار

"جس کو میری تبلیغ پہنچ گئی ہے گو وہ مسلمان ہے مگر مجھے اپنا حکم نہیں ٹھہراتا اور نہ مجھے مسیح موعود مانتا ہے اور نہ میری وحی کو خُدا کی طرف سے جانتا ہے، وہ آسمان پر قابلِ مواخذہ ہے۔"
(تحفتہ الندوہ صہ ۴)

یہاں تو صرف اتنا ہی کہا کہ وہ آسمان پر قابلِ مؤاخذہ ہے۔ اس کے بعد فتوے فسق ملتا ہے:

"جس طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعے سے قرآن

شریف میں اور احکام دیے ہیں، اسی طرح آخری زمانہ میں ایک آخری خلیفہ کے آنے کی پیش گوئی بھی بڑے زور سے بیان فرمائی ہے اور اس کے نہ ماننے والوں کا نام فاسق رکھا ہے۔ (حجۃ اللہ، تقریر لاہور)

فتویٰ فسق کے بعد ترقی کرتے ہوئے اسلام سے محرومی کا فتویٰ دیا جاتا ہے:

"خدا تعالیٰ نے میرے پر ظاہر کیا ہے کہ ہر ایک وہ شخص جس کو میری دعوت پہنچی ہے اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا ہے، وہ مسلمان نہیں ہے۔"

اخبار "الفضل" قادیان ۱۵/۱/۳۵

اس طرح میدان تیار کر لینے کے بعد صاف و صریح طور پر کفر کا فتویٰ صادر کیا ہے:

"کفر دو قسم پر ہے۔ ایک کفر یہ کہ ایک شخص اسلام سے انکار کرتا ہے۔ دوسرے یہ کفر کہ مثلاً وہ مسیح موعود کو نہیں مانتا اور اس کو باوجود اتمامِ حجت کے جھوٹا جانتا ہے..... اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں قسم کے کفر ایک ہی قسم میں داخل ہیں۔" (حقیقت الوحی صـ ۱۷۹)

فتویٰ صادر کر دینے کے بعد جہنم کے ٹھیکیدار بن کر تمام مسلمانوں کو جہنمی قرار دیتے ہوئے ایک اشتہار بعنوان "معیار الاخیار" میں اعلان کرتا ہے:

"مجھے الہام ہوا جو شخص تیری پیروی نہیں کرے گا اور تیری بیعت میں داخل نہیں ہوگا، وہ خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرنے والا جہنمی ہے۔"

(تبلیغ رسالت جلد نہم صـ ۲۷)

قادیانیوں کا شوق تکفیر جس کے لیے وہ علماء اسلام کو مطعون کرتے ہیں، یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ترقی کرتے ہوئے اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے:

"خطبۂ الہامیہ میں حضرت مسیح موعود نے آنحضرت کی بعثت اوّل و ثانی کی باہمی نسبت کو ہلال اور بدر کی نسبت سے تعبیر فرمایا ہے۔ جس سے لازم آتا

ہے کہ بعثتِ ثانی کے کافر کفر میں بعثتِ اوّل کے کافروں سے بہت بڑھ کر ہیں۔" (الفضل ۱۵ جولائی ۱۹۱۵ء)

اب اس امر میں کیا شبہ باقی رہ گیا ہے کہ مرزا غلام احمد کو نبی اللہ نہ ماننے والے تمام دُنیا کے مُسلمان مرزائیوں کے نزدیک ابُوجہل، ابولہب اور دُوسرے معاندینِ اسلام سے کفر میں کہیں بڑھ کر ہیں اور اس مُلک میں بسنے والی غیر مسلم اقوام جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کی منکر ہیں، ان کے کفر کے مقابلہ میں مرزا غلام احمد کی نبوّت کے منکر یعنی مُسلمان مرزائیوں کے نزدیک بہت بڑے کافر ہیں۔ معاذاللہ

بس ایسی حالت میں اگر مُسلمان حکومت سے یہ مطالبہ کریں کہ مرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دیا جائے تو یہ کونسی غلط بات ہے، بلکہ یہ تو مرزا غلام احمد کی تعلیمات کے مطابق ان کی عین منشا کے موافق ہے اور اسی مقصد کی تکمیل کے لیے تو اُس نے اپنی "وحی" کو قرآن کریم کی طرح قطعی، یقینی اور لاریب بیان کیا اور صاحبِ کتاب، صاحبِ شریعت اور صاحبِ اُمّت ہونے کا دعویٰ کر کے عام مُسلمانوں سے قطعِ تعلق کا حکم دیا۔

قادیانی "کلام اللہ"

مرزا غلام احمد نے نبوّت کا جال بچھانے کے بعد یہ ضروری سمجھا کہ نئی اُمّت کی بُنیاد ڈالنے کے لیے صاحبِ کتاب ہونے کا بھی دعویٰ کر دیا جائے، اس لیے اُس نے صاحبِ وحی ہونے کا دعویٰ کیا اور کہا کہ جو کلام مجھ پر نازل ہوتا ہے، وہ بغیر ایک ذرّہ کے فرق کے قرآن کریم کی طرح اللہ کا کلام ہے جیسا کہ ذیل کی عبارات سے ظاہر ہوتا ہے:

"اور مَیں جیسا کہ قرآن شریف کی آیات پر ایمان رکھتا ہُوں، ایسا ہی بغیر فرق ایک ذرّہ کے خُدا کی اس کھُلی وحی پر ایمان لاتا ہوں جو مجھے ہُوئی...

.... اور مَیں بیت اللہ میں کھڑے ہو کر یہ قسم کھا سکتا ہوں کہ وہ پاک وحی

جو میرے پر نازل ہوتی ہے، وہ اس خدا کا کلام ہے جس نے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم پر اپنا کلام نازل کیا تھا۔"

(ایک غلطی کا ازالہ ۔ مصنّفہ مرزا غلام احمد)

اور اس تمام خرافات کو جسے مرزا غلام احمد الہامات اور وحی الٰہی سے تعبیر کرتا ہے، اس کے مجمُوعہ کو بیس سپاروں کے برابر حجم قرار دیتے ہُوئے لکھتا ہے:

"اور خدا کا کلام اس قدر مجھ پر نازل ہوا ہے کہ اگر وہ تمام لکھا جائے، تو بیس جزو سے کم نہ ہوگا۔" (حقیقت الوحی صد ۳۹۱)

اس لحاظ سے عام مسلمانوں کا قرآن تو تیس پاروں کا ہے لیکن مرزائیوں کا قرآن قدیم اور جدید کلامِ الٰہی کا مجمُوعہ گویا پچاس پاروں کا ہوگا۔ (معاذ اللہ من ذالک)

نئی اُمّت کا اعلان

نبوّت اور کتاب اللہ کا یقین دلانے کے بعد مرزا غلام احمد نے ان الفاظ سے ایک نئی اُمّت کی بُنیاد ڈالی:

"جو شخص نبوّت کا دعویٰ کرے گا اس دعویٰ میں ضرور ہے کہ وہ خُدا تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کرے اور نیز یہ بھی کہے کہ خُدا تعالیٰ کی طرف سے میرے پر وحی نازل ہوتی ہے اور نیز خلق اللہ کو وہ کلام سُنا دے جو اس پر خُدا تعالےٰ کی طرف سے نازل ہُوا ہے اور ایک اُمّت بنا دے جو اس کو نبی سمجھتی ہو اور اس کی کتاب کو کتاب اللہ جانتی ہو۔"

(ارشاد مرزا غلام احمد۔ الحکم، قادیاں نمبر ۱۲۔ جلد ۷)

اب اس نئے سلسلہ کے تمام لوازم اور مناسبات دیکھتے جائیے۔ اس کے مطالعہ سے اس امر کے فیصلہ کرنے میں کوئی دقّت نہیں ہوگی۔ خود مرزا غلام احمد اور اس کے خلفاء کے اعلانات اور ہدایات وغیرہ میرزائیوں کو تمام مسلمانوں سے الگ ایک اُمّت اور علیحدہ

جماعت قرار دینے میں کس قدر مؤیّد ہیں۔

قادیانی دین

"اللہ تعالیٰ نے اس آخری صداقت کو قادیانیت کے ویرانے میں نمودار کیا اور حضرت مسیح موعود کو اس اہم کام کے لیے منتخب فرمایا اور فرمایا" میں تیرے نام کو دُنیا کے کناروں تک پہنچا دوں گا۔ زور آور حملوں سے تیری تائید کروں گا اور جو دین تُو لے آیا ہے، اسے تمام دیگر ادیان پر بذریعہ دلائل و براہین غالب کروں گا"

(الفضل قادیان ۔۳ فروری ۱۹۳۵ء)

مُسلمانوں سے قطعِ تعلق

نئی اُمّت، نئی کتاب اور نئی شریعت مریدوں سے منوانے کے بعد مرزا غلام احمد نے اس سلسلہ کو مضبوط کرنے کے لیے تمام مسلمانوں سے میرزائیوں کو قطع تعلق کا حکم دیا۔ اس حکم کو ان الفاظ کے ساتھ اپنے مریدوں کے ذہن نشین کراتا ہے:

"یہ جو ہم نے دُوسرے مدّعیانِ اسلام سے قطع تعلّق کیا ہے۔ اوّل تو یہ خدا تعالیٰ کے حکم سے تھا، نہ اپنی طرف سے اور دوسرے وہ لوگ ریا پرستی اور طرح طرح کی خرابیوں میں حد سے بڑھ گئے ہیں اور اُن لوگوں کو اُن کی ایسی حالت کے ساتھ اپنی جماعت کے ساتھ ملانا یا ان سے قطع تعلّق رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ عُمدہ اور تازہ دودھ میں بگڑا ہوا دودھ ڈال دیں جو سڑ گیا ہے اور اس میں کیڑے پڑ گئے ہیں" (تشحیذ الاذہان قادیان جلد ۶ نمبر ۸)

تمام اسلامی فرقوں کے کلی متارکہ کے لیے تاکیدی حکم مرزا غلام احمد نے یوں دیا:

"تمہیں دُوسرے فرقوں کو جو دعویٰ اسلام کرتے ہیں بکلی ترک کرنا پڑے گا"

(حاشیہ تحفہ گولڑیہ ص ۲۷)

اسلامی اداروں سے بے تعلقی

مرزا غلام احمد قادیانی کا عام اسلامی اداروں کے متعلق جو رویہ تھا وہ بھی

کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ شخص ساری عمر نہ کسی اسلامی انجمن کا رُکن بنا اور نہ کسی انجمن کو چندہ دیا۔ البتہ خود مسلمانوں سے چندہ مانگتا اور خوب وصول کرتا رہا۔ سرور شاہ قادیانی اس مضمون پر اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

"حتیٰ کہ ایک دفعہ علی گڑھ میں قرآن مجید کی اشاعت کی غرض سے ایک انجمن بنائی گئی اور وہاں کے سیکرٹری نے ایک خاص خط بھیجا کہ ہماری انجمن میں آپ صاحبان میں سے بھی کچھ شریک ہوں مگر باوجود .... مولوی عبدالکریم ... کی کوشش کے حضور (مرزا) نے انکار ہی فرمایا۔ پھر سرسیّد صاحب کے چندۂ مدرسہ مانگنے کا واقعہ تو مشہور ہی ہے، یہاں تک کہ وہ ایک روپیہ تک بھی مانگتے رہے لیکن حضور (مرزا) نے شرکت سے انکار ہی فرمایا، حالانکہ اپنا خود مدرسۂ انگریزی جاری کیا ہوا تھا۔"

(کشف الاختلاف صہ ۴۲)

نماز علیحدہ پڑھو

مذکورہ بالا افتراق اور انقطاع کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ مُسلمانوں کے ساتھ مل کر اپنے اُمتیوں کو نماز پڑھنے کی اجازت دے، اس لیے مرزا نے بتاکید کہا:

"خُدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ایک جماعت تیار کرے، پھر جان بوجھ کر ان لوگوں میں گھسنا جس سے وہ الگ کرنا چاہتا ہے، منشاءِ الٰہی کی مخالفت ہے۔ مَیں تم کو بتاکید منع کرتا ہُوں کہ غیر احمدی کے پیچھے نماز نہ پڑھو۔"

(الحکم ۷۔ فروری ۱۹۰۳ء)

اور اس حکم کو زیادہ وسعت دیتے ہُوئے کہتا ہے:

"پس یاد رکھو! جیسا کہ خُدا نے مجھے اطلاع دی ہے تمہارے پر حرام اور قطعی حرام ہے کہ کسی مکفّر اور مکذّب یا متردّد کے پیچھے نماز پڑھو بلکہ چاہیے

کہ تمہارا وہی امام ہو جو تم میں سے ہو۔ . . . تمہیں دُوسرے فرقوں کو جو دعوئے اسلام کرتے ہیں، بکلی ترک کرنا پڑے گا۔" (اربعین نمبر ۳ صہ ۳۴ کا حاشیہ)

حکیم نُورالدّین کا فتویٰ

میاں محمود حب حج کے واسطے گیا، تو اپنی ایک کتاب میں لکھتا ہے کہ پہلے ہی دن طواف کے وقت مغرب کی نماز کا وقت آگیا تو اُس نے ہر چند ٹلنے کی کوشش کی مگر راستے رُک گئے تھے اور نماز شروع ہو گئی تھی ۔ تو اُس کے نانا نے جو اس کے ہمراہ تھا کہا کہ حکیم نُورالدّین (خلیفہ اوّل متنبّی قادیاں) کا حکم ہے کہ مکّہ میں ان کے پیچھے نماز پڑھ لو۔ چنانچہ اُنہوں نے مغرب کی اور اس کے بعد عشاء کی نماز بھی پڑھ لی، لیکن حرم سے فارغ ہونے کے بعد جب گھر گئے تو دونوں نمازیں دُہرالیں۔ جب وطن واپس آئے تو کسی نے حکیم نُورالدّین کے پاس اس کا ذکر کیا۔ اُس نے جواب میں کہا:

" ہم نے ایسا کوئی فتویٰ نہیں دیا۔ ہماری یہ اجازت تو ان لوگوں کے لیے ہے جو ڈرتے ہیں اور جن کے ابتلا کا ڈر ہے، وہ ایسا کر سکتے ہیں کہ اگر کسی جگہ گِھر گئے ہوں تو غیر احمدی کے پیچھے نماز پڑھ لیں اور پھر آکر دُھرالیں۔"

(آئینۂ صداقت صہ ۹۱ مصنّفہ میاں محمود احمد خلیفہ قادیان)

مُسلمانوں کا جنازہ نہ پڑھو

مُسلمانوں سے کامل علیٰحدگی اور مکمّل انقطاعِ تعلق کرنے اور سچ مچ ایک الگ اُمّت بنانے کے لیے مُسلمانوں کی میّت اگرچہ چھوٹے معصوم بچّے کی ہو اس کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے منع کر دیا گیا:

" غیر احمدی مُسلمانوں کا جنازہ پڑھنا جائز نہیں حتیٰ کہ غیر احمدی معصوم بچّے کا بھی جنازہ پڑھنا جائز نہیں۔"

(انوارِ خلافت صہ ۹۲ مصنّفہ محمود)

اور اسی کتاب کے صہ ۱۹ پر میاں محمود اپنے باپ مرزا غلام احمد کے متعلق ایک واقعہ لکھتا ہے:

"آپ کا ایک بیٹا فوت ہو گیا جو آپ کی زبانی طور پر تصدیق کرتا تھا۔ جب وہ مرا تو مجھے یاد ہے آپ ٹہلتے جاتے اور فرماتے کہ اُس نے کبھی شرارت نہیں کی تھی بلکہ میرا فرمانبردار ہی رہا..... اور یہ بھی فرماتے کہ میری بڑی عزّت کیا کرتا تھا، لیکن آپ نے اس کا جنازہ نہ پڑھا۔"

جس مذہب کے بانی کا اپنے فرمانبردار بیٹے کے ساتھ یہ سلوک ہے کوئی مُسلمان اس گروہ سے کسی ہمدردی یا کسی سلوک کی کیا اُمید رکھ سکتا ہے۔

"مُسلمانوں سے نکاح حرام"

تاکہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ رہ جائے جس سے اُمّتِ مرزائیہ کا اُمّتِ مسلمہ کے ساتھ تعلق باقی رہے، اس لیے نکاح کے متعلق یہ حکم سُنایا گیا:

"حضرت مسیح موعود کا حکم اور زبردست حکم ہے کہ کوئی احمدی غیر احمدی کو لڑکی نہ دے۔" (برکاتِ خلافت صہ ۷۵)

میاں محمود ایک دُوسری کتاب میں مسلمانوں کے ساتھ نکاح کو ہندوؤں اور عیسائیوں کے ساتھ نکاح کے مماثل قرار دیتے ہُوئے لکھتا ہے:

"جو شخص غیر احمدی کو رشتہ دیتا ہے، وہ یقیناً مسیح موعود کو نہیں سمجھتا اور نہ یہ جانتا ہے کہ احمدیّت کیا چیز ہے؟ کیا غیر احمدیوں میں کوئی ایسا بے دین ہے جو کسی ہندو یا عیسائی کو اپنی لڑکی دے۔ ان لوگوں کو تم کافر کہتے ہو، مگر تم سے اچھے رہے کہ کافر ہو کر بھی کسی کافر کو لڑکی نہیں دیتے، مگر تم احمدی کہلا کر کافر کو دیتے ہو۔"

(ملائکۃ اللہ صہ ۴۶)

حکیم نورالدین کا مسلم مقاطعہ

میاں محمود اپنے باپ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"ایک شخص نے بار بار پوچھا اور کئی قسم کی مجبوریوں کو پیش کیا، لیکن آپ نے اس کو یہی فرمایا کہ لڑکی بٹھائے رکھو، لیکن غیر احمدیوں میں نہ دو۔ آپ کی وفات کے بعد اس نے غیر کو لڑکی دے دی، تو حضرت خلیفۂ اوّل نے اس کو احمدیوں کی امامت سے ہٹا دیا اور جماعت سے خارج کر دیا اور اپنی خلافت کے چھ سالوں میں اس کی توبہ قبول نہ کی باوجودیکہ وہ بار بار توبہ کرتا رہا۔" (انوارِ خلافت صہ ۹۴)

اقتصادی مقاطعہ

میرزائیوں سے اتحاد کے متمنّی مسلمان اس حقیقت کو نہیں معلوم کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جس مذہب کی بنیاد ان تعلیمات پر ہے جن کا ذکر اوپر کر چکا ہوں کہ وہ ہر معاملہ میں مسلمانوں کے ساتھ علیحدگی اور افتراق کو اپنی حیات کے لیے ضروری سمجھتے ہوں نہ صرف یہ بلکہ تمام غیر مسلم اقوام کے کفر کے مقابلہ میں مسلمانوں کو بہت بڑے کافر سمجھتے ہوں۔ کاش وہ چشمِ بصیرت سے ان مصائب کا مطالعہ کرتے جو قادیان میں رہنے والے مسلمانوں پر خلیفۂ قادیان اور اس کی جماعت کی طرف سے نازل کیے جاتے رہے ہیں۔ اگر ان کو مباہلہ والوں کی دردناک داستان سُننے کی فرصت نہیں ملی۔ اگر ان کو شہید محمد حسین کے پسماندگان سے ان کی زہرہ گداز تکالیف معلوم کرنے کے لیے وقت میّسر نہیں ہوا، اگر اس وحشت انگیزی کی خبریں ان کے کانوں تک نہیں پہنچیں جو میرزائی رضا کار قادیان میں وقتاً فوقتاً پھیلاتے رہے ہیں، کم از کم مسٹر کھوسلہ کا فیصلہ پڑھنے کی فرصت تو مل گئی ہو گی جس میں ان کو نظر آیا ہو گا:

"انہوں نے اپنے دلائل دُوسروں سے منوانے اور اپنی جماعت کو ترقّی

دبینے کے لیے ایسے حربوں کا استعمال شروع کیا جنہیں ناپسند کیا جائے گا۔ جن لوگوں نے قادیانیوں کی جماعت میں شامل ہونے سے انکار کیا، انہیں مقاطعہ، قادیان سے اخراج اور بعض اوقات اس سے بھی مکروہ تر مصائب کی دھمکیاں دے دے کر دہشت انگیزی کی فضا پیدا کی، بلکہ بسا اوقات اُنہوں نے ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنا کر اپنی جماعت کے استحکام کی کوشش کی۔" (فیصلہ مسٹر کھوسلہ)

جو جماعت نہ صرف مذہبی لحاظ سے مسلمانوں کو کافر سمجھتی ہو، بلکہ اقتصادی طور پر بھی مسلمانوں کے ساتھ بد ترین سلوک روا رکھتی ہو، اس سے نیکی کی کیا توقع ہو سکتی ہے؟ یہاں پر مرزائی سرکلر کی نقل شائع کرتا ہوں، شاید ہمارے نکتہ چیں احباب کی تسکین خاطر کا سامان مہیا ہو سکے۔

مرزائیوں کا اقتصادی اقرار نامہ

"قادیان کی احمدیہ جماعت نے جو معاہدۂ ترقیِ تجارت تجویز کیا ہے، منظور ہے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ ضروریاتِ جماعتِ قادیان کا خیال رکھوں گا اور قادیانی مدیرِ تجارت کو جو حکم کسی چیز کے بہم پہنچانے کا دیں گے، اس کی تعمیل کروں گا اور جو حکم ناظر امورِ عامہ دیں گے، اس کی بلا چون و چرا تعمیل کروں گا..... ہر قسم کا سودا احمدیوں سے خریدوں گا۔ معاہدہ کی خلاف ورزی کی صورت میں ۲۰ روپے سے لے کر ۵۰۰ روپے تک جرمانہ ادا کروں گا۔"

یہ ہے وہ جماعت جس کے ساتھ ہمیں بعض مسلم جرائد اور بعض سیاسی راہنما اتحاد اور اتفاق کی دعوت دیتے ہیں اور مرزائیوں کے اختلاف کو فروعی اختلاف قرار دیتے ہیں۔ اگر اُن کے پاس چشمِ بصیرت موجود ہے، تو اس سے ضرور سبق حاصل کریں گے۔

مرزائیوں کے مسلم ہمدرد

مرزائیوں سے ہمدردی رکھنے والے مسلمان

اگر ہماری معروضات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھیں، تو کیا وہ مرزا محمود کی اس تقریر سے بھی سبق حاصل نہیں کریں گے:

"ساری دُنیا ہماری دُشمن ہے بعض لوگ، اُن کو ہم سے مطلب ہوتا ہے تو ہمیں شاباش کہتے ہیں جس سے بعض احمدی یہ خیال کر لیتے ہیں کہ وہ ہمارے دوست ہیں۔ حالانکہ جب تک ایک شخص خواہ وہ ہم سے کتنی ہمدردی کرنے والا ہو، پُورے طور پر احمدی نہیں ہو جاتا ہمارا دُشمن ہے۔"

(تقریر میاں محمود ۲۵ اپریل ۱۹۳۰ء)

اسلامی سلطنت کی تباہی پر خوشی

جنگِ عظیم کا وہ الم آفریں زمانہ جب کہ حجاز، عراق، فلسطین اور شرقِ اُردن پر اسلامی عظمت کا علم سرنگوں ہو رہا تھا اور صلیب، ہلال کے خلاف کامیاب جنگ لڑ کر صدیوں کے بعد بیت المقدس واپس لینے میں مصروف تھی اور مشرق سے مغرب تک ہر مُسلم کا گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا، عین اس زمانے میں مرزائی اسلام کی شکست پر اپنے مرکز قادیان میں جشنِ شادمانی منا رہے تھے۔ "الفضل" قادیان ۱۹ نومبر ۱۹۱۸ء کے سرورق پر "قادیان میں جشنِ مسرّت" کے عنوان سے یہ اعلان شائع کیا گیا:

"۱۳ تاریخ جس وقت جرمنی کے شرائط منظور کر لینے اور التوائے جنگ کے کاغذ پر دستخط ہو جانے کی اطّلاع قادیان پہنچی، تو خوشی اور انبساط کی ایک لہر برقی سُرعت کے ساتھ تمام لوگوں کے قلوب میں سرایت کر گئی اور جس نے اس خبر کو سُنا نہایت شاداں و فرحاں ہُوا...... حضرت خلیفۃ المسیح ثانی کی طرف سے مُبارکباد کے تار بھیجے گئے اور حضور نے پانچ سو روپیہ اظہارِ مسرّت کے طور پر ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر گورداسپور کی خدمت میں بھجوایا کہ آپ جہاں پسند فرمائیں خرچ کریں۔ بیشتر ازیں

چند روز ہوئے کہ ٹرکی کے ہتھیار ڈالنے کی خوشی میں حضور نے پانچ ہزار رُوپے جنگی اغراض کے لیے ڈپٹی کمشنر صاحب کی خدمت میں بھجوائے تھے۔"

ان تمام تفصیلات کے بعد کون سنگدل مُسلمان ہے جو مرزائیوں کے رویّہ سے متأثر نہ ہو اور خود انہی کی تعلیمات اور اُن کے طرزِ عمل کی بنا پر اس مطالبہ کی ہمنوائی میں تامّل کرے کہ مرزائی جماعت مسلمانوں سے بالکل الگ ایک جماعت ہے اور اپنی ہی تحریروں کی بنا پر اس کی مستحق ہے کہ اسے مُسلمانوں سے الگ ایک اقلیّت قرار دیا جائے۔

شعر و ادب کا ذوق

انتخاب کلام میر تقی میر

متفرق اشعار

دیوان ذوق سے انتخاب

فارسی کلام کا انتخاب

انتخاب کلام حافظ شیرازی

نظیری نیشاپوری کی غزلوں کا انتخاب

اچھّے شعر سے لُطف اندوز ہوتے تھے۔ کبھی کبھی شعر سناتے بھی تھے۔ ایک دن موقع کی مناسبت سے مَیں نے یہ شعر پڑھا:

اندریں رہ می تراش و می خراش
تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

انہوں نے برجستہ یہ شعر سُنایا:

ہے شوق و ضبطِ شوق میں دن رات کش مکش
دل مجھ کو، مَیں ہُوں دل کو پریشاں کیے ہُوئے

ایک زمانے میں کسی مقصد کے حصُول کے لیے مَیں تگ و دو کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں اپنے ایک حریف کے ہاں بھی مجھے دو چار بار جانا پڑا۔ انہیں خبر ہُوئی تو مسکرائے اور ظرافت آمیز لہجے میں دو تین بار یہ شعر پڑھا:

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا، کِیا ذلیل
میں کُوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

مَیں یہ دیکھ کر خوش ہوتا تھا کہ اُن میں وہ تقشّف نہ تھا جو انسان کو پتھر بنا دیتا ہے اور انسانیت کا جوہر انسان سے اُچک لیتا ہے۔

اُن کی ایک بیاض میرے پاس موجود ہے جس میں ایک طرف حافظ، عرفی، فیضی،

نظیریؔ، جامیؔ، گرامیؔ، علی حزیںؔ، قرۃ العین طاہرہ، غالبؔ، اقبالؔ اور دُوسرے فارسی اساتذہ کے چیدہ چیدہ اشعار ان کے اپنے ہاتھ سے لکھّے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف غالبؔ، میرؔ، داغؔ، انشاؔ، سوداؔ، مومنؔ اور دُوسرے اُردو اساتذہ کا انتخاب ہے۔ آخر میں اپنے بعض ہم عصر شعراء کا کلام بھی درج کیا ہے۔ یہ انتخاب اُن کے حسنِ ذوق کی خبر دیتا ہے۔ اس بیاض پر کلامِ ذوق کے انتخاب کے آخر میں ۱۸ مئی ۱۹۳۲ء نیو سنٹرل جیل مُلتان لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیاض میں اکثر اشعار عہدِ جوانی میں لکھے گئے۔ شعروں کے انتخاب سے اُن کے طبعی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ اشعار ایسے منتخب کیے ہیں جن میں زندگی ہے، رجائیت ہے، فعّالیّت ہے۔ بعض بڑے تیکھے اور شوخ اشعار بھی بیاض میں ملے۔ بعض نظمیں انقلابی ہیں۔ وہ اشعار جن میں زنجیروں، بیڑیوں، قید خانوں اور پھانسیوں پر لٹکنے کا ذکر ہے، بڑی دلچسپی سے نقل کیے گئے ہیں۔ کچھ عارفانہ کلام بھی بیاض میں درج کیا گیا ہے۔ بعض ایسے شعر بھی بیاض میں لکھے ہیں، جن سے حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسّلام سے والہانہ محبت ٹپکتی ہے۔ بیاض کی ضخامت اچھّی خاصی ہے۔ اس خرمن کے چند خوشے پیشِ خدمت ہیں:

انتخابِ کلامِ میر تقی میرؔ علیہ الرحمہ

کیا بود و باش پُوچھو ہو پورب کے ساکنو! ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پُکار کے
دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لُوٹ کے ویران کر دیا ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

لگا نہ دل کو کہیں کیا سُنا نہیں تُو نے جو کچھ کہ میرؔ کا اس عاشقی نے کام کیا

پہنچا تو ہوگا سمعِ مبارک میں حالِ میرؔ — اس پر بھی جی میں آئے تو دل کو لگائیے

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ — نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

جی میں تھا اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میرؔ — پھر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

کہتے تھے اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے لیک — وہ آگیا تو سامنے اس کے نہ آئی بات

دل میں مُسوّدے تھے بہت پر حضورِ یار — نکلا نہ ایک حرف بھی میری زبان سے

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا — دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند — یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون ارم ہے کیا احرام — کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
میرؔ کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو اُن نے تو — قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی — اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے — دل ہے گویا چراغ مفلس کا

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے — یہ نگر سو مرتبہ لُوٹا گیا

ہم فقیروں سے کج ادائی کیا — آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ — مذہبِ عشق اختیار کیا

وصل و ہجراں یہ جو دو منزل ہیں راہِ عشق کی — دل غریب ان میں خُدا جانے کہاں مارا گیا

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میرؔ — پھر ملیں گے اگر خدا لایا

غیر کے کہنے سے اُن نے ہمکو مارا بے گناہ — یہ نہ سمجھا وہ کہ واقع میں بھی کچھ تھا یا نہ تھا

جامۂ احرامِ زاہد پر نہ جا — تھا حرم میں لیک نا محرم رہا

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی — ایک مدّت تک وہ کاغذ نم رہا

گر زمزمہ یہی ہے کوئی دن تو ہم صفیر — اس فصل ہی میں ہم کو گرفتار دیکھنا

مکّے گیا، مدینہ گیا، کربلا گیا — جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آگیا

چمن میں پھول تو اب کے ہزار رنگ کھلے — دماغ کاش کہ اپنا بھی ٹک وفا کرتا

ب

میری طاعت کو قبول آہ کہاں تک ہوگا سبحہ اک ہات میں ہے، جام ہے اک ہات کے بیچ

ر

کچھ ہو رہیگا عشق و ہوس میں بھی امتیاز آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

مرتے ہیں میرؔ سب، پہ نہ اس بیکسی کے ساتھ ماتم ہیں تیرے کوئی نہ رویا پکار کر

گ

میرؔ بندوں سے کام کب نکلا مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

م

نہ مل میرؔ اب کے امیروں سے تو ہوئے ہیں فقیر اُن کی دولت سے ہم

ن

دم آخر ہے، بیٹھ جا، مت جا صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں

میرؔ صاحب بھی ترے کوچہ میں شب آتے ہیں لیک جیسے دریوزہ گری کرنے گدا جاتے ہیں

تلوار کے تلے ہی گیا عہدِ انبساط مر مر کے ہم نے کاٹی ہیں اپنی جوانیاں

باغباں ہم سے خشونت سے نہ پیش آیا کر عاقبت نالہ کشاں بھی تو ہیں درکارِ چمن

عشق کا گھر ہے میرؔ سے آباد ایسے پھر خانماں خراب کہاں

عشق کرتے ہیں اُس پری رُو سے — میرؔ صاحب بھی کیا دوانے ہیں

و

رات تو ساری گئی سُنتے پریشاں گوئی — میرؔ جی کوئی گھڑی تُم بھی تو آرام کرو

ہوگا کسو دیوار کے سایہ میں پڑا میرؔ — کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

مُجھ دوانے کی مت ہلا زنجیر — کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غُل ہو

یوں رفتہ اور بے خود کب تک رہا کرو گے — تم اب بھی میرؔ صاحب اپنے تئیں سنبھالو

سر خاکِ آستاں پہ تمہاری رہا مدام — اس پر بھی یا نصیب جو تُم بے وفا کہو

ہے دُور ادب سے تم کھڑے میں پاکشیدہ ہوں — مت آئیو جنازے کی میری نماز کو

سب میرؔ کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں میں اپنے — اس خاکِ رہ عشق کا اعزاز تو دیکھو

ہ

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم — ہو گئے خاک انتہا ہے یہ

خوں بستہ بارے رہنے لگیں اب تو یہ مژہ — آنسو کی بُوند جس سے ٹپکتی تھی گاہ گاہ

ی

دیکھ تو دل کہ جاں سے اُٹھتا ہے — یہ دھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے

یُوں اُٹھے آہ اُس گلی سے ہم | جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے

سراپا آرزو ہونے نے بندہ کر دیا ہم کو | وگرنہ ہم خُدا تھے گر دلِ بے مدّعا ہوتے

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں | عیب بھی کرنے کو ہُنر چاہیے

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے | پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہُوں | حالت اب اضطراب کی سی ہے
مَیں جو بولا کہا کہ یہ آواز | اسی خانہ خراب کی سی ہے
مِیرؔ ان نیم باز آنکھوں میں | ساری مستی شراب کی سی ہے

کوئی تجھ سا بھی کاش تُجھ کو ملے | مدّعا ہم کو انتقام سے ہے

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے | عمر نے ہم سے بے وفائی کی

ہر کوئی اس مقام پر دس روز | اپنی نوبت بجائے جاتا ہے

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ | کتنے آنسو پلک تک آئے تھے
مِیر صاحب رُلا گئے سب کو | کل وہ تشریف یاں بھی لائے تھے

کوئی رہنے والی ہے جانِ عزیز | گئی گر نہ امروز فردا گئی

لگوائے پتھر اور بُرا بھی کہا کیے — تم نے حقوق دوستی کے سب ادا کیے

برقع کو اُٹھا چہرے سے وہ بُت اگر آوے — اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے
جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے — اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

چمن کا نام سُنا تھا ولے نہ دیکھا ہائے — جہاں میں ہم نے قفس ہی میں زندگانی کی

ہم ہُوئے تم ہُوئے کہ میر ہُوئے — اس کی زُلفوں کے سب اسیر ہوئے

پھر موجِ ہوا پیچاں اے میر نظر آئی — شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

گزار شہرِ وفا میں سمجھ کے کر مجنوں — کہ اس دیار میں میر شکستہ پا بھی ہے

اب کے بھی سیرِ باغ کی جی میں ہوس رہی — اپنی جگہ بہار میں کنجِ قفس رہی

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دُعا کر چلے
جو تجھ بن نہ جینے کو کہتے تھے ہم — سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
کوئی نا امیدانہ کرتے نگاہ — سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے
جبیں سجدے کرتی ہی کرتی گئی — حقِ بندگی ہم ادا کر چلے
پرستش کی یاں تک کہ اے بُت تجھے — نظر میں سبھوں کی خُدا کر چلے

کرو توکّل کہ عاشقی میں نہ یوں کرو گے تو کیا کرو گے / الم جو یہ ہے تو دردمندو! کہاں تلک تم دوا کرو گے

بعد اک عمر کہیں تم کو جو تنہا پایا / ڈرتے ڈرتے ہی کچھ احوال سنایا ہم نے

مصائب اور تھے پر دل کا جانا / عجب اِک سانحہ سا ہو گیا ہے

بے مہر و وفا ہے، وہ کیا رسم وفا جانے / اُلفت سے، محبت سے، مل بیٹھنا کیا جانے

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز / وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

پتّا پتّا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے / جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

عالم عالم عشق جنوں ہے دُنیا دُنیا تہمت ہے / دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

نسبت اس آستاں سے کچھ نہ ہوئی / برسوں تک ہم نے جبہہ سائی کی

مستی شراب کی سی ہے یہ آمدِ شباب / ایسا نہ ہو کہ تم کو جوانی نشا کرے

موقوف غمِ میرؔ کہ شب ہو چکی ہمدم / کل رات کو پھر باقی یہ افسانہ کہیں گے

یہ تو تھیں چند جھلکیاں انتخاب میرؔ کی، اب ہم اُن کی بیاض سے اُردو زبان کے

اساتذہ کے متفرق اشعار نقل کرتے ہیں تاکہ اُن کے شعر و ادب کے رجحانات کا اندازہ ہو سکے۔

متفرق اشعار

دینا وہ اس کا ساغرِ مے یاد ہے نظامؔ
منہ پھیر کر اُدھر کو اِدھر کو بڑھا کے ہاتھ

کس کس طرح ستاتے ہیں یہ بُت ہمیں نظامؔ
ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خُدا نہ ہو

مری ٹوٹی ہُوئی توبہ کے ٹکڑے
کوئی لا دے درِ پیرِ مغاں سے
کہ اُن کو جوڑ کر پھر توڑ ڈالوں
میں اِک جامِ شرابِ ارغواں سے

(نظام رامپوری)

کھلتا نہیں کچھ حال کِسے قتل کریں گے
باندھے ہُوئے پھرتے ہیں وہ خنجر کئی دن سے

ہمیں وہ خط لکھا کرتے تھے پہلے کس تکلّف سے
بڑا القاب ہوتا تھا، بڑی تمہید ہوتی تھی

داغ کی شکل دیکھ کر بولے
ایسی صُورت کو پیار کون کرے

(داغ)

مجھے روز اس کے غم میں یونہی ساری رات کرنا
کہیں چُھپکے چُھپکے رونا، کہیں دل سے بات کرنا
یہ غنیؔ کو کیا ہوا ہے کئی دن سے دیکھتے ہیں
نہ کسی کی بات سُننا، نہ کسی سے بات کرنا

(غنی بنارسی)

لے چل، ہاں منجدھار میں لے چل، ساحل ساحل کیا چلنا
میری فکر ذرا نہ کر مَیں خوگر ہُوں طوفانوں کا

نیم بسمل اُس نے گر چھوڑا تو کچھ پروا نہیں — پر یہ غم ہے اعتبارِ دستِ قاتل اُٹھ گیا

شیفتہ وہ کہ جس نے ساری عمر — دینداری و پارسائی کی
آخرِ کار مے پرست ہُوا — شان ہے تیری کبریائی کی

(شیفتہ)

اُٹھو صنم کدے والو تلاش لازم ہے — ادھر ہی ٹوٹ پڑیں گے اگر خُدا نہ ملا
تمام زادِ سفر راستے میں لُٹ جاتا — خُدا کا فضل ہوا کوئی رہنما نہ ملا
وہ گمرہی کی تمنّا، وہ رہبروں کا ہجوم — غرض یہ ہے کہ ہمیں کوئی رہنما نہ ملا

(حفیظ)

مظلوم کی فریاد پہ طیش آتا ہے انکو — کہتے ہیں زباں کاٹ کے حال اپنا سُنا اور

(ناصر حسن پوری)

تواناؤں کے بس میں ہے سرِ پائے حقارت سے — کروڑوں ناتوانوں کی تمناؤں کو ٹھکرانا
دبا دینا کسی مظلوم کی آہوں کو سینے میں — کسی بیکس کو ساری عمر آنسو خوں کے رلوانا
ہے جنکے دل میں آزادی کی دُھن ان نوجوانوں کو — وطن کے عشق کی پاداش میں سُولی پہ لٹکانا
بہا دینا کسی کی راکھ کو ستلج کی موجوں میں — کسی کی لاش اٹک کے پار خاک و خوں میں تڑپانا
ملوکیت پرستوں کے لیے سب کچھ یہ آساں ہے — مگر دشوار ہے قانونِ فطرت کا بدل جانا
زوال اس سلطنت کا ٹل نہیں سکتا ہے ٹالے سے — خود اپنی ہی رعایا سے پڑا ہو جس کو ٹکرانا
مکافاتِ عمل سے گر وہ غافل ہیں تو بیشک ہوں — ہمارا کام تھا نیک اور بد کا اُن کو سمجھانا

(مولانا ظفر علی خاں)

گھر بھرا انگریز کا لندن میں دیکھ آیا ہے تو — چل کے دہلی میں ہماری خانہ ویرانی بھی دیکھ

(مولانا ظفر علی خاں)

تم ہی سے اے مجاہدو جہان کو ثبات ہے
شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے
تمہاری مشعلِ ہدیٰ فروغِ شش جہات ہے
تمہاری ضو سے پر ضیا جبین کائنات ہے
کواکب بقا ہو تم جہاں اندھیری رات ہے

عبدالمجید سالکؔ

اے دل کی باتیں پوچھنے والے کیسے بتائیں کیا دل تھا
اک خاک اور خون کی صورت تھی جو درد میں ڈوبی ہوتی تھی
باتوں میں کبھی کٹ جاتی تھی اور اب آنکھوں میں کٹتی ہے
یہ رات پہاڑ سی اک دن تھا جب کتنی چھوٹی ہوتی تھی
وہ صبح بھی کیا تھی جس کے لیے میں رات کی رات تڑپتا تھا
جو آتے آتے آتی تھی جو ہوتے ہوتے ہوتی تھی

(فراق گورکھپوری)

رخصت

کبھی میں یاد بھی آؤں تو مت آنسو بہانا تم
یہی بہتر ہے مجھ کو رفتہ رفتہ بھول جانا تم
بھلا کیا فائدہ اک جی جلے پر جان کھونے کا
نہ ہونا سوگ میں شامل نہ تربت ہی پہ آنا تم
نہ کرنا یاد میری دکھ بھری آنکھوں کی مایوسی
تصوّر میں بھی یہ کلفت فزا منظر نہ لانا تم
جو یاد آئے کوئی اپنی جفا دل مت برا کرنا
غذا ہے دکھ مری، ناحق نہ جی اپنا دکھانا تم
مری بربادیوں کی یاد میں رونے سے کیا حاصل
نہ اپنے آنسوؤں کے بے بہا گوہر لٹانا تم
مری ہستی کو اک خواب پریشاں فرض کر لینا
گزشتہ صحبتوں کی یاد بھی دل میں نہ لانا تم
مرے اقرارِ الفت کو سمجھنا قصّۂ باطل
نہ دل کو اب مری حسرت کے افسانے سنانا تم
کوئی اچھا کہے مجھ کو تو سننا بھی نہ بات اسکی
برا کوئی کہے تو صدق دل سے مان جانا تم

(حامد علی خان)

یا تو خرد کو ہوش کو مستی و بے خودی سکھا
یا نہ کسی کو ساتھ لے اسکے حریمِ ناز میں
موجِ نسیمِ صبح میں بوئے صنم کدہ بھی ہے
اور بھی جان پڑ گئی کیفیتِ نماز میں
شورشِ عندلیب نے روحِ چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں

(اصغر گونڈوی)

کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے	دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

(بہادر شاہ ظفر)

بس یہی نا تڑپ کے کاٹی رات	تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی

یہ زندگی زندگی نہ سمجھو کہ زندگی سے مراد ہیں بس	وہ عمرِ رفتہ کی چند گھڑیاں جو انکی صحبت میں کٹ گئی ہیں

سُنا ہے کہ اک آگرہ کا مسافر	اُٹھائے ہوئے سر پہ ویدوں کے بستے
عراق و عرب میں وہ جا کر پکارا	نمستے علیکم، علیکم نمستے

(مولانا ظفر علی خاں)

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں	بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں
نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی	تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

(انشاءؔ)

خالِ مشکیں بھی ہے اور زُلفِ سیہ فام بھی ہے	مُرغِ دل کیوں نہ پھنسے دانہ بھی ہے دام بھی ہے

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم	لاکھ ناداں ہوئے، کیا تجھ سے بھی ناداں ہونگے
پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی	پھر وہی پاؤں وہی خارِ مغیلاں ہونگے
عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ	آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

(مومنؔ)

وہ ہنس ہنس کے نشتر چبھویا کیے	مَیں رو رو کے دامن بھگویا کیے

(امیر مینائی)

اپنی تصویر پہ نازاں ہو، تمہارا کیا ہے	آنکھ نرگس کی، دہن غنچے کا، حیرت میری

میں اپنی چشمِ شوق کو الزام خاک دوں — تیری نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانیے گا، ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا — جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

کچھ زہر نہ تھی شرابِ انگور — کیا چیز حرام ہو گئی

(داغ)

ہاتھ نکلے دونوں اپنے کام کے — دل کو تھاما اُن کا دامن تھام کے

داغ کے سب حرف لکھتے ہیں جُدا — ٹکڑے کر ڈالے ہمارے نام کے

(داغ)

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے — مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

(اقبال)

سوداؔ قمارِ عشق میں خسرو سے کوہکن — بازی اگرچہ پا نہ سکا، سر تو کھو سکا

کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز — اے روسیاہ! تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

(سوداؔ)

امیرؔ اس بے وفا دُنیا کی لذّت پہ نہ تم جانا — بڑی عیّار ہے، مکّار ہے، ظاہر میں بھولی ہے

(امیرؔ مینائی)

آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر — ناخُدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا

(حفیظؔ)

توبہ، توبہ، شیخ جی! توبہ کا پھر کس کو خیال — جب وہ خود کہہ دے کہ پی تھوڑی سی پی میرے لیے

(حفیظؔ)

تری جفائیں بھی سہتا رہوں، دُعا بھی کروں — تجھی سے رحم کی چلّا کے التجا بھی کروں،

یہ دو دو کام تو بس کے مرے نہیں زاھد　　کہ بُت کدے میں رہوں طاعتِ خدا بھی کروں

(میکش)

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی　　جو خود بڑھ کر اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

آہستہ برگِ گل بفشاں بر مزارِ ما　　بس نازک است شیشۂ دل در کنارِ ما

پی کے ہم تم جو چلے جھومتے میخانے سے　　جُھک کے کچھ بات کہی شیشے نے پیمانے سے
نیچی نظروں سے مری جان مجھے کیوں دیکھا　　لوگ کچھ اور ہی سمجھے ترے شرمانے سے

دل کو خیالِ یار نے مخمور کر دیا　　ساغر کو رنگِ بادہ نے پُر نور کر دیا
گستاخ دستیوں کا نہ تھا مجھ میں حوصلہ　　لیکن ہجوم شوق نے مجبور کر دیا

(حسرت)

اب تو تیری جفا سے یہ مانگے ہوں میں دُعا　　ظالم خدا کرے کہ کہیں تو لگائے دل
اور جب یہ تو فدا ہو وہ ظالم ہو اس قدر　　جو مطلقاً ترا ابھی نہ خاطر میں لائے دل
آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں　　تو ہائے گُل پکار میں چلّاؤں ہائے دل

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو　　دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

(سودا)

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی　　بھیجنی ہیں ایک کم سن کے لیے

(امیر مینائی)

اس نزاکت میں سُنے کب وہ کسی کی فریاد　　غنچہ چٹکے تو کہے سر میں دھمک ہوتی ہے

سہمے جاتے ہیں، ڈرتے جاتے ہیں وہ عاشق سے کم سِنی ہے ابھی، اس سِن میں جھجک ہوتی ہے

کسی کو دیکھ کے ساقی کے ایسے ہوش اُڑے شراب سیخ پہ ڈالی، کباب شیشے میں

مرے آہ و نالہ سے ڈرا ہے ستمگر دیارِ محبّت کا ہوں انقلابی
عمل جب نہیں، کچھ نہیں شیخ صاحب فضیلت پناہی، مشیخت مآبی

مِلنے کا وعدہ مُنہ سے تو اُن کے نکل گیا پُوچھی جگہ جو میں نے، کہا ہنس کے خواب میں

ہجرِ مے کر رہا تھا منبر پر ہم جو پہُنچے تو پی گیا زاھد

چاہت کا مزا بعد ہمارے نہ ملے گا ہر شخص سے تم آپ کہو گے، ہمیں چاہو

(داغ)

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

(غالبؔ)

نظر لگے نہ کہیں اس کے چشم و ابرو کو یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

بہ ترمیم بیگم مولانا محمد علی قصُوری (بمبئی)

بد نہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سُنے ہے یہ گُنبد کی صدا جیسی کہے، ویسی سُنے

ہو عیب کی خُو یا کہ ہنر کی عادت مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت

چھُٹتے ہی چھُٹے گا اُس گلی میں جانا　　عادت اور وہ بھی عُمر بھر کی عادت

(حالی)

منہ پہ لاؤں تو یہ کم ظرف بہک جائینگے　　بات جو پیرِ خرابات نے سمجھائی ہے

(اسماعیل میرٹھی)

اے درد کہوں کس سے بنا رازِ محبت　　عالم میں سخن چینی ہے یا طعنہ زنی ہے

(درد)

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں　　دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

سرشکِ گرم کی حدّت کو پُوچھو　　مرے دامن سے، اپنی آستیں سے

وفا اس سے جفا مجھ پر ستم یوں بھی ہے اور یوں بھی　　عدو پر میرے دلبر کا کرم، یوں بھی ہے اور یوں بھی
ستایا کچھ فلک نے ہے، ستم کچھ آپ کا بھی ہے　　مری آنکھوں میں اشک خوں، ہم یوں بھی ہے اور یوں بھی
رہیں یہ آنسو ئیں یا نکل جائیں برابر ہے　　مریضِ عشق سے پُوچھو، تو غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
ستم ہو یا کرم دونوں کو یکساں وہ سمجھتا ہے　　سرِ عاشق درِ جاناں پہ خم، یوں بھی ہے اور یوں بھی

(مسیح الملک شیدا)

پھر اُٹھوں گا ابر کے مانند لہراتا ہُوا　　گھومتا، گھِرتا، گرجتا، گُونجتا، گاتا ہوا
موت کے سائے میں رہ کر موت پر چھایا ہُوا　　دوڑتا، خم ٹھونکتا، چنگھاڑتا، بپھرا ہوا

آج ان ذرّوں کو بھی ناز اپنی تابانی پہ ہے　　تیرے در کا نقشِ سجدہ جن کی پیشانی پہ ہے

بیاض میں مجھے یہ دیکھ کر کچھ حیرت سی ہوئی کہ ذوقِ سخن کا انتخاب آپ نے باضابطہ

ردیف وار کیا ہے۔ اس انتخاب میں سے چند اشعار درج ذیل ہیں:

ذوق کے مرنے کی سن کر پہلے تو کچھ رُک گئے
پھر کہا تو یہ کہا منہ پھیر کر اچھّا ہوا

وہ صبح کو آئے تو کروں باتیں میں دوپہر
اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھّا

ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام
اور پھر کہوں گر آج سے کل جائے تو اچھّا

جب کل ہو تو پھر وہ ہی کہوں کل کی طرح سے
گر آج کا دن بھی یونہی ٹل جائے تو اچھّا

القصّہ نہیں چاہتا میں جائے یہاں سے
دل اُس کا یہیں گرچہ بہل جائے تو اچھّا

اے ذوق تکلّف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہے جو تکلّف نہیں کرتا

پروانہ بھی تھا گرمِ تپش پر کھُلا نہ راز
بُلبل کی تنگ حوصلگی تھی کہ غل ہوا

جو حسد کسی کو تجھ پر ہو تو ہے یہ تیری خوبی
کہ جو تو نہ خوب ہوتا، تو وہ کیوں حسود ہوتا

نہ ہُوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

بد خصلتوں کو کرتا ہے بالا نشیں فلک
اُونچی ہے آشیانۂ زاغ و زغن کی شاخ

واں سے یاں آئے تھے اے ذوق تو کیا لائے تھے
یاں سے تو جائیں گے ہم لاکھ تمنّا لے کر

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

نہیں خضاب سے مطلب ہمیں یہ موئے سفید　　سیاہ پوش ہوئے ماتم جوانی میں

آج اک پگڑی ہوئی تھی میکدے میں رہنِ مے　　ذوقؔ وہ تیری ہی دستارِ فضیلت ہو تو ہو

اے ذوقؔ کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا　　بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے　　مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

فارسی کلام کا انتخاب

بیاض میں فارسی شعراء کے سینکڑوں اشعار درج ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

بگیرم دامنِ آں سیّدِ لولاک در محشر — کہ محشر بر نتابد تابِ حسنِ بے حجابش را
قضا گیرد، قدر گیرد، ازل گیرد، ابد گیرد — رکابش را عنانش را عنانش را رکابش را
گرامی در قیامت آں نگاہِ مغفرت خواہد — کہ در آغوش گیرد جرمہائے بے حسابش را

گرامی مغفور و مرحوم

وداع و وصل جداگانہ لذّتے دارد — ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

(حافظ)

حطیم کعبہ شکست و اساسِ قبلہ بریخت — بتازہ طرح یکے قصرِ بے قصور نہیم
علو طاقِ حرم تا بچند مصلحت است — کہ داغِ عشق بہ پیشانیِ غرور نہیم

(فیضی)

فیضی گماں مبر کہ غمِ دل نگفتہ ماند — اسرارِ عشق آنچہ تواں گفت گفتہ ایم

ز عاشقانِ جہاں غیر ما نماند کسے — بیار بادہ کہ ما ہم غنیمتیم بسے

گر بہ تو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو برو — شرح دہم غمِ ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو
از پئے دیدنِ رخت ہم چو صبا فتادہ ام — خانہ بخانہ در بدر کوچہ بہ کوچہ کو بہ کو
مے رود از فراقِ تو خونِ دل از دو دیدہ ام — دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو

دردلِ خویش طاہرہ گشت و ندید جز ترا — صفحہ بہ صفحہ لا بہ لا ، پردہ بہ پردہ تو بہ تو

(قرۃ العین طاہرہ)

مے خندم و مے گریم چُوں گل بہ تہِ شبنم — مے سوزم و مے سازم چوں خوں بہ کباب اندر

سرمد غمِ عشق بوالہوس را نہ دھند — سوزِ دلِ پروانہ مگس را نہ دھند
عمرے باید کہ یار آید بہ کنار — ایں دولت سرمد ہمہ کس را نہ دھند

(سرمد)

زاہد بہ زنِ فاحشہ گفتا مستی — از خیر گسستی و بہ شر پیوستی ،
زن گُفت چناں کہ مے نمایم ہستم — تو نیز چناں کہ مے نمائی ہستی

(خیام)

مے خور کہ شیخ و حافظ و مُفتی و محتسب — چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

(حافظ)

انساں کشید بار امانت نگہ کنید — مارا بایں گیاہِ ضعیف ایں گماں نہ بود

شب ہائے وصل و گوشۂ چشم عنایتے — مائیم و زلف یار و مسلسل حکایتے
ہاں وارسی بہ نکتۂ مضمونِ باغِ خلد — خوانی اگر ز مصحف رخسار آیتے
عصیانِ ما و رحمتِ پروردگارِ ما — ایں را نہایتے است ، نہ آں را نہایتے
از چشمِ فتنہ مست کہ خونریز عالم است — مضمون دارو گیرِ قیامت روایتے
عقلِ بہانہ جو سپر انگند و رم گرفت — در عرصۂ کہ عشق علم کرد رایتے
تا چند امتحان تغافل ! تبسمے — دیرینہ بندہ ایست گرامی ، رعایتے

(گرامی)

ترا ناداں امیدِ غم گساری ہا ز افرنگ است　　دلِ شاہیں نہ سوزد بہر آں مرغے کہ در چنگ است

پشیماں شو اگر لعلے ز میراث پدر خواہی　　کجا عیش بروں آوردن لعلے کہ در سنگ است

دریں میخانہ ہر مینا ز بیم محتسب لرزد　　مگر یک شیشۂ عاشق کہ از وے لرزہ بر سنگ است

جان پدر تو سفرۂ بے ناں نہ دیدۂ　　جنگ عیال و گریۂ طفلاں ندیدۂ

نہ نشستۂ بگوشہ تو از بیم قرض خواہ　　ناگہ ز در در آمدہ مہماں ندیدۂ

جواب

بابا مگر تو کاکل پیچاں نہ دیدۂ　　چشم سیاہ و زلف پریشاں ندیدۂ

نہ نشستۂ بگوشہ تو در انتظار یار　　ناگہ ز در در آمدِ جاناں ندیدۂ

دیگر جواب

اے جانِ جاں تو گردشِ دوراں ندیدۂ　　آزار بند کاکل و مژگاں ندیدۂ

آگہ نۂ ز شیوۂ جور و جفائے یار　　چشم پُر آب و سینۂ بریاں ندیدۂ

جواب الجواب

واماندۂ بصحبتِ پیراں مرادِ دل　　عیش و نشاطِ محفل رنداں ندیدۂ

آگہ نۂ ز شیوۂ مردانِ راہِ عشق　　صبر و ثباتِ عاشقِ بے جاں ندیدۂ

نہال سرکش و گل بے وفا و لالہ دو رنگ　　دریں چمن بچہ امید آشیاں بندم

عُرفی

خاور چکد از شبنم بہ ایں تیرہ شبی　　کوثر چکد از لبم باایں تشنہ لبی

اے دوست ادب اکہ در حریم دل ماست　　شاہنشہِ انبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم عربی

(گرامی)

مرا اے مے فروش آں بیخودی نیست	مگر در بادہ آبے کردہ باشی

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند	چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند
مشکلے دارم ز دانشمندِ مجلس باز پرس	توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

ریا حلال شمارند و جامِ بادہ حرام	نہے طریقت و ملت، نہے شریعت و کیش

(حافظ شیرازی)

اے ترک غمزہ زن کہ مقابل نشستۂ	در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستۂ
آرام کردۂ بہ نہاں خانۂ دلم	خلقے دریں گماں کہ بہ محفل نشستۂ

(فیضی)

بملازمانِ سلطاں کہ رساند ایں دعا را	کہ بشکر پادشاہی ز نظر مراں گدا را
چہ قیامتست جاناں کہ بہ عاشقاں نمودی	رُخ ہمچو ماہ تاباں دلِ ہمچو سنگِ خارا
دلِ عالمے بسوزی چو عذار بر فروزی	تو ازیں چہ سود داری کہ نمی کنی مدارا
ہمہ شب دریں اُمیدم کہ نسیم صبحگاہی	بہ پیامِ آشنائے بنوازد آشنا را

(حافظ)

حکمِ عشق است کہ از اہلِ ریا بگریزیم	آنچہ بر شیخ حلال است، حرام است ایں جا

(گرامی)

کارِ من آخر شُد و آخر ز من کارے نہ شُد	مشتِ خاکِ من غبارِ کوچۂ یارے نہ شُد
سالہا خونِ جگر در نافِ آہو شُد گرہ	مُشک شُد، اما چہ شُد خالِ رخِ یارے نہ شُد

سالہا دل طلبِ جامِ جم از ما مے کرد	آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا مے کرد

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا / نوائے زندگانی نرم خیز است
بہ دریا غلط و باموجش درآویز / حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

(اقبال)

گفتم کہ نمی آئی، آرے و نعم گوئی / انکار درِ اقرارے، اقرار درِ انکارے
بس جرمِ گرامی نیست جز کاہلی و بیری / دیرینہ غلامے را مفروشش بہ بازارے

(گرامی)

شیخیم، مقدسیم، غازی مائیم / از راہ نشینانِ حجازی مائیم

(گرامی)

فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار / ساقی و مغنّی و شرابے و سرودے
زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند / حق را بسجودے و نبی را بہ درودے

تو بہ کارے کسے نمی آئی / بہ کنارے کسے نمی آئی
بہ چہ اُمید میتواں مُردن / بہ مزارِ کسے نمی آئی

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار / گُل چینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

ریگِ عراق منتظر، کشتِ حجاز تشنہ کام / خُونِ حسین بازدہ کوفہ و شامِ خویش را

(اقبال)

در مدرسہ کس را نہ رسد دعویٰ توحید / منزل گہِ مردانِ موحّد سرِ دار است

عشق رُسوائیست جامی یا بخوباں دل مدہ / یا بکلی یکطرف نہ نام و ننگِ خویش را

(جامی)

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بہ تو دادم — باید اوّل بہ تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

(سعدی)

حاجی بسوئے کعبہ رود از برائے حج — یارب بُود کہ کعبہ بیاید بسوئے ما

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را — چندیں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

اگر حقیقتِ اسلام در جہاں ایں است — ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

دردھا دادی و درمانی ہنوز — جاں زتن بردی و در جانی ہنوز

(خسرو)

اے تیرِ غمت را دلِ عشاق نشانہ — خلقے بتو مشغول و تو غائب زمیانہ
گہ معتکفِ مسجد و گہ ساکنِ دیرم — یعنی کہ ترا مے طلبم خانہ بخانہ

(ابوالفضل)

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیرِ سرو سمن درآ — تو زغنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درآ
پئے نافہائے رمیدہ بو، مپسند زحمتِ جستجو — بہ خیال حلقۂ زلفِ اُو، گرہے خورو بہ ختن درآ

(بیدل)

اے بلبل اگر نالی، من باتو ہم آوازم — تو عشق گلے داری، من عشق گل اندامے

(سعدی)

دِل بدست آور کہ حجِ اکبر است — از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
کعبہ بنگاہِ خلیل آذر است — دل گزرگاہِ جلیل اکبر است

میکشد شعله سرے از دلِ صد پارۂ ما | جوشِ آتش بود امروز بفوّارۂ ما

صد خار بہ دامنم در آویخت | از بہرِ گلے کہ چیدہ ام من

(تبسّم)

اے آبشار! نوحہ گر از بہرِ کیستی | چیں بر جبیں فگندہ، زاندوہِ کیستی
آیا چہ درد ہست کہ چوں من تمام شب | سر را بہ سنگ مے زدی و مے گریستی

(مخفی)

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد | گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تراست | من نہ دیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد

(اقبال)

گریزد از صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست | کسے کہ کشتہ نہ شُد از قبیلۂ ما نیست

(نظیری)

بہ ملکِ جم نہ دہم مصرعۂ نظیری را | "کسے کہ کُشتہ نہ شُد از قبیلۂ ما نیست"

(اقبال)

تا نشانہ صفت سر ننہی در تہِ آرہ | ہرگز بر سرِ زلفِ نگارے نہ رسی
تا مثلِ حنا سودہ نہ گردی تہِ سنگ | ہرگز بہ کفِ پائے نگارے نہ رسی

(مخفی)

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز | کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد
ایں مدعیاں از خبرش بے خبرانند | آں را کہ خبر شُد خبرش باز نیامد

(سعدی)

طاقِ ابروے تو شد قبلہ و من سر بسجود | چشم بد دُور کہ ہستم بہ نمازے عجبے

چہ نسبت است برندی صلاح و تقوی را — سماعِ وعظ کجا، نغمۂ رباب کجا
چو کحل بینشِ ما خاکِ آستانِ شماست — کجا رویم بفرما ازیں جناب کجا

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ ما را — بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را
بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنّت نخواہی یافت — کنارِ آبِ رکنا باد و گلگشتِ مصلّیٰ را
ز عشقِ ناتمامِ ما جمالِ یار مستغنی است — بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو — کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا را
بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی — جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خا را

دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیرِ ما — چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما
ما مریداں رو بسوئے کعبہ چوں آریم چوں — رو بسوئے خانۂ خمّار دارد پیرِ ما

حافظا مے خور و رندی کن و خوش باش ولے — دامِ تزویر مکن چوں دگراں قرآں را

صبا بلطف بگو آں غزالِ رعنا را — کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ ما را
غرورِ حسن اجازت مگر نداد اے گل — کہ پرسشے نکنی عندلیبِ شیدا را
بحسنِ خلق تواں کرد صیدِ اہلِ نظر — بہ بند و دام نگیرند مرغِ دانا را
چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی — بیاد آر حریفانِ بادہ پیما را
جز ایں قدر نتواں گفت در جمالِ تو عیب — کہ خالِ مہر و وفا نیست روئے زیبا را

محرمِ رازِ دلِ شیدائے خویش — کس نمی بینم ز خاص و عام را

خدا گواہ کہ گر جرمِ ما ہمیں عشق است　　گناہِ گبر د مسلماں بہ جرمِ ما بخشند

آں کس کہ ز غوغا نہ رہد دائے برد　　برخلقِ جہاں دل بدہد دائے برد
در دستِ فقیر نیست نقدے جز دنت　　آں نیز گر از دست دہد دائے برد

اند کے پیش تو گفتم غمِ دل ترسیدم　　کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

ہم کعبہ و ہم بت کدہ سنگِ رہِ ما بود　　رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم

تا کے ملامتِ مژۂ اشکبارِ من　　یک بار ہم نصیحتِ چشمِ سیاہِ خویش

در خرمنِ صد زاہد و عاقل زند آتش　　آں داغ کہ ما بر دلِ دیوانہ نہادیم

انتخاب کلام حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ

آسائشِ دو گیتی تفسیرِ ایں دو حرف است　　با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا
در کوئے نیک نامی مارا گزر ندادند　　گر تو نمے پسندی تغییر کن قضا را
آں تلخوش کہ صوفی ام الخبائثش خواند　　اشہی لنا و احلی من قبلۃ العذارا

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم　　اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدامِ ما
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

خفته بر سنجابِ شاهی نازنینے را چه غم　　گر ز خار و خاره سازد بستر و بالیں غریب،

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار　　فکرِ هر کس بقدرِ همتِ اوست
من و دل گر فنا شدیم چه باک　　غرض اندر میان سلامتِ اوست
گر من آلوده دامنم چه عجب　　همه عالم گواهِ عصمتِ اوست

هر چه هست از قامتِ ناساز بے اندامِ ماست　　ورنه تشریفِ تو بر بالائے کس کوتاه نیست
بندهٔ پیرِ خراباتم که لطفش دائمست　　ورنه لطفِ شیخ و زاهد گاه هست و گاه نیست

سحر کرشمهٔ وصلش بخواب میدیدم　　زہے مراتبِ خوابی که به ز بیداری ست
جمالِ شخص نه چشمست و زلف و عارض و خال　　هزار نکته دریں کار و بارِ دلداری ست

اگر چه عرض هنر پیش یار بے ادبی ست　　زباں خموش ولیکن دهاں پر از عربی ست
پری نهفته رخ و دیو در کرشمه و ناز　　بسوخت عقل ز حیرت که ایں چه بوالعجبی ست
ازیں چمن گلِ بیخار کس نچید آرے　　چراغِ مصطفوی با شرارِ بولهبی ست
حسن ز بصره، بلال از حبش، صهیب از روم　　ز خاکِ مکه ابو جهل ایں چه بوالعجبی ست
مباش در پئے آزار و هر چه خواهی کن　　که در شریعتِ ما غیر ازیں گناهے نیست

وقتِ عزیز رفت بیا تا قضا کنیم　　عمرے که بے حضورِ صراحی و جام رفت
زاهد غرور داشت سلامت نبرد راه　　رند از رهِ نیاز بدار السلام رفت

حافظ از بادِ خزاں در چمنِ دہر مرنج　　فکرِ معقول بفرما گُلِ بے خار کجاست

بس تجربہ کردیم دریں دیرِ مکافات　　با دُرد کشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

سرِّ خُدا کہ عارفِ سالک بکس نگفت　　در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید
یارب کجاست محرمِ رازے کہ یکزماں　　دل شرح آں دہد کہ چہ دید و چہا شنید
حافظ وظیفۂ تو دُعا گفتن ست و بس　　دربندِ آں مباش کہ نشنید یا شنید

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود　　سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

قند آمیختہ با گل نہ علاجِ دلِ ماست　　بوسۂ چند بیامیز بدشنامے چند

دلا بسوز کہ سوزِ تو کارہا بکند　　دُعائے نیم شبی دفعِ صد بلا بکند

صد ملکِ دل بہ نیم نظر میتواں خرید　　خوباں دریں معاملہ تقصیر می کنند
قومے بجدّ و جہد گرفتند وصلِ دوست　　قومے دگر حوالہ بہ تقدیر می کنند
می خور کہ شیخ و حافظ و مفتی و محتسب　　چوں نیک بنگری ہمہ تزویر می کنند

شکر ایزد کہ میانِ من و او صلح فتاد　　حوریاں رقص کناں ساغرِ شکرانہ زدند

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند　　واندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند

بے خود از شعشعۂ پرتوِ ذاتم کردند — بادہ از جامِ تجلی بصفاتم دادند
چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے — آں شب قدر کہ ایں تازہ براتم دادند
چوں من از عشق رخش بے خود و حیراں گشتم — خبر از واقعۂ لات و مناتم دادند
من اگر کام روا گشتم و خوش دل چہ عجب — مستحق بودم و ایں ہا بزکاتم دادند
کیمیائیست عجب بندگیٔ پیرِ مغاں — خاک او گشتم و چندیں درجاتم دادند
ایں ہمہ قند و شکر کز سخنم می ریزد — اجر صبریست کزاں شاخ نباتم دادند

دیریست کہ دلدار پیامے نفرستاد — ننوشت کلامی و سلامی نفرستاد

دی پیرِ مے فروش کہ ذکرش بخیر باد — گفتا شراب نوش و غمِ دل ببر زیاد
حافظ گرت ز پندِ حکیماں ملالت است — کوتہ کنیم قصہ و عمرت دراز باد

دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید — یا جاں رسد بجاناں یا جاں زتن برآید
ہر دم چو بے وفایاں نتواں گرفت یاری — مائیم و آستانش تا جاں زتن برآید

نگارِ من کہ بمکتب نرفت و خط ننوشت — بغمزہ مسئلہ آموزِ صد مدرس شد

من ار چہ عاشقم و رند و مست و نامہ سیاہ — ہزار شکر کہ یارانِ شہر بے گنہند
مبیں حقیر گدایانِ عشق را کایں قوم — شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم — پس ازاں کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی آمد

کشتۂ کہ عشق دارد نگذاردت بدیں ساں　　به جنازه گر نه آئی به مزار خواهی آمد
همه آهوانِ صحرا سرِ خود نهاده بر کف　　به اُمیدِ آں که روزے به شکار خواهی آمد

صبا به تهنیتِ پیرِ مے فروش آمد　　که موسمِ طرب و عیش و ناز و نوش آمد
هوا مسیح نفس گشت و باده نافه کشا　　درخت سبز شد و مُرغ در خروش آمد
تنورِ لاله چناں بر فروخت بادِ بهار　　که غنچه غرقِ عرق گشت و گل بجوش آمد

غلامِ نرگسِ مستِ تو تاجدارانند　　خرابِ بادۂ لعلِ تو هوشیارانند
ترا صبا و مرا آبِ دیده شُد غمّاز　　وگرنه عاشق و معشوق رازدارانند
گذار کن چو صبا بر بنفشه زار و ببیں　　که از تطاولِ زلفت چه سوگوارانند
نه من براں گلِ عارض غزل سرایم و بس　　که عندلیبِ تو از هر طرف هزارانند
بیا به میکده و چهره ارغوانی کن　　مرو بصومعه کانجا سیاه کارانند
خلاصِ حافظ ازاں زلفِ تابدار مباد　　که بستگانِ کمندِ تو رستگارانند

حافظ صبور باش که در راهِ عاشقی　　هر کس که جاں نداد بجاناں نمی رسد

خبرِ بلبلِ ایں باغ مپرسید که من　　نالۂ می شنوم کز قفسے می آید

نه هر که چهره برافروخت دلبری داند　　نه هر که آئینه دارد سکندری داند
نه هر که طرفِ کله کج نهاد و تند نشست　　کلاه داری و آئینِ سروری داند
هزار نکتۂ باریک تر ز مو ایں جا است　　نه هر که سر بتراشد قلندری داند

تو بندگی چو گدایاں بشرطِ مزد مکن | کہ دوست خود روشِ بندہ پروری داند

ناز پروردِ تنعم نبرد راہ بدوست | عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد

ازیں افیوں کہ ساقی درمے افگند | حریفاں را نہ سرماند نہ دستار

بیا تا گل برافشانیم و می در ساغر اندازیم | فلک را سقف بشگافیم و طرح نو دراندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد | من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم
چو در دستست رودے خوش بزن مطرب سرودے خوش | کہ دست افشاں غزل خوانیم و پاکوباں سر اندازیم
بیا جاناں منور کن زرو بیت مجلسِ مارا | کہ در پیشت غزل خوانیم و در پایت سر اندازیم

در خراباتِ مغاں نورِ خدا مے بینم |ویں عجب بیں کہ چہ نورے ز کجا مے بینم
سوزِ دل اشکِ رواں آہِ سحر نالۂ شب | ایں ہمہ از اثرِ لطف شما مے بینم
دوستاں عیبِ نظر بازی حافظ مکنید | کہ من اورا ز محبانِ خدا مے بینم

رند بگزنم و با شاھد دمے ھم صحبت | نتوانم کہ دگر حیلہ و تزویر کنم

ناموسِ چند سالۂ اجدادِ نیک نام | در راہِ جام و ساقیٔ مہ رو نہادہ ایم

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و برما نامِ فسق | داوری خواہم ولے یارب کرا داور کنم

ابلہاں را ہمہ شربت ز گلاب و قند ست　　قوتِ دانا ہمہ از خونِ جگر مے بینم

من از چشمِ خوشِ ساقی خراب افتادہ ام لیکن　　بلائے کز حبیب آمد ہزارش مرحبا گفتم

شمع و گل و پروانہ و بلبل ہمہ جمعند　　اے دوست بیا رحم بہ تنہائیِ ما کن

چوں عمر تبہ کردم چندانکہ نگہ کردم　　در کنجِ خراباتی افتادہ خراب اولیٰ

حافظا عادتِ خوباں ہمہ جور ست و جفا　　تو کہ زیں طائفہ امیدِ وفا می داری

بیا حافظ بہ پندِ تلخ کن گوش　　چرا عمرے بغفلت مے گزاری

بفراغِ دل زمانے نظرے بماہ روئے　　بہ ازانکہ چترِ شاہی ہمہ روز ہاو ہوئے

دمے بہ کلبۂ احزان عاشقاں آئی　　شبے انیسِ دلِ سوگوارِ من باشی

اس بیاض کے علاوہ حضرت والد علیہ الرحمہ کے کُتب خانے سے ایک نوٹ بک ملی ہے جس میں نظیریؔ نیشاپوری کی غزلیات کا انتخاب ہے۔ بیاض میں بھی اور اس نوٹ بک میں بھی تمام اشعار حضرت نے اپنے قلم سے لکھے ہیں۔ چند ٹیپ کے شعر نقل کیے جاتے ہیں۔

گوئی بغیرِ واسطہ در گوشش خاکیے　　رازے کزاں خبر بنود جبرئیل را
درویش و بادشہ بوجودِ تو قائم آند　　خورسند کردۂ تو عزیز و ذلیل را

ساقی بشو دو رنگیٔ امید و بیم را
بنما با حقیقتِ رنگِ قدیم را

مطرب بیک دو نغمه غنی کن دلِ فقیر
ساقی بیک دو جرعه سخی کن لئیم را

جنسے که در خزینهٔ لطفِ تو نیست نیست
جز احتیاجِ تحفه ندیدم کریم را

روزیکه جرمنامه نظیری بر آورد
از آبِ عفو شوئی کتابِ سقیم را

طاعتِ ما نیست غیر از ورزشِ پندارِ ما
هست استغفارِ ما محتاجِ استغفارِ ما

از شمیمِ گل دماغِ ما پریشاں مے شود
بر نمے تابد دمِ عیسےٰ دلِ بیمارِ ما

خانهٔ ما خاکساراں بر سرِ راهِ صباست
شب نمے سوزد چراغ از پستیٔ دیوارِ ما

خورشیدِ عمر بر سرِ دیوار و خفته ایم
فریاد از درازیٔ خوابِ گرانِ ما

در پیری از هزار جواں زنده دل تریم
صد نوبهار رشک برد بر خزانِ ما

در حیرتم که غنچه به بلبل چگونه گفت
رازے که باد هم نشنید از زبانِ ما

بنیادِ ما خرابیٔ ما استوار کرد
گوئی که سودِ ماست نظیری زیانِ ما

خود را برهنه بر صفِ شمشیر مے زنیم
کاندر فنائے ماست بقاء و دوامِ ما

گر رود عشق از مزاجِ پیر لذّت کے رود
بوئے مے باقی بود گر بشکنی پیمانه را

سرگذشتِ عهدِ گل را از نظیری بشنوید
عندلیب آشفته تر می گوید ایں افسانه را

کجا بودی که امشب سوختی آزرده جانے را
بقدرِ روزِ محشر طول دادی هر زمانے را

جراحتم همه راحت شد از سعادتِ عشق
گلے که در رهِ من بشکند ز خارِ من ست

فرض و سنت بتماشائے تو از یادم رفت　　پردہ بر روئے فگن یا ز من ایماں مطلب

شورِ چمن ز نغمۂ آزادیِ من ست　　روئے شگفتہ سحر از شادیِ من ست

جز محبّت ہر چہ بردم سود در محشر نداشت　　دین و دانش عرض کردم کس بچیزے برنداشت

شبِ سیاہ صباحِ سفید مے آرد　　چراغِ مطلب از دودمانِ بولہبی است

یکے بگو بہ عزیزانِ شہر سیرے کن　　ببیں کہ نقشِ املہا چہ باطل افتادہ است

نالۂ ما نغمۂ اہلِ نوا را گرم ساخت　　شوقِ ما ہنگامۂ ایں ماجرا را گرم ساخت

گردِ سرِ تو گشتن و مُردن گناہِ مَن　　دیدن ہلاک و رحم نکردن گناہِ کیست
چوں بگذرد نظیریؔ خونیں کفن بحشر　　خلقے فغاں کنند کہ ایں دادخواہِ کیست

از حجاب امشب نظیریؔ بادہ بر سجّادہ ریخت　　پارسا آدابِ مے خوردن نمیداند کہ چیست

بہ طرازندگیِ قامتِ موزوں نازم　　یک قبا نیست کہ شائستۂ اندامِ تو نیست

چشم بر فیضِ نظیری ہمہ خوباں دارند　　کاسہ در پیشِ گدا داشتہ سلطانے چند

تو نخلِ خوش ثمرِ کیستی کہ باغ و چمن　　ہمہ ز خویش بریدند و در تو پیوستند

ز شرحِ قصۂ ما رفتہ خواب از چشمِ خاصانرا　　شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد

در اشتیاقِ تو چنداں صنم صنم گفتم　　کہ شرمسار ز خود زاہد و برہمن شد

عبادتِ سحری را مکن نظیری کم　　کہ ہر چہ کرد دُعاہائے صبحگاہی کرد

باعثِ راندنم از بزم بجز عار نبود　　ورنہ کس را من و بودنِ من کار نبود
نالہ از بہرِ رہائی نکند مُرغِ اسیر　　خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود

مریضانِ دیارِ عشق خوش بیمارئے دارند　　کسے دارو نمے خواہد، کسے مرہم نمے گیرد

سحر بیتے مغنّی میسرود از تو بیاد آمد　　چناں شورے برآوردم کہ دفترِ دوستاں گم شد
اگر پُرسد کسے حالِ نظیری را بگوئیدش　　کہ در دام است آں مُرغے کہ شب از آشیاں گم شد

در جوانی معتکف گشتم بہ پیری کوچہ گرد　　آنچہ در خلوت ندیدم در گذر مے یابمش

کُفر و ایماں از برونِ پردہ اند　　تو درونِ پردہ با خاصاں برقص
راہ زیں شورش بمقصد میرسد　　ہمچو کشتی بر سرِ طوفاں برقص
دوش در یک بزم با او تا سحر مے خوردہ ایم　　نرگسِ مخمورِ او بین و خمارِ ما مپرس

دار العلوم تقویتہ الاسلام

دینی درسگاہوں کا قیام اور علمائے حق کی مساعی
عربی دینی مدارس کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش
آج دینی درسگاہوں کی اشد ضرورت ہے
مدرسۂ غزنویہ کی تاریخی حیثیت
حضرت والد علیہ الرحمہ کا دور
دارالعلوم اور ۱۹۴۷ء کا خونین انقلاب
لاہور میں دارالعلوم کا دوبارہ اجراء
حضرت والد علیہ الرحمۃ کے بعد
مکتبہ غزنویہ
شام کی کلاسیں
اساتذۂ کرام
مشہور تلامذہ

تقسیم ملک کے بعد دار العلوم تقویۃ الاسلام کی دو سالہ رپورٹ اور گوشوارہ بابت ۴۸-۱۹۴۷ء

و ۴۹-۱۹۴۸ء چھپا۔ اس کے شروع میں حضرت والد علیہ الرحمہ نے ایک مفصّل مضمون لکھا جس میں دینی درسگاہوں کی ضرورت اور اہمیت کو اُجاگر کیا اور مدرسہ غزنویہ کی تاریخی حیثیت پر روشنی ڈالی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دار العلوم کا تعارف کرانے کے لیے حضرت والد علیہ الرحمہ ہی کے اس مضمون سے اقتباسات نقل کیے جائیں۔

"آج پاکستان اور ہندوستان میں اسلامی تہذیب کے کچھ باقیات صالحات اگر موجود ہیں تو یقیناً وہ صرف علماء کرام اور عربی درسگاہوں کی بدولت موجود ہیں، اگر ۱۸۵۷ء کے انقلابی دَور کے بعد چھوٹے بڑے عربی مدارس قائم نہ ہو گئے ہوتے اور اللہ تعالےٰ کا بے پایاں فضل و کرم اور اس کی تائید و نصرت ان عُلماء ربانیین کے شامل حال نہ ہوتی جنہوں نے زمانہ کے ہر طرح کے نامساعد حالات کے باوجود، مسجدوں کی چار دیواریوں اور گھاس پھوس کے جھونپڑوں میں بیٹھ کر کتاب و حکمت، قرآن و حدیث کے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا تو آپ دیکھتے کہ ہماری اسلامی تہذیب کب کی انگریزی یونیورسٹیوں کے ذبح خانوں (کالجوں) میں ذبح ہو چکی ہوتی۔ اور ڈھونڈنے سے بھی کہیں اس کا سُراغ نہ ملتا۔ یہ عربی مدارس اور اُن کے فیض یافتہ طلباء اور عُلماء کا ہی فیضان ہے کہ اسلامی تہذیب و تمدّن کے لیے محبوبیت اور شعائر اسلامی کے لیے جذباتِ احترام

کم از کم عوام میں باقی رہ گئے۔

۱۸۵۷ء کے بعد کا دَور مُسلمانوں کے لیے بڑا صبر آزما تھا۔ انگریز کو معلوم ہو گیا تھا کہ ہندوستان کا مُسلمان انگریز سے سخت نفرت کرتا ہے، اس لیے اُس نے مُسلمانوں کو کچلنے کی پالیسی اختیار کی جس کی تفصیل بڑی دردناک ہے مگر یہ پالیسی کامیاب نہ ہُوئی۔ جس قدر ظلم کے پہاڑ مسلمانوں پر توڑے گئے، اسی قدر ان کی نفرت بڑھتی گئی۔ اس صُورتِ حال نے انگریز کو پریشان کر دیا۔

ہندوستان میں ایک پائیدار حکُومت کے قیام کے لیے اب انگریز کو ضرورت محسوس ہُوئی کہ مُسلمانوں کے قلعۂ دل کو مسخّر کیا جائے، چنانچہ مُسلمانوں کو انگریزی پڑھنے کی ترغیب دی گئی۔ مُلازمتوں کا لالچ، عہدوں کی تحریص، خطابات کا شوق، خوشحالی کی طمع، حکُومت کے الطاف و عنایات سے بہرہ اندوز ہو کر آرام کی زندگی بسر کرنے کی ترغیب، غرض یہ اور اسی قسم کے کئی ایک حربے مُسلمانوں کے دل کو غلام بنانے کے لیے اختیار کیے گئے۔ دُوسری طرف اسلام سے بدظن کرنے کے لیے عیسائی مشنریوں کی خدمات حاصل کی گئیں اور مسلمانوں میں حکومت کی درپردہ امداد کے ذریعے عیسائیت کی تبلیغ کا کام شروع کر دیا گیا۔

دینی درسگاہوں کا قیام اور عُلمائے حق کی مساعی

ہندوستان میں اسلام کے حفظ و بقا کے لیے یہ نہایت نازک وقت تھا۔ یہ علمائے حق کا ہی مقدّس گروہ تھا جس نے اس نازک ترین دَور میں حالات کی یکسر نامساعدت کے باوجود، ایک طرف اُنھوں نے اپنے علم و عمل اور زبان و قلم سے عیسائی مشنریوں کے فتنہ کا مقابلہ کیا اور دُوسری طرف علومِ کتاب و سُنّت کے لیے ایسی درسگاہیں قائم کیں جن میں تمام ہندوستان کے اطراف و اکناف سے تشنگانِ علم کشاں کشاں آنے لگے اور ان دینی مدارس کے چشمہ ہائے ہدایت و بصیرت سے سیراب ہو کر ابرِ رحمت بن کر گھروں کو اس طرح لوٹے کہ ہزارہا قلوب و ارواح کے مُردہ کھیتوں کو سرسبز و شاداب کر دیا۔ علماء نے اپنی ایمانی فراست

سے یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر خطرہ کا انسداد نہ کیا گیا اور اس فتنہ کے مقابلے کے لیے اسلامی علوم وفنون کے قلعے نہ بنا لیے گئے تو حملہ آور غنیم ہمارے تاج و تخت کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے علوم وفنون ہماری تہذیب و تمدن، ہمارے مذہب غرض ہر وہ چیز جس سے ہماری قومیت اور مذہبی روایات زندہ رہ سکتی ہیں، سب کو غارت کر دے گا۔ اس خیال کے آتے ہی ان علمائے حق نے جن کو حق جل مجدہٗ نے اس خدمت کے لیے منتخب فرمایا تھا، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسا کرتے ہوئے عربی مدارس کی بنیاد ڈالی۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی کی درسگاہ جسے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے جاری رکھا اور ان کے بعد حضرت شاہ اسحٰق صاحبؒ نے آباد کیا، دہلی کے ۱۸۵۷ء کے حادثہ کی نذر ہو گئی، لیکن حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی میں اس درسگاہ کو جاری کیا۔

امرتسر کی مشہور درسگاہ مدرسۂ غزنویہ اسی شجرِ طیبہ کی شاخِ ثمر دار ہے۔ اسی زمانہ میں ملک کے دوسرے اہم حصوں میں دینی علوم کے لیے حضراتِ اہلِ علم نے درسگاہیں قائم کیں۔

عربی دینی مدارس کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش

قرآن و حدیث کے درس و تدریس کے یہ سلسلے، قال اللہ قال الرسول کے یہ غلغلے علمائے حق کے مواعظِ حسنہ کی مجلسیں، تبلیغِ اسلام کی یہ سرگرمیاں، انگریزی حکومت کے لیے کیونکر قابلِ برداشت ہو سکتی تھیں۔ انگریزی حکومت کو یقین تھا کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف جو عظیم الشان طاقت اُٹھ کھڑی ہوئی تھی، وہ دراصل علماء کی مذہبی تحریک کا نتیجہ تھی، اس لیے اُس نے عربی دینی مدارس کے اثر کو زائل کرنے اور اس کے حلقۂ اقتدار کو ختم کرنے کے لیے یہ چال چلی کہ عربی تعلیم کے ایسے کالج اور مدرسے بنائے جائیں جن میں عربی زبان اور عربی ادب کی تعلیم دی جائے، مگر اس میں اسلامی رُوح نہ ہو تاکہ اس رُوح سے خالی ہو کر عربی تعلیم کی ایسی لاشیں تیار ہوں جن میں ظاہری حسن و جمال

تو ہو مگر زندگی کی طاقت نہ ہو۔ یہ کلکتہ، الٰہ آباد، دہلی اور لاہور کے مشرقی زبانوں کے کالج اسی خیال کے مظہر ہیں حالانکہ دین کے بغیر عربی تعلیم کا درجہ اس عربیتِ جاہلیت سے کم نہیں جس کے مٹانے کے لیے اسلام آیا۔

اے کاش! مسلمان یہ سمجھ سکتے کہ عربی تعلیم صرف عربی تعلیم کے لیے نہ ہماری قومی زندگی کا مقصد ہو سکتا ہے، نہ ہماری مذہبی زندگی کا تقاضا ہے، نہ اس کے لیے ہماری محنت اور دولت کچھ نفع بخش ہے۔ بلکہ جو حقیقت نفس الامری ہے، وہ یہ ہے کہ ہماری زندگی کا مدار جس صحیفۂ الٰہی پر ہے اور ہمارے رسولِ اکرمؐ کی تعلیم و سیرت اور آپ کے اور آپ کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ارشاداتِ گرامی جس زبان کے خزانہ میں محفوظ ہیں، وہ یہی مقدس زبان ہے، اس لیے اس زبان کے جاننے اور اس میں مہارت پیدا کیے بغیر خدا اور اس کے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحیح منشا سے واقف نہیں ہو سکتے اور نہ اس فیض سے فیضیاب ہو سکتے ہیں جو اس زبان کے سرچشمہ سے بہہ رہا ہے، اس لیے اس زبان کو جاننا، اس میں مہارت پیدا کرنا اور اس کے الفاظ کی تحقیق، محاوروں کی تفتیش اور طرز و اسلوبِ کلام کی واقفیت فرض کفایہ کی حیثیت سے مسلمانوں پر واجب ہے اور اسی مقصد کے لیے ملک کے مختلف گوشوں میں عربی دینی مدارس کا قیام ضروری ہے۔ اگر آپ غور سے ان تحریکوں کا مطالعہ کریں گے جن سے اس ملک میں الحاد کو تقویت حاصل ہوئی اور افرنجی مقاصد کو فروغ ہوا، تو آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ انکارِ حدیث اور تفسیر بالرائے کا فتنہ، الحاد کے سارے فتنے، ان سب کا سرچشمہ صرف عربی تعلیم یا عربی زبان کی وہ واقفیت ہے جس میں علوم کتاب و سنّت اور مذہبی تعلیم و تربیت کا عنصر شامل نہیں ہے۔

آج دینی درسگاہوں کی اشد ضرورت ہے

اس لیے صاف طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اسلامی تہذیب صحیح معنوں

میں زندہ رہے، شعائرِ اسلامی کا احترام اور مذہب کا اقتدار مسلمانوں کے دلوں پر قائم رہے، تو مسلمانوں کو ان مذہبی مدارس کے قیام و بقا اور تحفظ کے لیے پہلے سے زیادہ توجہ منعطف کرنی چاہیے۔

میرے نزدیک ان عربی دینی مدارس کی جس قدر ضرورت کل تھی، آج اُس سے بھی زیادہ ہے۔ کل کی طرح لوگ آج بھی عہدوں اور ملازمتوں کے پھیر اور اربابِ اقتدار کی چاپلوسی میں لگے ہُوئے ہیں۔ انگریزی تعلیم گاہوں اور تربیت گاہوں سے نکلے ہُوئے لوگ مذہب کی پابندیوں کے قبول کرنے سے آج بھی اسی طرح گھبراتے ہیں جس طرح کل گھبراتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ، اس لیے ان عربی دینی مدارس کو سنبھالنا اور عمدگی سے چلانا وقت کا اہم ترین فریضہ ہے۔ اگر یہ دینی مراکز اور علوم دینیہ کے سرچشمے خشک ہو گئے تو ہماری اسمبلیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلیٹوں سے کوئی توقع نہیں رکھ سکتا کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن کی حفاظت کریں گی اور نہ ہمارے لیڈروں سے جو خود انگریزی تہذیب و تمدن کے پروردہ اور مذہب سے ناآشنا اور دینی زندگی سے محروم ہیں، توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن کی حفاظت کر سکیں گے یا قرآن و حدیث، فقہ اسلامی اور دیگر علومِ اسلامیہ کے درس و تدریس اور اشاعت کے لیے وہ توجہ منعطف کر سکیں گے مسلمانوں کا طبقہ جو چاہتا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی پر مذہب حاوی ہو، مذہب کا اقتدار ہو اور مسلمان مذہب کے رنگ میں رنگے ہُوئے ہوں، جو چاہتا ہے کہ قراردادِ مقاصد کے مطابق مسلمانوں کی زندگی کتاب اللہ اور سُنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے سانچے میں ڈھلی ہُوئی ہو، جو چاہتا ہے کہ اس ملک میں خُدا کی حاکمیت کے اقرار کے ساتھ خدا کا قانون اس ملک میں نافذ ہو، اُسے کتاب اللہ اور سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم اور درس و تدریس کے لیے ایسے مدارس قائم کرنے چاہئیں، یا جو موجود ہیں، اُن کے بقاء و استحکام کے لیے اپنی بہترین توجہات منعطف کرنی چاہئیں تاکہ جیّد علماءِ دین تیّار ہوں اور وہ مذہبی انقلاب پیدا کیا جاسکے جس کی ضرورت باوجود سیاسی انقلاب کے ظہور پذیر ہو جانے کے، ابھی تک باقی ہے۔

مدرسۂ غزنویہ کی تاریخی حیثیت

اب مدرسۂ غزنویہ کے متعلق کچھ مختصر سی معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ اندازہ کرسکیں کہ اس درسگاہ نے کیا کیا دینی خدمات سرانجام دیں اور اس کے فیض کا سلسلہ کہاں تک پھیلا اور آج اس کی کیا ضرورت ہے اور اس سے کیا توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

ہمارے جدِ امجد امام اہل التوحید، متبع آثار السلف الصالحین عارف باللہ حضرت مولانا عبداللہ غزنوی قدس سرہ حبیب غزنی سے پنجاب تشریف لائے اور امرت سر میں سکونت پذیر ہوئے، توحید و سُنت کی اشاعت اور بدعات اور مُشرکانہ رسوم سے پاک اسلام کی تبلیغ کا بے پناہ جذبہ جو آپ کے دل میں موجزن تھا، اس نے چند دنوں میں ایسی صُورتِ حال پیدا کردی کہ امرت سر مرجعِ عوام و خواص بن گیا۔ آپ کے حلقۂ پند و نصائح میں شریک ہونے، آپ کی اقتداء میں نماز پڑھنے اور کیفیتِ خشوع و خضوع حاصل کرنے اور آپ کے فیضانِ صحبت سے مستفیض ہونے کے لیے صلحاء و علماء، دُور دُور سے حاضر ہوکر اس چشمہ ہدایت و معرفت سے اپنی رُوح کی تسکین اور قلب کی تطہیر حاصل کرتے۔ آپ کے صاحبزادگان میں سے مولانا عبدُاللہؒ، مولانا محمدؒ اور والد بزرگوار حضرت مولانا عبدالجبار صاحب غزنویؒ قرآن و حدیث کا درس دیتے۔ اس طرح مسجد غزنویہ ایسی تربیت گاہ بن گئی تھی جہاں علم کے ساتھ عمل، قال کے ساتھ حال کی کیفیت اور علم و بصیرت کے ساتھ معرفت کا نور حاصل ہوتا تھا۔ عارف باللہ حضرت مولانا عبداللہ غزنویؒ قدس سرہ کے واصل بحق ہونے کے بعد ان کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا عبدُاللہ بن عبدُاللہؒ اُن کے خلیفہ مقرر ہوئے۔

آپ تھوڑا عرصہ زندہ رہے۔ ان کی وفات کے بعد والد بزرگوار حضرت مولانا عبدالجبار غزنوی نور اللہ مرقدہٗ منصبِ خلافت و امامت پر فائز ہوئے۔ آپ کے عہدِ مبارک میں رُوحانی فیوض و برکات حاصل کرنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہوگیا اور آپ کے علم و فضل کے چرچے پنجاب

سے گزر کر پورے ہندوستان بلکہ بلادِ عرب تک جا پہنچے اور اس طرح آپ کے شاگرد تمام ملک بلکہ بیرونی ممالک میں بھی پھیل گئے۔ آپ نے اپنے عہدِ مبارک میں مسجدِ غزنویہ کی درسگاہ کو باقاعدہ دارالعلوم کی شکل میں تبدیل کر دیا اور اس کے لیے ایک نظام قائم کر دیا۔ حضرت امام صاحب علیہ الرحمہ نے اپنی فراستِ ایمانی اور بصیرتِ قلبی کی برکت سے وقت کی اہم ترین ضرورت کو محسوس کیا۔ علومِ کتاب وسنّت اور دیگر علومِ دینیہ کی تعلیم کے لیے "دارالعلوم تقویۃ الاسلام" کے نام سے ایک ایسی درس گاہ قائم کی جو پنجاب میں علمی اور رُوحانی فیوض کے لحاظ سے عدیم النظیر اور بے مثال تھی۔ دارالعلوم کی بُنیاد کچھ ایسے مُبارک وقت اور ایسے اخلاص اور حُسنِ نیّت کے ساتھ رکھّی گئی کہ بہت جلد اس کو فتقبّلها ربّها بقبولٍ حسنٍ وانبتها نباتاً حسناً کا درجہ حاصل ہو گیا۔ بہت کم عرصہ میں حضرت امام صاحب علیہ الرحمہ کے شاگرد دارالعلوم کے فارغ التحصیل طلباء ملک کی مساجد میں دعوت و ارشاد کا فرض بجالاتے ہوئے محراب و منبر کی زینت کا باعث ہوئے اور پنجاب کے اکثر دینی مدارس میں مدّرسی کے فرائض بجالانے لگے۔ ان کی برکت سے شہروں سے گزر کر دور دراز قصبات و دیہات میں قال اللہ وقال الرّسول کے غلغلے بلند ہُوئے۔ جہل کی تاریکیوں کی جگہ علم وبصیرت کے چراغ روشن ہو گئے۔ غرض علم و معرفت کا یہ شجرِ طیّبہ "دارالعلوم تقویۃ الاسلام" جس کی تخم ریزی ۱۹۰۲ء میں حضرت الامام علیہ الرحمۃ کے دستِ مبارک سے ہوئی ایسا سرسبز اور بار آور ہُوا کہ اصلها ثابت وفرعها فی السماء تؤتی اکلها کلّ حین باذن ربّها کے مطابق اس کے گُل و اثمار ہزاروں لاکھوں مومنین کے قلوب وارواح کے لیے حیات بخش ثابت ہُوئے۔

والدِ بزرگوار حضرت امام صاحب علیہ الرحمۃ کے دورِ یمن و برکت کے بعد ان کے بھائی حضرت مولانا عبدالواحد صاحب غزنوی نوراللہ مرقدہٗ جنہیں اللہ تعالیٰ نے فصلِ خطاب و حسنِ بیان اور فہمِ قرآن میں حظِ وافر عطا کیا تھا، مسندِ خلافت پر متمکن ہُوئے اور زمامِ اہتمام

مدرسہ ان کے دستِ مبارک میں آئی ۔ اُنہوں نے اسی طرح علوم نبویہ کی خدمت اور توحید و سُنّت کی اشاعت کی جس طرح ان کے اسلاف کرتے آئے ۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔[1]

حضرت والد علیہ الرحمہ کا دَور

حضرت مولانا عبد الواحد غزنوی علیہ الرحمۃ کے انتقال کے بعد حضرت والد علیہ الرحمۃ سے دار العلوم کا کام سنبھالنے کی درخواست کی گئی جس تواضع اور انکسار کے ساتھ والد علیہ الرحمۃ نے اس ذمّہ داری کو قبول کیا۔ اس کی حکایت خود اُن کی زبانی سُنیے :

" حضرت مولانا عبد الواحد صاحب غزنویؒ کے انتقال کے بعد جماعت کے مخلصین اور تمام خاندان نے اس عاجز کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ حضرت مولانا مرحوم کی جگہ میں کام کروں ۔ مَیں نے اپنی بے بضاعتی اور نا اہلیّت کے عذرات پیش کیے لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی ۔ مَیں کسی لحاظ سے بھی بزرگوں کی مَسند پر متمکن ہونے کا اپنے کو اہل نہ سمجھتا تھا ۔ میرے پاس اپنی کوتاہیوں کے اعتراف ، اپنے ذنوب وخطایا کی ندامت و انفعال کے سوا کچھ نہ تھا ، لیکن جماعت کے فیصلے کے سامنے مجھے سرِ تسلیم خم کر دینا پڑا ۔

مَیں نے اس ذمّہ داری کو قبول کر لیا کہ شاید یہی خدمت میرے لیے کفّارۂ ذنوب کا سبب اور الحقنا بھم ذریتھم وما التنٰھم من عملھم من شئ کا ذریعہ بن جائے ۔

یا اللہ تو علیم و خبیر ہے ۔ تو بہتر جانتا ہے کہ اس وقت سے آج تک میں کس قدر عاجزی اور زاری کے ساتھ تجھ سے دُعا مانگتا ہوں " اللّٰھمّ اِنّی ضَعِیفٌ فَقَوِّنِی فِی رِضَاکَ ضُعفِی وخُذ اِلَی الخَیرِ بِنَاصِیَتِی واجعَلِ الاِسلَامَ مُنتَھیٰ رِضَائِی ، اللّٰھُمَّ اِنِّی ضَعِیفٌ فَقَوِّنِی واِنّی ذَلِیلٌ فَاَعِزَّنِی واِنّی فَقِیرٌ فَارزُقنِی "

---

[1] دیکھیے صفحہ ۳ تا ۱۰

بس تو ہی میری عاجزانہ التجاؤں کا سُننے والا اور انہیں شرف قبولیت بخشنے والا اور مجھے توفیق بخشنے والا ہے کہ تیری توفیق کے بغیر میرے لیے ناممکن ہے کہ میں اپنے فرائض سے عہدہ برا ہو سکوں[1]۔"

حضرت والد علیہ الرحمہ اعلائے کلمۃ الحق کی پاداش میں کئی بار نظر بند ہوئے مگر اُن کے عزم اور ہمت کا عالم یہ تھا کہ وہ قید و بند کی سختیاں بھی جھیلتے رہے اور دار العلوم بھی چلاتے رہے۔ خود رقم طراز ہیں:

"اس دور میں دار العلوم کے لیے وقت بڑا نازک تھا جب کہ انگریزی حکومت نے مجھے گزشتہ عالمگیر جنگ کے زمانہ میں نظر بند کر دیا اور تین سال کی نظر بندی کے عرصہ میں مجھے دار العلوم کی نگرانی سے مجبوراً محروم ہونا پڑا[2]۔"

قید سے رہا ہوتے ہی ایک نئے ولولے کے ساتھ دین کے کاموں میں منہمک ہو جاتے۔ خود فرماتے ہیں:

"اس نظر بندی سے خلاصی حاصل کر لینے کے بعد یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ دار العلوم کی ایک نئی عمارت بنائی جائے جو تمام ضروریات کے لیے کفیل ہو؛ چنانچہ تیس ہزار روپے کے صرف سے تین منزلہ خوبصورت عمارت، مسجد غزنویہ کے ساتھ ہی تعمیر کی گئی۔ خوبصورتی کے علاوہ اس کی پختگی اور مضبوطی کا خیال اس درجہ رکھا گیا کہ اس کی چھتیں لوہے، سیمنٹ اور کنکریٹ سے تیار کی گئیں اور تمام عمارت سیمنٹ سے تیار کی گئی، لیکن افسوس کہ ہم تین چار ماہ سے زیادہ عرصہ دار العلوم کی اس نئی بلڈنگ میں نہ رہنے پائے کہ ۱۹۴۷ء کا انقلاب اپنے تمام فتنوں اور بربادیوں سمیت آ گیا[3]۔"

دار العلوم اور ۱۹۴۷ء کا خونیں انقلاب

۱۹۴۷ء کے خونیں انقلاب میں دار العلوم پر کیا گزری؟ حضرت والد علیہ الرحمہ یوں

---

[1] صفحہ ۱۰، ۱۱ [2] صفحہ ۱۱ [3] صفحہ ۱۲

رقمطراز ہیں :

" اگرچہ ہندوستان کی تقسیم مُسلم لیگ اور کانگرس کے باہمی سمجھوتے سے ہُوئی اور دُوسرے لفظوں میں ہندوؤں اور مُسلمانوں کی نمائندہ جماعتوں کی رضامندی سے ہُوئی، لیکن اس تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب سے مُسلمانوں کا جبری اخراج مُسلمانوں کا قتلِ عام مُسلم خواتین کی بے حُرمتی، مُسلمانوں کے مال و متاع کی تباہی و بربادی مُسلمانوں کی مساجد اور مدارس کا تاخت و تاراج کرنا، راشٹریہ سیوک سنگھ، سکھّوں اور کانگرسیوں کی باہمی سازش کے نتیجہ کے طور پر اس وحشت اور بربریت کے ساتھ عمل میں آیا کہ قرونِ مظلمہ کی تاریخ میں بڑے سے بڑے جلّاد و سفّاک اور درندہ خصلت حکمرانوں یا فاتحوں کی تاریخ میں بھی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ مشرقی پنجاب میں امرتسر اس ہولناک بربریت اور سفّاکی سے سب سے زیادہ متأثر ہُوا۔ ہماری تاریخی مسجد "مسجدِ غزنویہ" بھی جلا دی گئی۔ مسجد غزنویہ کے ساتھ مدرسین کی رہائش کے مکانات بھی جلا دیے گئے۔ دارالعلوم کی تاریخی لائبریری جو بڑی نادر اور بیش قیمت کتابوں پر مشتمل تھی، برباد کر دی گئی۔ بزرگوں کے وقت سے اس لائبریری میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس عاجز نے مصر اور ہندوستان کے بڑے بڑے کُتب خانوں سے جدید مطبوعات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اس میں شامل کیا تھا۔ قرآن مجید کی تمام تفاسیر، کُتبِ احادیث اور اُن کی شرح، کُتبِ فقہ ائمۂ اربعہؒ اور اُن کے بڑے بڑے مجموعے۔ فتاویٰ، ادب، اور تاریخ غرض تمام علوم کی بہترین کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا اور تمام درسی کتابوں کے ایک ایک کے بیسیوں بلکہ پچاسوں نسخوں کی کئی الماریاں بھری پڑی تھیں، جو آج ہزاروں رُوپے خرچ کرنے پر بھی نہیں مل سکتیں۔ افسوس کہ سکھّوں اور ہندوؤں کی اسلام دُشمنی بلکہ مُسلم دُشمنی کی وجہ سے وہ ذخیرہ برباد ہو گیا۔ انّا للہ و انا الیہ راجعون۔ ہمیں اپنے مکانات کی تباہی و بربادی کا اتنا صدمہ نہیں جتنا اپنے کُتب خانہ کے ضائع ہونے کا صدمہ ہے کیونکہ وہ اب کسی قیمت پر بھی نہیں مل سکتا۔

اس تباہی و بربادی کے علاوہ جو سب سے بڑا نقصان ہمیں پہنچا وہ یہ کہ ہمارے

دارالعلوم کے دو مدرّس مولانا عبداللہ صاحب بھوجیانیؒ اور اُن کے بھائی مولوی عبدالرحیم شہید کردیے گئے اور دفتر دارالعلوم کے نہایت وفادار کلرک مولوی عبداللہ صاحب دینانگری اور اُن کی بیوی کو مکان کے اندر شہید کر کے سارے دفتر کو آگ لگادی گئی اور ان شہداء کی لاشیں اس میں خاکستر کردی گئیں۔ اِنّا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہمارے پُرانے اور مُخلص سفیر مولوی صدرالدین صاحب راستہ میں شہید کردیئے گئے۔ دوسرے سفیر مولوی علم الدین صاحب راستہ کی صعوبتیں برداشت کرتے اس قدر ضعیف ہوگئے کہ لاہور پہنچنے کے بعد وفات پاگئے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام شہداء کی پاک رُوحوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان پر اپنے انوار و برکات نازل فرمائے۔ آمین“ ۱؎

لاہور میں دارالعلوم کا دوبارہ اجراء

پاکستان کے قیام اور امرتسر سے مسلمانوں کے جبری اخراج کے بعد اس دارالعلوم کے دوبارہ اجراء کا مسئلہ بہت پریشان کن تھا، لیکن بالآخر اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور حضرت والد علیہ الرحمۃ کی مساعیِ جمیلہ سے دارالعلوم کو "شیش محل روڈ" کی موجودہ عمارت میسر آگئی، لیکن اس وقت درس و تدریس کے آغاز کے لیے ایک کتاب بھی موجود نہ تھی۔ توفیقِ الٰہی شاملِ حال ہوئی اور شروع میں صرف درسی کتابیں خریدی گئیں، لیکن بتدریج تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، تصوف، اور دوسرے علوم و فنون پر تمام اہم اور مستند کتابیں خریدنے کی توفیق ہوئی اور یوں تھوڑے ہی عرصے میں اس دارالعلوم کا کتب خانہ بھی علمی ذخائر سے مالا مال ہونے لگا۔

ہمارے دینی مدارس میں عام طور پر جماعت بندی کا خیال نہیں کیا جاتا تھا اور نصابِ تعلیم پر جمود طاری تھا۔ حضرت والد علیہ الرحمۃ نے جماعت بندی، اصلاحِ نصاب، عرصۂ تعلیم کا تعیّن ایسے اہم امور پر توجّہ فرمائی۔ قرآن، حدیث اور فقہ کے علاوہ صرف و نحو، منطق و فلسفہ اور بلاغت و ادب کے نصاب میں ضروری تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ حضرت والد

۱؎ دیکھیے صفحہ ۱۲-۱۳

علیہ الرحمہ کے زمانے میں دار العلوم ازسرِ نو وجود میں آیا۔ حضرت والد علیہ الرحمہ قومی اور جماعتی کاموں میں اس قدر منہمک تھے کہ وہ اپنے ذاتی مدرسہ پر زیادہ توجّہ نہ فرما سکے۔ یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ دار العلوم پر توجّہ مرکوز فرماتے تو اسے ایک عظیم الشان یونیورسٹی میں تبدیل کر سکتے تھے۔

۱۶ دسمبر ۱۹۶۳ء کو دار العلوم حضرت والد علیہ الرحمہ کی نگرانی اور سرپرستی سے محروم ہوا۔

حضرت والد علیہ الرحمہ کے بعد

حضرت والد علیہ الرحمہ کے بعد دار العلوم کو چلانے کی ذمّہ داری اس بندۂ عاجز کو سونپی گئی۔ راقم الحروف اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کی وجہ سے حضرت عبداللہ غزنوی رحمہ اللہ اور حضرت الامام عبدالجبار غزنوی رحمہ اللہ کی مسند پر بیٹھنے کا اپنے آپ کو کسی طرح بھی اہل نہیں سمجھتا تھا لیکن اس بات کے پیشِ نظر کہ بزرگوں نے کتاب و سنّت کا جو فیضان جاری کیا ہے اور مدّتوں سے جاری ہے کہیں بند نہ ہو جائے، اس ذمّہ داری کو قبول کر لیا۔

فتشبّھوا ان لم تکونوا مثلھم
انّ التشبّہ بالکرام کرامٌ

(اگر تم ان جیسے نہ ہو سکو، تو اُن کا روپ ہی دھارو۔ بزرگوں کا رُوپ دھارنا بھی ایک سعادت اور شرف کی بات ہے)

یہ خطاکار آس لگائے بیٹھا ہے کہ رحمتِ خداوندی نقل کو اصل میں تبدیل کر دے۔

خُطبۂ جمعہ

تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہُوں کہ اس سے پیشتر دار العلوم میں خطبۂ جمعہ کا انتظام نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق بندۂ عاجز کو مرحمت فرمائی۔ لاہور شہر اور آس پاس کے علاقوں سے اچھی خاصی تعداد میں لوگ جُمعہ میں شریک ہوتے ہیں۔

مکتبۂ غزنویہ

معاشرے کے افراد کی ذہنی اور رُوحانی پرورش کے لیے

مکتبۂ غزنویہ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ یہ مکتبہ اسلامی نظریۂ حیات کے مختلف پہلوؤں پر مثبت انداز میں مقالے چھاپنے کا کام کرتا ہے۔ یہ مقالے خاص طور پر ڈاکٹروں، وکیلوں، سرکاری افسروں، انجینئروں، پروفیسروں اور طالب علموں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ کوشش کی جاتی ہے کہ ان مقالوں کی کتابت اور طباعت عمدہ اور معیاری ہو۔ اب تک مندرجہ ذیل مقالے شائع ہو چکے ہیں:

۱ —— حقیقتِ ذکرِ الٰہی : ذکرِ الٰہی ہم کیوں کریں؟ ذکرِ الٰہی سے شخصیت کے تمام گوشے کیوں کر متاثر ہونے لگتے ہیں؟ رحمت و سکینت کی حقیقت کیا ہے؟ دردِ رحمت کی تدبیر کیا ہے؟ کیا ذکر تمام روحانی بیماریوں کی دوا بھی ہے۔ اللہ والوں کی روحانی غذا بھی ہے... شکوک و شبہات کا علاج بھی ہے۔ ان باتوں کی وضاحت اس مقالے میں کی گئی ہے۔

۲ —— اسلام اور آدابِ معاشرت : تہذیب اور شائستگی کے بغیر انسان کا دین ادھورا ہے اور ادھوری سچائیاں ہمیشہ خطرناک ہوتی ہیں —— اس مقالے کے چند عنوان: مسکرانا نیکی ہے —— شکریہ ادا کرنا —— مصافحہ —— معانقہ —— آدابِ مجلس —— اسلام اور پرائیویسی کا تصور —— کھانے پینے کے آداب۔

۳ —— اسلام میں گردشِ دولت : چند عنوان

سرمایہ کا چند ہاتھوں میں سمٹ آنا بدترین جرم ہے... اسلام کے معاشی نظام کی آخری ارتقائی شکل کیا ہے..... قل العفو کی تفسیر..... کیا اسلامی حکومت جبراً چھین سکتی ہے؟ کیپٹلزم —— سوشلزم اور اسلام —— شخصی ملکیت —— ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں لینا.. کیا اسلام اور اشتراکیت یکجا ہو سکتے ہیں...... روٹی ہماری زندگی کا مقصد نہیں۔

۴ —— عصرِ حاضر میں اُستاد اور شاگرد کا رشتہ : عصرِ حاضر میں اُستاد اور شاگرد کے

رشتے میں کیا گرہیں پڑ گئی ہیں۔ اُلجھاؤ کہاں کہاں ہے اور عقدہ کشائی کی صُورت کیا ہے؟ .... رشتے میں بگاڑ کیوں پیدا ہُوا اور اسے از سرِ نو استوار کرنے کی کیا تدبیر کی جاسکتی ہے؟

۵ — اسلامی ریاست کے چند ناگزیر تقاضے: کیا اسلامی ریاست کا قیام ممکن ہے۔ اسلامی ریاست میں حاکمیت کا حق کسے ہے؟ سربراہِ ریاست عوام کی طرح جوابدہ ہے — عمالِ حکومت اور اُن کا احتساب — سربراہِ ریاست کے مصارف۔ ریاست میں فرد کے حقوق — معاشی تحفظ، شخصی آزادی کا حق، آزادیٔ رائے۔ اس مقالے میں ان باتوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

۶ — کتابتِ حدیث عہدِ نبویؐ میں: عہدِ نبویؐ میں حفاظت و جمع احادیث کا اہتمام کس حد تک ہو سکا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عرب قوم کا حافظہ غیر معمولی تھا اور اس والہانہ عقیدت، اور شیفتگی کی بنا پر جو وہ رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے رکھتے تھے، اُن کے ارشاداتِ گرامی کو حفظ کرنے کا اُنہیں بڑا اشتیاق تھا، مگر یہ کہنا سراسر حقائق کی تکذیب ہے کہ عہدِ نبویؐ میں احادیث ضبطِ تحریر میں نہیں لائی گئیں — احادیث کا بہت بڑا سرمایہ عہدِ نبویؐ میں صحابۂ کرامؓ کے ہاتھوں قلمبند ہوا، اس بات کی تشریح اس مقالے میں کی گئی ہے۔

۷ — خطباتِ جہاد: یہ خطبات، ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران راقم الحروف نے دیے تھے — فریضۂ دفاع کی اہمیت — جہاد کی حقیقت — فریضۂ جہاد کے تقاضے۔ اور — اسلام میں جنگ کی غرض و غایت، اور مقامِ شہادت کی رعنائیاں بیان کی گئی ہیں۔

۸ — واقعۂ کربلا: واقعہ کی تاریخی اور شرعی حیثیت کا ایک محققانہ جائزہ۔

۹ — اس دُنیا میں اللہ کا قانونِ جزا و سزا: اللہ کے ساتھ دوستی کا صِلہ اس دُنیا میں

کیا ہے ؟ —— افراد کی عزّت و ذلّت، قوموں کے عروج و زوال کے بارے میں ضابطۂ الٰہی —— امریکہ اور رُوس آج کیوں معزّز ہیں۔ ہم کیوں بے وقعت ہیں؟ ان سوالوں کے جواب اس مقالے میں موجود ہیں۔

۱۰ —— **قرآنِ مجید کے صوری اور معنوی محاسن (ایک اجمالی جائزہ)** جدید اصول تنقید کے اعتبار سے قرآن مجید کے فنّی محاسن کو اُجاگر کیا گیا ہے —— ذات و صفاتِ خداوندی کے قرآنی تصوّر کی وضاحت —— قرآن مجید سیرت النبیؐ کا مستند ترین مرقع ہے —— ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور انسان کی عائلی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی میں مشعل راہ ہے۔

۱۱ —— **محمدیؐ انقلاب کے چند خط و خال :** اس مقالے میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے جو انقلاب برپا کیا وہ کن ارتقائی منازل سے گزرا اور اُس کے کیا نتائج مرتّب ہوئے اور یہ ثابت کیا ہے کہ محمدی انقلاب ماؤ اور لینن کے انقلاب سے عظیم تر تھا۔

شام کی کلاسیں

یہ ایک المیہ ہے کہ پُورے ملک میں کسی دینی درسگاہ میں بھی ایسا نصاب پڑھانے کا انتظام نہیں، جس سے ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبار اور اساتذہ، ڈاکٹر، انجنیئر، وکیل، تاجر اور ملازمت پیشہ حضرات جو اپنے جی میں علمِ دین حاصل کرنے کی تڑپ رکھتے ہیں، استفادہ کر سکیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر شام کی کلاسوں کا اجرا عمل میں لایا گیا ہے۔ نصاب تین پرچوں پر مشتمل ہے : ۱۔ عربی زبان اور گرامر ۲۔ تفسیرِ قرآن ۳۔ حدیث شریف۔

الحمدُ للہ کہ متوقع نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔

اساتذۂ کرام

دار العلوم کی علمی اور تاریخی عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ بڑے بڑے مستند اور ممتاز علما ر اس درسگاہ

میں مسندِ تدریس پر فائز رہے بعض اساتذہ کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں :

مولانا عبدالجبار غزنویؒ (م ۱۳۳۱ھ) مولانا عبداللہ بن عبداللہ غزنویؒ (م ۱۳۰۰ھ) مولانا عبدالاوّل غزنویؒ (م ۱۳۱۳ھ) مولانا عبدالرحیم غزنویؒ (م ۱۳۴۲ھ) مولانا عبدالحق غزنویؒ۔ مولانا محمد حسین بٹالویؒ (م ۱۳۳۸ھ)، مولانا عبدالغفور غزنویؒ۔ مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ۔ مولانا معصوم علی ہزارویؒ۔ مولانا عبدالرحمٰنؒ ساکن بکھیلی۔ مولانا غلام رسولؒ پوٹھواری۔ مولانا ابواسحٰق نیک محمدؒ۔ مولانا غلام رحمانیؒ۔ مولانا اصحاب الدینؒ۔ مولانا عبداللہؒ بھوجیانی [1] استاذی المکرم مولانا شریف اللہ صاحب۔ مولانا محمد عبدہٗ صاحب۔

اس وقت دارالعلوم میں مندرجہ ذیل اساتذہ تدریس کا کام سرانجام دے رہے ہیں۔ شیخ الحدیث مولانا حافظ محمد اسحاق صاحب۔ مولانا حافظ عبدالرشید صاحب گوہڑوی۔ مولانا عبدالرشید صاحب ——— مولانا قاری محمد صدیق صاحب۔ جناب پروفیسر میاں منظور احمد صاحب شاگرد رشید حضرتِ مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ۔ جناب ڈاکٹر حافظ ظہور احمد اظہر

مشہور تلامذہ

اس درسگاہ کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ ایسے فاضل افراد یہاں سے فارغ ہوئے جن میں علمی ثقاہت بھی تھی اور للّٰہیت بھی۔ جو بیک وقت علم و فضل اور زہد و تقویٰ سے مالا مال تھے۔ اس درسگاہ نے مولانا عبدالقادر لکھویؒ، مولانا محمد علی لکھویؒ اور مولانا عطاء اللہ لکھویؒ ایسے ارباب صدق و صفا پیدا کیے۔ مولانا حافظ عبداللہ روپڑی ایسے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے پیکر اسی درسگاہ سے فیضیاب ہوئے۔ مولانا حافظ محمد گوندلوی اور مولانا محمد اسماعیل (گوجرانوالہ) ایسے جلیل القدر حضرات اس درسگاہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔

جن حضرات نے دارالعلوم تقویۃ الاسلام سے فارغ ہونے کے بعد تدریس یا تبلیغ کا کام اپنی زندگی میں جاری رکھا تھا یا اس وقت ملک کے اطراف و اکناف میں تدریس یا تبلیغ کا کام کر رہے

---

[1] دیکھیے صفحہ ۳، ۴، ۱۷، ۵، ۱۷ ہندوستان میں اہلحدیث کی علمی خدمات (مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہرویؒ)

ہیں۔ اُن میں سے بعض کے اسمائے گرامی درج کیے جاتے ہیں:

مولانا محمد حسین ہزاروی (سابق مدرس دارالعلوم) مولانا نیک محمد (سابق مدرس دارالعلوم)، مولانا عبدالعزیز والد ماجد حکیم ابوتراب عبدالحق امرتسری، مولانا عبدالکریم فیروزپوری (ابنِ خاندانِ غزنویہ) مولانا فقیر اللہ مدراسی، مولانا حکیم عبید الرحمٰن دہلوی، مولانا حکیم عبدالرحمٰن سابق پروفیسر طبیہ کالج کابلی، مولانا عبدالرحمٰن برادر مولانا فقیر اللہ مدراسی، مولانا ابویحییٰ امام خان نوشہروی۔ مولانا عبدالمجید، مولانا عبدالغنی، مولانا عبدالحمید (دینا نگری)، مولانا محمد خان، مولانا حافظ عبدالرشید گوہڑوی، مدرس دارالعلوم تقویۃ الاسلام، مولانا شرف الحق سکول ٹیچر اوچ شریف، بہاول پور، مولانا محمد حسین طور، مدرس جھوک دادو ضلع لائل پور۔ مولانا عبدالرشید خطیب رام گڑھ لاہور، قاضی محمد اسلم سیف سکول ٹیچر تحصیل سمندری ضلع لائل پور، حافظ عزیز الرحمٰن لکھوی، مہتمم مدرسہ محمدیہ رینالہ خورد۔ حافظ شفیق الرحمٰن لکھوی مدرس رینالہ خورد ضلع ساہیوال، مولانا محمد منیر لکھوی، مدرس جامعہ محمدیہ اوکاڑہ۔ حافظ محمد یحییٰ عزیز امیر جمعیت اہلحدیث۔ لاہور۔ حافظ بشیر احمد بھوجیانی، مدرس میاں چنوں ضلع ملتان۔ مولانا ابوبکر صدیق ٹیچر اسلامیہ ہائی سکول مصری شاہ، لاہور۔ مولانا محی الدین سلفی خطیب رحمٰن پورہ، لاہور، حافظ عبدالرحمٰن گوہڑوی، تاجر کتب، لاہور، مولانا محمد رفیق جھجوی، مدرس مدرسہ محمدیہ گوجرانوالہ۔ مولانا محمد حنیف شیر نگری۔ خطیب بھائی پھیرو ضلع لاہور۔ مولانا محمد شریف لکھوی سکول ٹیچر ضلع ساہیوال، مولانا محمد انور باٹھوی سکول ٹیچر، شر قپور ضلع لاہور، مولانا محمد علی تبسم ٹیچر گورنمنٹ سکول چونیاں منڈی ضلع لاہور، حافظ محمد ایوب لیکچرار انجینئرنگ یونیورسٹی۔ لاہور۔ حافظ محمد عابد ٹیچر نیا علی گڑھ سکول، مانگا منڈی۔ مولانا نذیر احمد ہیروی ٹیچر گورنمنٹ ہائی سکول مانگا منڈی۔ مولانا عبدالواحد ہیروی ٹیچر نارمل سکول گکھڑ منڈی، مولانا نور اللہ کھیاڑوی خطیب مسجد توحید آباد۔ لاہور۔ مولانا محمد بشیر گوہڑوی مدرس اڈانوالہ تحصیل سمندری ضلع لائلپور۔ مولانا صلاح الدین لکھوی مبلغ (کینیا) مولانا جار اللہ کھیاڑوی مدرس رام گڑھ، لاہور، مولانا عبدالمجید کھیاڑوی خطیب

کھیاڑہ کلاں ضلع شیخوپورہ، حافظ خلیل الرحمٰن خطیب ننکانہ صاحب ضلع شیخوپورہ۔ مولانا نذیر احمد خطیب نبی پور پیراں ضلع شیخوپورہ۔ مولانا محمد حنیف قصوری مبلّغ جماعت اہلحدیث قصور۔ مولانا عبدالحمید خطیب شیخوپورہ۔ مولانا بشیر احمد خطیب پتوکی ضلع لاہور، مولانا حاکم علی ٹیچر اسلامیہ ہائی سکول مصری شاہ لاہور۔ مولانا علی اصغر۔ ٹیچر کوٹ رادھاکشن ضلع لاہور۔ مولانا محمد یونس اثری مہتمم دارالعلوم محمدیہ مظفر آباد۔ آزاد کشمیر۔ مولانا محمد رفیق قصوری سکول ٹیچر قصور مولانا عبدالرحمٰن لدھیانوی خطیب راج گڑھ، لاہور، حافظ محمد یوسف کراچوی خطیب دھرمپورہ لاہور۔ مولانا محمد عبداللہ اوکاڑوی، اوکاڑہ۔ قاری عبدالواحد خطیب لائلپور، قاری محمد صدیق، سکول ٹیچر ساہیوال۔ مولانا محمد حسین لدھیانوی خطیب ملک پور لاہور۔ مولانا عبدالرشید لدھیانوی۔ سکول ٹیچر بورے والا ضلع ملتان۔ قاری عبدالحفیظ خطیب کھڈیاں ضلع لاہور۔ مولانا منصور احمد تاجر کتب لاہور۔ مولانا بشیر احمد مدرس ماموں کانجن ضلع لائلپور۔ مولانا مصطفیٰ الشمعون سکول ٹیچر ساہیوال۔ قاری ثناءاللہ چوہان، مدرس جامعہ خضری اسمن آباد، لاہور۔ مولانا محمد صدیق خطیب بادامی باغ، لاہور۔ مولانا بشیر احمد سکول ٹیچر کوٹ رادھاکشن ضلع لاہور۔ مولانا محمد سرور خطیب کمہار پورہ لاہور۔ مولانا عبدالمجید خطیب مسجد فردوس دھرم پورہ، لاہور۔ مولانا محمد رفیق مدرس گرجاکھ ضلع گوجرانوالہ۔ مولانا محمد سعید سکول ٹیچر قصور۔ مولانا ظہور احمد سکول ٹیچر بھائی پھیرو۔ لاہور۔ حافظ محمد اسحاق مدرس پتوکی ضلع لاہور۔ مولانا محمد لقمان — دارالعلوم کی سفارت کا کام آج کل انجام دے رہے ہیں۔ حافظ محمد زاہد سیکرٹری دفتر دارالعلوم کی حیثیت سے چار سال تک دارالعلوم کی خدمت کرتے رہے ہیں۔

جن حضرات نے اس درسگاہ سے فیض حاصل کیا ہے، انہیں اس درسگاہ سے ایک ذہنی تعلق اور ایک روحانی رابطہ محسوس کرنا چاہیے اور اس کی ترقی اور فروغ کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین۔

ماخذ "سیدی و ابی" رح

کتاب	مصنف	مطبع
مخطوطہ سوانح حیات حضرت عبداللہ غزنوی رح	تالیف حضرت الامام مولانا عبدالجبار غزنوی رح و مولانا غلام رسول صاحب قلعوی رح	"دار العلوم تقویۃ الاسلام" معروف بہ مدرسہ غزنویہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔
مخطوطہ مکاتیب غیر مطبوعہ	حضرت عبداللہ غزنوی رح	" " "
معارف اللطائف (غیر مطبوعہ مقالہ)	حضرت مولانا داؤد غزنوی رح	" " "
ذکر اللہ عز و جل (")	" " "	" " " "
مسائل متفرقہ، تصوف (")	" " "	" " " "
نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر	مولانا عبدالحی لکھنوی رح	مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد دکن الہند ۔ ۱۳۷۸ھ = ۱۹۵۹ م
تقصار من تذکار جیود الاحرار	نواب صدیق حسن خاں صاحب	مطبع شاہجہانی، بھوپال ۱۲۹۸ھ
کتاب تتمۃ البیان فی تاریخ الافغان	سید جمال الدین افغانی رح	مطبعۃ الموسوعات مصر ۱۳۱۸ھ = ۱۹۰۱م
بدائع الفوائد	امام ابن قیم رح	مطبعۃ منیریہ، القاہرہ، مصر
تفسیر مظہری	قاضی ثناء اللہ پانی پتی رح	جید الیکٹرک پریس دہلی۔ باہتمام مجلس اشاعت العلوم حیدرآباد، دکن
معیار الحق	مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی	مکتبہ نذیریہ قصور، چٹان پریس لاہور جنوری ۱۹۶۵
تاریخ اہل حدیث	مولانا ابراہیم میر سیالکوٹی رح	اسلامی پبلشنگ کمپنی لاہور۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۰ء
ہندوستان میں اہلحدیث کی دینی خدمات	امام ابو یحیٰی خاں نوشہروی رح	مکتبہ نذیریہ، چیچہ وطنی، ساہیوال جمادی الاول ۱۳۹۱ھ

کتاب	مصنف	مطبع
تراجم علمائے حدیث ہند	امام ابو یحییٰ خاں نوشہرویؒ	مطبوعہ مرکزی جمعیت طلبہ اہلحدیث مغربی پاکستان، طبع دوم ۱۳۹۱ھ
ارواحِ ثلاثہ	مولانا اشرف علی تھانویؒ	کتب خانہ امداد الغربا، سہارنپور
باب التوحید از حجۃ اللہ البالغہ	ترجمہ حضرت مولانا داؤد غزنویؒ	اصل مسودۂ کتاب جو "دار العلوم" کے کتب خانے میں موجود ہے
اسوۂ حسینؓ	حضرت مولانا داؤد غزنویؒ	مطبوعہ جمعیت اہلحدیث قصور ضلع لاہور
مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ دفتر اوّل - دفتر دوم		روز بازار الیکٹرک پریس امرتسر، باہتمام شیخ عبدالعزیز بتصحیح نور احمد پبلشر پسرور
تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء	چوہدری حبیب احمد	اشرف پریس، لاہور فروری ۱۹۶۶ء
دو سالہ رپورٹ اور گوشوارہ بابت ۱۹۴۷-۴۸ء، و ۱۹۴۸-۴۹ء	تحریر: حضرت مولانا داؤد غزنویؒ	گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور
A HISTORY OF AFGHANISTAN VOL-2	SIR PEREY SYKES	MACMILLAN & COMPANY LTD LONDON

رسائل و اخبارات

اخبار اہلحدیث امرتسر		مکمل فائل
"توحید" امرتسر	مدیر حضرت مولانا داؤد غزنویؒ	مکمل فائل
ہفت روزہ الاعتصام لاہور		مکمل فائل
روزنامہ زمیندار کا مرزائی نمبر	۱۹۳۶ء	

حضرت والد علیہ الرحمہ کی ذاتی یادداشتیں

شعروں کی بیاض - طبی نسخوں کی بیاض - روزنامچے - متفرق یادداشتیں (جو سینکڑوں صفحات پر مشتمل ہیں)